کشمیر
میں
فارسی ادب کی تاریخ

☆

از

پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو و فارسی جموں و کشمیر یونیورسٹی
سابق صدر شعبۂ اردو، فارسی اور عربی میسور یونیورسٹی
و صدر شعبۂ اردو۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

☆

ناشر
مجلسِ تحقیقاتِ اردو۔ کشمیر۔ سرینگر
۱۹۶۸ء

Rekhta Download.com

RekhtaDownload.com

ملنے کے پتے :-

- نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد ــــ (اے۔ پی)
- نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار مینار، حیدرآباد ــــ (اے۔ پی)
- شیخ غلام محمد، تاجر کتب، مائسومہ بازار، سرینگر (کشمیر)

مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد (اے۔ پی)

طبع اول ۱۰۰۰ ☆ قیمت : چھ روپے

فہرست مشتملات

کچھ کتاب کے بارے میں ۶

۱۔ تاریخی پس منظر ــ ۹

قدامت و روایت۔ کلہن۔ گم گشتہ سلسلہ۔ پانڈو خاندان۔ لو خاندان۔ سلیمان یا سندیمان راجا گونند کا سلسلہ۔ میگواہن۔ راجہ بکرماجیت۔ کارکوٹ۔ ہنسی راجا۔ خمار خاندان۔ راجا یشسکر۔ راجا سنگرام راج۔ محمود غزنوی۔ شہمیری خاندان۔ امیر تیمور۔ چک سلاطین مغلیہ دور۔ افغان عہد۔ ڈوگرا حکمران۔

۲۔ آغاز سخن ــ ۳۳

فارسی زبان کا کشمیر سے ربط۔ راجا چندر اپیڈ اور نئی رو۔ محمود غزنوی کا حملہ۔ ترک سردار۔ راجا ہرش کی بت پرستی سے نفرت کی وجوہات۔ فارسی کا رواج۔ ہندوستان اور وسط ایشیا سے سماجی اور تجارتی تعلقات۔ تین نوعمر من چلے۔ ایک بزرگ سید شرف الدین یا عبدالرحمٰن بلبل شاہ۔ رینچن کا اسلام لانا۔ صوفیا اور علما کی آمد۔ فارسی کی ہمہ گیری۔ نئے الفاظ اور نئی اصطلاحیں۔ کشمیر میں فارسی کا اہم مقام۔

۳۔ شہمیری سلاطین ــ ابتدائی عہد ۴۲

سلطان شمس الدین۔ سلطان شہاب الدین۔ سلطان قطب الدین۔ ملا احمد۔ حضرت سید علی ہمدانی کی آمد۔ پیر حاجی محمد قاری۔ حضرت سید علی ہمدانی کے رسالے۔ سلطان سکندر۔ حضرت سید محمد ہمدانی۔ مولانا احمد۔

۴۔ سلطان زین العابدین تا حبیب شاہ ــ ۵۶

سلطان زین العابدین بڈشاہ اور علما کی سرپرستی۔ بڈشاہ کے عہد کے علما۔ مولانا کبیر۔ بابا میر اویسی۔ سلطان کا دار الترجمہ۔ ملا احمد کشمیری۔ سنسکرت کے علما۔ درباری طبیب۔

سلطان حسن شاہ اور اس کا ذوق۔ سید حسین بیہقی۔ کچھ عالم خواتین۔ میر شمس عراقی۔
مولانا رضی الدین۔ ملا عبدالوہاب۔ مولانا حافظ بصیر۔ مولانا آنی۔ میرزا حیدر دوغلات

۵۔ چک سلاطین کا عہد۔ ۴۷ ۴۷

حسین شاہ کا ذوق ادب۔ ملا نامی۔ میر علی خوشنویس۔ ملا مہدی۔ یوسف شاہ۔ مولانا
احمد۔ محمد امین مستغنی۔ یعقوب شاہ۔ میرزا علی خاں۔ مناقشے۔ حضرت مخدوم شیخ حمزہ
بابا داؤد خاکی۔ شیخ یعقوب صرفی۔ بابا علی رینہ۔ مولوی فیروز ثانی۔ خواجہ حسن قاری
خواجہ اسحٰق کشمیری۔ سید علی ناگری۔ بہارستان شاہی۔ میر حیدر گجراتی۔ شیخ احمد
چاگلی۔ خواجہ میرم بزاز۔ وردالمریدین۔

۶۔ مغل عہد۔ ۵۴ ۵۴

نئی راہیں۔ نئے انداز۔ اکبر۔ فتح اللہ شیرازی۔ جمال الدین انجو۔ ملا محمد علی کشمیری۔
ملا مرہمی۔ نجی مظہری۔ خطاطی کی ترقی۔ شیخ احمد زاہد۔ عبدالغنی عشائی۔ فریبی مزاجی
ملا امین گانی بیدنوا۔ ملا فطرتی۔ جہانگیر۔ ملا علی پستک۔ مولانا میر کمال الدین۔
فقیر محمد۔ ملا حیدر علامہ جہدی۔ ملا جوہر ناتھ جبی۔ حیدر ملک چاڈورہ۔ بابا نصیب الدین
غازی۔ ملا ذہنی۔ بشتری۔ ندیم ناہی۔ اوجی۔ روشنی۔ گلشن۔ خورم۔ قاسم خاں
میرزا کرانی۔ پارسا۔

۷۔ عہد شاہ جہاں۔ عروج ۱۱۶ ۱۱۶

ظفر خاں احسن۔ ناظم۔ صائب۔ میر الٰہی۔ قدسی۔ بہشتی۔ قاضی ابوالقاسم۔ قاضی
محمد عارف۔ حکیم مسیح الزماں۔ کلیم۔ مولانا خصالی۔ محمد قلی سلیم۔ میرزا محمد مقیم جوہری
میر معصوم کاشانی۔ جلالا طباطبائی۔ رونقی۔ احمد نسیمی تھانیسری۔ وحشی۔ انسی۔ ایلی
ملا مومنی۔ میر محمد باقر علوی۔ سید صوفی۔ میرزا محمد قزوینی۔ ملا طغرا۔ عنایت خاں
آشنا۔ ملا محسن فانی۔ ملا محمد طاہر غنی۔ ناثغ۔ جویا۔ گویا۔ فروغی۔ فصیحی۔ استغنا۔ ملا

شاہ بدخشی۔ دارا شکوہ۔ محمد صادق کشمیری۔ ملا عبدالحکیم۔ سعد الدین سید نامی۔ خواجہ خاوند محمود نقشبندی۔ خواجہ محمد مومن جمیل۔ ملا عبدالرزاق بانڈے۔ ملا یوسف ملا حسن۔

۸۔ اورنگ زیب اور اس کے بعد ۱۵۳ ۱۵۳

شیخ علی پامپوری۔ حضرت داؤد بٹہ مالو۔ ملا زین الدین پال۔ میر حیدر لاری۔ لالہ ملک شہید۔ خواجہ معین الدین نقشبندی۔ پرانند۔ باداود مشکواتی۔ میر محمد معروف ساطع۔ فرحت۔ بینش۔ محمد رفیع منشی۔ کشتوار کے راجہ مہاسنگھ۔ کیرت سنگھ۔ حافظ عبدالغفور۔ خواجہ جواہر بیتا۔ شاہ محمد صادق۔ میاں محمد امین دار حافظ عبداللہ۔ شاہ صدیق قادری۔ ملا محمد محسن۔ ملا محمد اشرف۔ ملا عنایت اللہ شال عالم خواتین۔ عنایت اللہ خاں۔ ملا عبدالرشید زرگر۔ محمد مراد و شیخ محمد چشتی رادھو۔ ملا صفی الدین اردبیلی۔ میرزا اکمل الدین بدخشی۔ شیخ عبدالوہاب نوری۔ حاجی عبدالسلام قلندر۔ شیخ علی محمد چشتی۔ شیخ محمد مراد فیقی۔ میر کمال الدین اندرابی رسوا۔ پنڈت نارائن کول عاجز۔

۹۔ افغان عہد ۲۰۱۔

ابتری کا عہد۔ ٹیکارام آخون۔ سکھ جیون مل کا عروج اور شعرا کی سرپرستی۔ سکھ جیون مل کا ذوق شعر۔ متوسل شعرا، سامی، شایق، ملا رفیع۔ ملا راجح۔ محمد علی متین۔ توفیق میر سعد اللہ شاہ آبادی۔ ملا اشرف ڈیری۔ کشتواڑ کا راجہ عنایت اللہ سنگھ۔ نصر الدین ناصر۔ عطاء اللہ خانقاہی۔ مفتی قوام الدین۔ پنڈت دیارام کاچرو۔ شیخ محمد عثمان۔ محتشم خاں فدا۔ بھوانی داس کاچرو۔ محمد اشرف شیخ کدلی۔ حسام الدین شیخ یحیی رفیقی۔ آزاد قادری۔ شرف الدین زنگیر۔ خواجہ عبدالکریم اور بیان واقع ماضی۔ نور الدین اور شیخ محمد رفیقی۔ فقیر۔ ملا حسین کشمیری۔ شاہ صادق۔ عبدالغفور شوپیانی

خواجہ نیاز احمد۔ خضر بابا بجبہاری۔ اذکار العرفا۔ شگون۔ تحفۂ محمدی۔ ملا حیدر پشلو محمد رسول خوشنویس۔

۱۰۔ سکھوں کا دور ۲۳۷۔

جبر و تشدد کا دور۔ راجا تیغ سنگھ۔ شاہ شجاع الملک۔ صدر الدین وفائی۔ شنکر جیون آخون۔ خواجہ شاہ نیاز نقشبندی۔ میر محی الدین مہدی۔ ملا بہاء الدین متو۔ مکند رام ہندو۔ بیربل کا چرو دارستہ۔ کرنیل مہا سنگھ کے عہد کی ایک تاریخ۔ بابا کمال الدین۔ حمید اللہ شاہ آبادی۔ کاشکاری لچھمن۔ شیخ طیب رفیقی۔ ملا عبد اللہ مصطفیٰ خاں بختور۔ میرزا مہدی مجرم۔ بابا محمد کاظم۔ اشرف۔ مراد بیگ۔ روپ بوائن شیخ احمد اور شیخ محمد تارہ بلی۔ خواجہ امیر الدین پکھلیوالی۔ محمد صادق۔ انند رام بیخود میر سید حسین۔

۱۱۔ ڈوگرا عہد ۲۶۰

نئے عہد کی شروعات۔ پنڈت شعرا کی قدردانی۔ ٹھاکر داس راز داں۔ راج کاک در ست رام بقایا۔ میرزا احد۔ میرزا سیف الدین۔ گوپال کول غیوری۔ ہرہ کول ہشیار مہاراجا رنبیر سنگھ۔ ان کے درباری۔ دار الترجمہ۔ دیوان کرپا رام۔ بھاگوت گیتا۔ دامودر ترسل سعادت۔ لچھمن بٹ چالاک۔ خواجہ عبد الرحمٰن۔ خواجہ محمد مراد۔ میر حبیب اللہ کاملی۔ طوطا رام برہمن۔ ملا احمد سہروردی۔ ٹیکا رام کول۔ وسط ایشیا پر ایک مخطوطہ۔ مہتاب جیو ترسل۔ شیخ احمد ترالی۔ واسدیو جو شار کا۔ شیوجی در اور تاریخ کشتوار۔ لسہ کول۔ گیلاس کول۔ احمد سعید تارہ بلی۔ برہان مہدی۔ عاقب۔ خواجہ حسن شعری۔ ہری رام کول۔ واسہ کول بلبل۔ حافظ غلام رسول شیدا۔ پیر غلام حسن کویہامی۔ بلہ کاک مسر در بخشی دینا ناتھ۔ راجا کول ویری۔ محمد باقر طبیب بشن چندر۔ کچھ خوشنویس۔ گنیش داس۔ بیربل کول۔ میرزا مہدی۔ محی الدین

مسکین - دیارام ریۃ - رام جو در - احمد میرانی - غلام احمد سوپوری - عبدالنبی خانیاری
صدرالدین - بلبدر جیو در - میرزا اسعد الدین سعد - سیف الدین شال - میرزا
جلال الدین - خواجہ امیر الدین - ملا حبیب اللہ - پنڈت دودھ لعل طالع - میر غلام
محمد مختار - لچھمی رام - ضیائی - محی - بہا - ہری کول - شاہ نیاز نقشبندی - خواجہ
سعدالدین - محمد شاہ نقشبندی - موتی رام منشی - جے رام گھڑیالی - گنگا بشن منصو

۱۲- موجودہ دور ۳۱۴

نئے نظم و نسق کی ضرورتیں - فارسی کی جگہ انگریزی، اردو - کچھ سر برآوردہ شعرا -
پیر شمس الدین حیرت کاملی - محمد امین داراب - پیر عبدالقادر آثم - پروفیسر نند لال
کول طالب - میر غلام رسول نازکی - میرزا کمال الدین شیدا - طیب شاہ
صدیقی ضیغم - سید محمد مبارک شاہ فطرت - سید شمس الدین غمگین - سرخوش
کشمیری - حکیم غلام احمد زہری - حکیم محی الدین فقیر سوپوری - کالجوں میں فارسی
کی تعلیم - مابعد طیلسانی شعبہ فارسی اساتذہ - ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقی کام

کچھ کتاب کے بارے میں

فارسی کا کشمیر سے خاص ربط رہا ہے اور یہاں کی علمی اور ادبی زندگی پر فارسی کا اثر بہت پڑا ہے۔ گذشتہ چھ، ساڑھے چھ سو برسوں میں اس سرزمین سے فارسی کے ایسے عالم اور ادیب اٹھے، جن کا مقام فارسی ادب کی تاریخ میں گھٹایا نہیں جاسکتا۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ آب و ہوا اور جغرافیائی خصوصیات کی یکسانیت کے سبب سے اہل ایران کشمیر کو "ایران صغیر" سے موسوم کرنے لگے تھے۔

چھ سو سال کے وسیع عرصہ میں جو ادبی جدوجہد جاری رہی اس کے رجحانات مختلف زمانوں میں متنوع رہے ہیں۔ شہمیری سلاطین کے دور میں ان صوفیائے کرام اور علما کی وجہ سے، جو ایران اور وسط ایشیا سے کشمیر آئے تھے مذہبی ادب کی طرف رجحان زیادہ رہا۔ ان علما میں سے بعضوں نے ابتدا میں عربی میں بھی تصانیف کیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ فارسی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اس سلسلے میں حضرت سید علی ہمدانی کی تصانیف کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ دور دراصل مذہبی تحریروں کے فروغ کا تھا، جس کی ضرورت بھی اس خطے کے لیے ناگزیر تھی جہاں اسلام ابھی ابھی پھیلا تھا۔ تاہم کچھ شاعر بھی منظر عام پر آئے، جن میں خاص طور پر سلاطین، جیسے قطب الدین اور زین العابدین قابل ذکر ہیں۔ چک سلاطین میں یوسف شاہ بھی فارسی کا اچھا شاعر تھا۔

مغلیہ عہد سے کشمیر کے فارسی ادب سے مذہب اور تصوف کے اثرات گھٹنے لگے اور ان شعرا کی وجہ سے جو ایران سے وقتاً فوقتاً کشمیر آتے رہے، شعر و سخن کا وہ نکھرا ہوا ذوق جو اس زمانے میں ایران میں پروان چڑھ رہا تھا، کشمیر پہنچا اور خود اس سرزمین

سے، فانی، غنی، استغنا، خوشدل جیسے سخن سنج اٹھے، جن کی فکر کی خوبی نے ان کے لیے فارسی شاعری میں ایک مقام پیدا کر دیا ہے۔

مغلیہ عہد کے خاتمے کے بعد بھی کشمیر میں شعر و ادب اور علم و فن کا ذوق ماند نہیں پڑا۔ افغان ناظموں اور سرداروں کی غیر شایستہ جہانبانی اور سکھوں کے ظلم و تشدد کے اطوار کے باوجود، فارسی علم و ادب کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔ سکھوں کے عہد میں فارسی داں پنڈتوں کی سرپرستی کی جانے لگی، اس لیے کشمیری پنڈت ذوق و شوق سے فارسی کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ سلسلہ ڈوگرا حکمرانوں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ موجودہ دور میں بھی کشمیر چند سربرآوردہ فارسی شعرا سے خالی نہیں ہے۔

اس وسیع دور کے متنوع کارناموں کی تاریخ مرتب کرنے کا کسی کے ذہن میں اب تک خیال نہیں آیا تھا۔ کشمیر کے مورخین کی دلچسپی کی وجہ سے، بہت سے شعرا کے بارے میں معلومات ضرور محفوظ ہو گئی ہیں، جن سے استفادہ کر کے موجودہ دور کے کئی اصحاب نے کشمیر کے فارسی شعرا کے تذکرے لکھے ہیں۔ لیکن یہ تذکرے بہت مختصر ہیں، عالموں اور ان کے کارناموں اور انشا پردازوں کا تذکرہ مدون نہیں تھا۔ کشمیری مورخین خواجہ اعظم دیدہ مری، پیر غلام حسن کویہامی اور غلام محی الدین مسکین نے اپنی تاریخوں میں علما، اور خاص طور پر مذہبی علما کا ذکر بھی التزام کے ساتھ کیا ہے۔ اس سلسلے میں پیر غلام حسن کی تاریخ کا حصہ سوم، جو "تذکرہ اولیائے کشمیر" کے نام سے موسوم ہے، قابل قدر کارنامہ ہے۔ اس سے مجھے علمائے کشمیر کے بارے میں رہبری ہوئی اور ان کی تصانیف کو میں کتب خانہ محکمہ تحقیق و اشاعت سرینگر اور کلچرل اکادمی کے کتب خانوں اور دوسرے ذریعوں سے تلاش کر سکا اور اس طرح شاعروں، نثر نگاروں، انشا پردازوں کے کارناموں پر مشتمل یہ تاریخ مرتب کی جا سکی۔ کئی قیمتی مخطوطات مجھے میرزا کمال الدین شیدا نے بھی مطالعے کے لیے مستعار عنایت فرمائے، جن سے اس تاریخ کی تدوین میں بڑی مدد ملی۔

یہ تاریخ دراصل میری زیر ترتیب تصنیف "جموں و کشمیر میں اردو ادب کی تاریخ"

کے سلسلے کی ایک ضمنی پیداوار ہے۔ اردو ادب کی تاریخ کے لسانی اور ادبی پس منظر کا خاکہ مرتب کرنے کے لیے مجھے فارسی کا مواد اکٹھا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور جو مواد میں نے مختلف ماخذوں سے جمع کیا، وہ اتنا وسیع ہو گیا کہ میں نے اسے ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع کر دینا مناسب سمجھا تاکہ فارسی کے علما اور طلبا کے سامنے کشمیر کے عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی مساعی مربوط شکل میں آسکیں۔ مجھے توقع ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے ایک اہم کمی کسی حد تک پوری ہو سکے گی۔

اس کتاب کی کتابت اور طباعت میں مجھے اپنے عزیز شاگرد' انوار احمد خاں صاحب متعلم ایم۔ اے (ابتدائی) جموں و کشمیر یونیورسٹی' سری نگر سے جو مدد ملی' اس کے لیے میں ان کا مشکور ہوں' اور طباعت میں کلچرل اکادمی' سرینگر سے جو مالی اعانت ملی اس کے لیے اکادمی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

عبد القادر سروری

۴۶۔ جواہر نگر۔ سرینگر (کشمیر)

۱۴۔ جنوری ۱۹۶۸ء

RekhtaDownload.com

۱

تاریخی پس منظر

کشمیر کی تاریخی روایات بہت قدیم ہیں ۔ ایک روایت کی رو سے شری رامچندر جی نے اس علاقے کو فتح کیا تھا ۔ پرگنہ وتر میں رام کنڈ، سیتا کنڈ، لچھمی کنڈ اور ہنومان کنڈ اس کی یادگار بتلائے جاتے ہیں ۔ بعض فارسی تاریخوں میں بتایا گیا ہے کہ سکندر ذوالقرنین کشمیر ہوتا ہوا چین گیا تھا اور سکندر فیلقوس کے بارے میں بھی یہ بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے جاتے ہوئے اس نے برسات کا موسم اسی وادی میں گذارا تھا ۔ کشمیر کے قدیم مورخ پنڈت کلہن نے اپنی تصنیف "راج ترنگنی" میں پانچ ہزار سال قبل مسیح کے کشمیری حکمرانوں کے سلسلے درج کئے ہیں ۔ کلہن سے پہلے بھی کچھ مصنفین ایسے گذرے ہیں جنہوں نے روایتی، تاریخ اور سماجی حالات پر تصنیفات کی تھیں ۔ ان میں رتناکر کو بہت اہمیت حاصل ہے ۔

قدیم ترین روایت کی رو سے کشمیر کی ساری وادی ایک وسیع جھیل تھی ۔

جو ستی سر کے نام سے موسوم تھی، اور آبادی صرف پہاڑوں پر مرتکز تھی۔ ستی سر جھیل پشاچوں، ناگوں، اور راکششوں کا مسکن تھی۔ ان کا سردار جلو بھو یا جل دیو لوگوں کو بہت دق کیا کرتا تھا۔ آخر لوگ اپنے سردار کشیپ رشی کے پاس، جل دیو کے مظالم کی شکایت لیکر گئے۔ کشیپ رشی نے اندر دیوتا سے مدد طلب کی اور انھوں نے بارہ مولہ کی پہاڑیوں میں اپنا رتھ چلا کر پہاڑوں میں راستہ پیدا کر دیا، جس سے جھیل کا سارا پانی بہہ گیا۔ جل دیو اور پشاچ مارے گئے، اور لوگوں کی بود وباش کے لئے ایک نئی وادی اور ایک نیا گلزار نکل آیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نئی سرزمین کا نام کیشپ رشی کے نام پر "کیشپ میرا" پڑ گیا۔ جو رفتہ رفتہ کشمیر میں تبدیل ہو گیا۔

کلہن نے کشمیر کی تاریخ کا آغاز گونندا اول سے کیا ہے، جس کے بارے میں بتایا ہے کہ ۶۵۳ قبل مسیح کالی میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس کے تین جانشینوں دامودر، رانی یشووتی اور گونند دوم کے بعد اس نے لکھا ہے کہ تاریخی دستاویزات کے تباہ ہو جانے سے پینتیس ۳۵ راجاؤں کا حال "راج ترنگینی" میں شامل نہ ہو سکا۔ لیکن پیر غلام حسن، مصنف "تاریخ حسن" نے ان راجاؤں کے حالات اپنی تاریخ میں لکھے ہیں۔ اور یہ بتایا ہے کہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانے میں رتناگر کی قدیم تاریخ کے کچھ اجزاء دستیاب ہو گئے تھے، جن میں ان ۳۵ راجاؤں کا حال بھی درج تھا، اور اسے ملا احمد کشمیری نے بڈشاہ کے حکم سے اپنے "راج ترنگینی" کے فارسی ترجمے میں شامل کر لیا تھا۔ ملا احمد کے ترجمے سے، پیر غلام حسن نے ان راجاؤں کے بارے میں تفصیلات حاصل کی ہیں۔ یہ پانڈو خاندان کے راجا تھے، جن میں سے بائیس کا حال پیر غلام حسن کی تاریخ میں درج ہے۔ اس خاندان کے خاتمے کے بعد تو خاندان کے تئیس راجاؤں کی حکومت

رہی - اسی خاندان کے آخری راجہ دامودر کے عہد میں کشمیر کے فارسی مورخین حضرت سلیمان کا کشمیر میں ورود بتاتے ہیں - لیکن رتناگر کی تاریخ میں یہ نام سندیمان آیا ہے - تاہم اس کی اکثر خصوصیات، سلیمان سے ملتی جلتی ہیں - انھوں نے ہوائی تخت پر بیٹھے ہوئے سارے کشمیر کی سیر کی تھی - اور پہاڑ جتیلدرک پر اترے تھے - اسی لئے اس پہاڑ کا نام کوہ سلیمان پڑ گیا - لیکن یہ اب عام طور پر شنکر آچاریہ کی پہاڑی کہلاتی ہے -

روایت کے مطابق سندیمان یا سلیمان جب کشمیر سے گئے تو انھوں نے حکومت تین ترکی شہزادوں، ہشک، کنشک اور زشک کے سپرد کی - مورخین اس کا ۱۸۱۴ کلجگ کا زمانہ بتاتے ہیں - یہ تینوں کشمیر پر چالیس سال تک حکومت کرتے رہے - مذہبی نزاعات کی وجہ سے جو بدھ اور جین مت کے پیروؤں اور برہمنوں میں برپا ہو گئی تھیں، تینوں بھائی عاجز آ گئے اور وچین پارہ کے جاگیردار، راجا ابھی مینو کو لوگوں نے کشمیر کی حکومت کے لئے منتخب کیا - اس خاندان کے اٹھائیس راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی - آخری راجا سندیمان المعروف بہ آری راج، سنیاسی ہو گیا تھا، اس لئے حکومت کشمیر میگواہن خاندان میں منتقل ہو گئی - دو راجاؤں سریشٹھ سین اور ہرن کے بعد، راجا بکرماجیت کا تسلط کشمیر پر ہو گیا اور اس خاندان کے چودہ راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی - بکرماجیت، جس سے بکرمی سنہ کا رواج ہوا، بڑا بہادر اور مدبر راجہ تھا - اس کے سلسلے کے چودہ راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی - آخری راجہ، جیانند کے بعد اس کا داماد درلبھ وردن تخت کشمیر کا مالک ہوا - یہ خاندان کارکوٹ بنسی کہلاتا ہے - اس خاندان سے "راج ترنگینی" کا تاریخی حصہ شروع ہوتا ہے -

کارکوٹ خاندان کے چودہ راجہ ہوئے، اس خاندان کا راجہ للتادت پید

حوصلہ مند راجا ہوا ہے۔ اس نے اپنے پیش رو راجا تارا پیڈ کے ہاتھ سے ملک کے جو حصے نکل گئے تھے، انہیں واپس حاصل کیا اور اطراف میں دور دور تک علاقے فتح کیے۔ ہندوستان کے کئی علاقے بھی اس نے فتح کیے تھے اور وہاں سے عالموں اور صناعوں کو لاکر کشمیر میں آباد کیا تھا۔ مارتنڈ کے مندر کی ترمیم پر بھی اس نے بہت سا روپیہ صرف کیا تھا۔ راجا ادت پلا پیڈ اس خاندان کا آخری راجہ ہوا۔ اسے قتل کر دیا گیا۔ اور ختار راجاؤں کا سلسلہ شروع ہوا

اس خاندان کا پہلا راجہ اونتی ورمن علم و فن کا سرپرست تھا" رتناکر پران "کا مصنف، پنڈت رتناکر اسی راجہ کے عہد میں ہوا۔ کلہن سے پہلے کی داستانی تاریخوں میں اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ایک اور اہم تصنیف جو اس زمانے میں لکھی گئی، ہند کلٹ کی "شیو پران" تھی جو کشمیری پنڈتوں کے لیے انجیل کا حکم رکھتی ہے۔ شہر اونتی پورہ، جس کے کھنڈر سرینگر تا جموں کی شاہ پر ملتے ہیں، اسی کا بسایا ہوا ہے۔ اس خاندان کے پندرہ راجاؤں نے حکومت کی۔ آخری راجہ شیر ورما تھا، جس کو اعیان حکومت نے دو مہینے کی مدت کے بعد معزول کر دیا۔ اور راجا پرورسین کی اولاد میں سے ایک شخص یشسکر کو تخت پر بٹھایا۔ اس خاندان کے آٹھ راجاؤں اور ایک رانی دیدارانی نے حکومت کی اور آخری راجہ دنیا سے دل برداشتہ ہو کر تخت اپنے بھتیجے کے حوالے کر دیا، جس کا نام سنگرام راج تھا۔

سنگرام راج کے جانشینوں میں بائیس راجا گزرے۔ اسی راجہ کے زمانے میں سلطان محمود کا حملہ کشمیر پر ہوا۔ ۱۰۱۵ء میں لاہور کے راجہ آنند پال کے بیٹے ترلوچن پال کے تعاقب میں محمود غزنوی کشمیر کی طرف آیا تھا۔ لیکن سنگرام راج نے اسے تحفے تحائف دے کر رخصت کر دیا۔ ۱۰۲۱ء میں محمود دوبارہ

راجا نند اپر حملہ کرنے کے لئے کشمیر کی طرف لوہر کوٹ تک آیا تھا۔ راجا نے اسے تحفے نذر دیئے۔ اور فارسی مورخین لکھتے ہیں کہ اس نے ایک شعر یعنی ہندی میں لکھ کر محمود کی خدمت میں پیش کیا تھا، جس سے محمود بہت خوش ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غزنین لوٹتے ہوئے، محمود ایک کشمیری برہمن تلک کو اپنے ساتھ لے گیا۔ تاریخ بیہقی کا بیان ہے کہ تلک فارسی اچھی جانتا تھا۔

مغلوں کا خروج اس سلسلے کے بارہویں راجہ جے سنگھ کے عہد میں ہوا تھا۔ ۵۲۵ھ میں افغانستان پر قبضہ کرنے کے بعد چنگیز نے اپنے ایک سپہ سالار کو پنجاب اور کشمیر کی تسخیر کے لئے مقرر کیا۔ جے سنگھ پنجاب کے راجا کی مدد کے لئے پہنچا اور دریائے نیلاب کے کنارے مغل فوجوں سے انکا مقابلہ ہوا، لیکن آخر میں صلح ہو گئی۔ اس سلسلے کے بائیسویں راجہ سہم دیو کے عہد میں شنکر آچاریہ کشمیر آئے تھے۔ ان کی تعلیم اور تبلیغ نے کشمیر سے بدھ مت کے عقائد کا اثر دور کرنے میں بڑی مدد دی۔ اس خاندان کے آخری راجہ سہہ دیو کے زمانے میں تین اہم شخصیتیں کشمیر آئیں۔ ان میں سے ایک رینچن تھا، جو والی تبت کا بیٹا تھا۔ دوسرے شاہ طاہر کے فرزند شاہ میرزا یا شاہ میر اور تیسرا دردستان کا ایک سردار لنکر چک۔ ان تینوں نے پہلے راجا کی ملازمت اختیار کی اور بعد میں حکومت کی کمزوری نے انہیں نظم و نسق میں دخیل بنا دیا، اور رفتہ رفتہ یہ برسر حکومت آ گئے۔

۱۳۱۸ء میں ذوالقدر خاں، جو کشمیر میں ذوالچو کے نام سے موسوم ہے، کشمیر پر حملہ آور ہوا۔ یہ چنگیز خاں کی اولاد میں سے تھا اور ترکستان کے ستر ہزار جرار سواروں کے ساتھ کشمیر پر حملہ آور ہوا تھا۔ راجہ سہہ دیو اس سے مقابلہ کی طاقت نہ پا کر کشتواڑ بھاگ گیا تھا، جہاں کے راجا سے اس کا

رشتہ تھا۔ ذوالچو نے کشمیر میں لوٹ مار کی اور سردیوں کے آغاز میں ہندوستان کی طرف لوٹتے ہوئے پہاڑوں میں برف باری کی وجہ سے اس کی فوج کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ ملک کی تباہ حالی نے پہاڑی قبیلوں کو بھی لوٹ کھسوٹ کی طرف مائل کیا۔ رینچن اور شاہ میرزا نے حکمت عملی سے اس فتنے کو رفع کیا اور رینچن نے حکومت خود سنبھال لی۔ اور شاہ میرزا کو اپنا وزیر مقرر کیا۔

رینچن شاہ بدھ مت کا پیرو تھا، لیکن کشمیر میں اسے اسلامی علما اور زاہدوں کے ساتھ ربط کا موقع ملا تھا۔ مسلمان کشمیر میں محمد بن قاسم کے زمانے سے آنے لگے تھے۔ کہتے ہیں کہ راجا داہر کا بیٹا جیسیا جب سندھ سے بھاگا تو کشمیر آ گیا تھا، اور اس کے ساتھ ایک مسلمان بھی تھا، جس کا نام حاتم بتایا جاتا ہے اس نے اپنے ملنے جلنے والوں کو اسلامی عقائد سے آگاہ کیا۔ اور کچھ لوگ اسلامی عقائد بھی اختیار کر چکے تھے۔ رینچن شاہ نے تخت کشمیر پر قبضہ کرنے کے بعد سہہ دیو کے وزیر رام چندر کی بیٹی، کوٹا رانی سے شادی کر لی۔ کوٹا رانی اسے ہندو عقائد قبول کرنے پر مائل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن پنڈت رینچن کو اپنے مذہب میں قبول کرنے پر تیار نہیں تھے وہ ابھی سوچ میں تھا کہ صبح کو اپنے محل سے دریائے جہلم کے اس پار، ایک بزرگ کو نماز ادا کرتے دیکھا۔ رینچن کو یہ طریق عبادت ایسا پسند آیا کہ ان بزرگ کے ہاتھ پر اسلامی عقاید پر ایمان لایا اور اپنے سارے اہل و عیال کو بھی اسلام میں داخل کر دیا۔

یہ بزرگ سید شرف الدین تھے، جو کشمیر میں بلبل شاہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ ترکستان کے ایک موسوی سید تھے اور وسیع سفر کیے تھے انھوں نے عرصہ تک بغداد میں قیام کر کے وہاں کے علماء سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ انھیں شاہ نعمت اللہ فارسی سے عقیدت تھی جو سہروردی طریقے میں امتیاز

رکھتے تھے۔ بلبل شاہ بڑے متقی، زاہد اور صوفی تھے اور ان کی زندگی خود عوام کے لئے مشعل ہدایت تھی۔ اس سے رینچن شاہ متاثر ہوا تھا۔ اس طرح وہ کشمیر کا پہلا اسلامی حکمراں ثابت ہوا۔ ان کا لقب بلبل شاہ مشہور ہونے کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگوں نے ایک دفعہ انہیں ایک بلبل کو پکڑنے کے لئے، بلبل کی شکل اختیار کر کے اس کے پیچھے اُڑتے دیکھا تھا۔ بعد میں انھوں نے بتایا تھا کہ یہ بلبل ان کی روح تھی۔

رینچن نے دو سال اور سات مہینے کی حکومت کے بعد انتقال کیا۔ اس نے کوٹا رانی کے بطن سے ایک بیٹا حیدر نامی چھوڑا تھا، لیکن وہ، اس کا جانشین نہیں ہوا۔ بلکہ کوٹا رانی نے شاہ میرزا کے مشورے سے سہدیو کے بھائی اُدین دیو کو، جو سہدیو کے خاندان کیساتھ ذوالچو کے حملے کے زمانے میں کشتواڑ کی طرف بھاگ گیا تھا، کشمیر بلا کر راجا بنایا، اور کچھ عرصہ بعد اس سے بیاہ کر لیا۔ لیکن اس کے پانچ سال بعد ہی ایک ترکی سردار اُوردن نامی نے کشمیر پر حملہ کیا۔ بامزئی نے اس کا نام اَچلّ لکھا ہے۔ حملہ کی خبر سنتے ہی، راجا لداخ کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن کوٹا رانی اور شاہ میر کی ہوشیاری سے یہ فتنہ رفع ہوا، اور اُورڈن قتل ہوا۔ اس کے بعد رانی نے اندرکوٹ جا کر، خود حکومت کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تاہم شاہ میرزا کی عقلمندی اور وفادارانہ رویے سے رانی کو نظم ونسق کے کام میں بڑی مدد ملی۔ حیدر کا وہ دلی بھی متفر رہا تھا۔

رانی اور شاہ میرزا میں اختلاف اس وقت پیدا ہو گیا۔ جب رانی نے اپنے دوسرے لڑکے کے ولی بھکشن بھٹ کو شاہ میرزا کے مقابلے میں حکومت کے کاموں میں زیادہ دخیل اور اپنی عنایات کا مورد بنانا شروع کیا۔ اس پر شاہ میر نے ترکیب سے، بھکشن بھٹ کو قتل کر دیا۔ رانی نے مقابلہ کیا، لیکن

اس کو شکست ہوئی، اور حکومت کشمیر پر شاہ میرزا کا قبضہ ہو گیا۔

شہمیری سلاطین ۱۳۳۹ء تا ۱۵۶۱ء

شاہ میرزا نے کوئی چار سال تک حکومت کی، اس کے بعد اس کی اولاد نے جو شاہ میری یا شہمیری سلاطین کے نام سے موسوم ہیں، قریب سوا دو سو سال تک حکومت کی۔ شاہ میرزا نے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔ فارسی زبان جو ان کی علمی اور ادبی زبان تھی، حکومت کی زبان کے طور پر ترقی کرنے لگی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ، ہند کے دوسرے اسلامی حکمرانوں کی طرح، سلاطین نے کشمیری زبان کی بھی سرپرستی کی۔ چنانچہ کشمیری کے ابتدائی شاعر حضرت نورالدین ریشی اور للہ دید اسی زمانے میں ہوئے۔ شہمیری خاندان کے بائیس حکمراں گذرے جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) سلطان شمس الدین (۱۳۳۹ تا ۱۳۴۲ء) (۲) جمشید (تا ۱۳۴۳) (۳) علاء الدین (تا ۱۳۵۴) (۴) شہاب الدین (تا ۱۳۷۳) (۵) قطب الدین (تا ۱۳۸۹) (۶) سکندر (تا ۱۴۱۳ء) (۷) علی شاہ (تا ۱۴۲۰ء) (۸) زین العابدین بڈشاہ (تا ۱۴۷۰ء) (۹) حیدر شاہ (تا ۱۴۷۲ء) (۱۰) حسن شاہ (تا ۱۴۸۴ء) (۱۱) محمد شاہ بار اول۔ (تا ۱۴۸۶ء) (۱۲) فتح شاہ بار اول (۱۴۹۳ء) (۱۳) محمد شاہ بار دوم (تا ۱۵۰۵ء) (۱۴) فتح شاہ بار دوم (تا ۱۵۱۴ء) (۱۵) محمد شاہ بار سوم (تا ۱۵۱۵ء) (۱۶) فتح شاہ بار سوم (تا ۱۵۱۷ء) (۱۷) محمد شاہ بار چہارم (تا ۱۵۲۸ء) (۱۸) ابراہیم (تا ۱۵۳۰) (۱۹) محمد شاہ مرتبہ پنجم (تا ۱۵۳۸) (۲۰) شمس الدین ثانی (تا ۱۵۳۹) (۲۱) اسماعیل شاہ (تا ۱۵۴۰) (۲۲) ابراہیم شاہ (تا ۱۵۴۰) (۲۳) نازک شاہ

سلطان (۲۵)) ۱۵۵۴ء (تا اسمعیل ثانی (۲۴) ـــــ ۱۵۱۱ء (تا
حبیب شاہ (تا ۱۵۵۶ء)

سلطان شہاب الدین کے عہد میں حضرت سید علی ہمدانی کشمیر تشریف لائے اور آپ اور آپ کے رفقائے اسلامی عقائد کی تبلیغ کی سعیٔ بلیغ فرمائی۔

سلطان قطب الدین کے عہد میں حضرت سید دوسری دفعہ کشمیر تشریف لائے اور ارشاد و ہدایت کے کام کو آگے بڑھایا۔ سکندر کے عہد میں آپ کے فرزند حضرت میر محمد ہمدانی کا ورود کشمیر میں ہوا۔ اور آپ نے اپنے والد کے کام کو آگے بڑھایا۔

سلطان زین العابدین بڈشاہ شہمیری خاندان کا گل سرسبد مانا جاتا ہے وہ اچھا جرنل تھا، اور اس سے اچھا ماہر نظم و نسق اور سب سے بڑھ کر وہ علم و فن کا سرپرست تھا وہ عربی اور فارسی میں شعر کہتا تھا، اور مورخین کا بیان ہے کہ وہ فارسی کے علاوہ کشمیری اور ہندی بھی جانتا تھا۔ اس نے سنسکرت کے عالموں کی بھی قدر دانی کی اور اس کی سرپرستی کا شہرہ سن کر اطراف و اکناف سے علماء آکر اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ کشمیر کے فارسی شعراء میں ملا احمد نے اس کے دربار میں بلند مقام پیدا کر لیا تھا۔

بڈشاہ کے بعد سلطان حیدر شاہ نے فارسی شعر و ادب کی بڑی سرپرستی کی۔ وہ بھی حوصلہ مند بادشاہ تھا، لیکن امرائے سلطنت کی آپس کی ناچاقیوں نے اسے سلطنت کے کاموں کی طرف سے بے پروا کر دیا اور اس نے اپنی کلفتوں کو مے و نغمہ میں بھلا دینے کو ترجیح دی۔ میر شمس الدین عراقی جنھوں نے کشمیر میں شیعہ عقائد کو رواج دیا، اسی زمانے میں کشمیر آئے تھے۔

محمد شاہ کے زمانے سے ان خاندانی منافشات کا آغاز ہوا، جو شاہ میری سلطنت کے انجام کا آغاز ثابت ہوئے۔ محمد شاہ نابالغ تھا۔ اس کو سلطان زین العابدین بڈشاہ کے پوتے فتح شاہ نے بیدخل کرکے خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لیکن محمد شاہ اور اس کے حلیف خاموش نہیں بیٹھے، بلکہ، فوج اکٹھی کرکے، اسے تخت سے بیدخل کر دیا۔ اس طرح دونوں میں کشمکش کوئی ستر برس تک جاری رہی۔ محمد شاہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے پانچ مرتبہ بساطِ حکومت پر بیٹھا اور مات کھائی، فتح شاہ تین مرتبہ بادشاہ بنا۔ آخر ۱۵۲۵ء میں کاجی چک نے جسے اب اتنا اقتدار حاصل ہوگیا تھا کہ حکمرانوں کے عزل و نصب میں سب سے پیش پیش ہوگیا تھا، محمد شاہ کو تخت سے اتار کر موضع لُد کے تنگ و تاریک درہ کوہ میں مقید کر دیا اور محمد شاہ کے بیٹے ابراہیم کو بساط حکومت پر شاہ شطرنج کی طرح متمکن کر دیا، لیکن اس کو چالیں چلانے والا خود وہی شاطر تھا اور سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اس اثناء میں ماگری طبقے کے لوگوں نے، جو کاجی چک کے مدمقابل تھے، آخری مرتبہ محمد شاہ کو ۱۵۳۰ء میں بادشاہ بنایا، اور بساط کے چار بڑے مہروں نے ملک کو چار حصوں میں بانٹ لیا۔ اس طرح ملک ابدال کے حصے میں ایک علاقہ آیا، لوہر ماگری کو ایک حصہ ملا، ریگی چک کو ایک اور علی رینہ کو ایک حصہ مل گیا۔

سیاست کی یہ صورتحال ایسی نہیں تھی کہ بیرونی طاقتوں کو دعوت نہ دیتی۔ چنانچہ ۱۵۳۱ء (۹۳۹ھ) میں کاشغر کے حکمران، سلطان سعید خاں نے اپنے بیٹے سکندر خاں کو اپنے بھتیجے مرزا حیدر کی سرکردگی میں کشمیر پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ بابل کے صحرا میں دونوں صفیں آراستہ ہوئیں

اور گھمسان کا رن پڑا۔ جس کے بعد میرزا حیدر کامران شہر میں داخل ہوا، تاہم کشمیری سرداروں نے اسے بہت تنگ کیا اور وہ صلح کر کے کاشغر لوٹ گیا۔

سرداروں کی آپس کی یہ کش مکش اس خاندان کے خاتمے تک جاری رہی دو زبردست گروہ، چک اور ماگری ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ کاجی چک نے حکومت پر پورا تسلط جما لیا تھا۔ اس نے محمد شاہ کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل کو اپنی بیٹی بیاہ دے کر، گویا حکومت کے لئے استحقاق پیدا کر لیا تھا اسمٰعیل کو جب اس نے بادشاہ بنایا تو سارا اقتدار اس کے ہاتھوں میں رہا۔ لیکن ماگری اور دوسرے سرداروں نے اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ اس لئے یہ بھی ہوا کہ ملک کبھی پانچ، کبھی چار، اور کبھی تین سرداروں کے درمیان بٹتا گیا۔ ۱۵۲۹ء میں چکوں کے ہاتھوں جب ماگریوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی تو ابراہیم ماگری نے بابر سے کشمیر پر حملہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ پھر ۱۵۳۱ء میں ماگری سرداروں نے چکوں کے خلاف ہمایوں سے مدد طلب کی تھی، لیکن ہمایوں شیر شاہ سے ہزیمت کھا کر خود آپ پریشانی میں گھرا ہوا تھا اس لئے میرزا حیدر فوج لے کر کشمیر کی طرف گیا اور فتح پائی۔ تاہم متحارب سرداروں میں سمجھوتے کے لئے ملک کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور میرزا حیدر نے فتح شاہ کو ۱۵۴۰ء میں تخت پر بٹھایا۔

میرزا حیدر نے ملک کی ترقی اور صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لئے بہت سے کام کئے۔ اس نے ترکی طرز کے حمام بنوائے، شال بافی اور کاغذ سازی کو رواج دیا۔ علم و فضل سے بھی اسے دل چسپی تھی، وہ "تاریخ رشیدی" کا مصنف ہے، جس سے اس زمانے میں کشمیر کے بہت سے حالات

پر روشنی پڑتی ہے۔ امرا کی مخالفت کی وجہ سے میرزا قتل کر دیا گیا۔ میرزا کے انتقال کے بعد ۱۵۵۱ء میں دولت چک نے نازک شاہ کو معزول کر کے ابراہیم کے بیٹے اسمٰعیل کو تخت پر بٹھایا، لیکن سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں رہا۔ اقتدار کی ہوس نے خود اس کے بھائی غازی چک کو اسے قتل کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اور اس کے قتل کے بعد غازی چک نے اسمٰعیل اوّل کے بیٹے حبیب شاہ کو جو اس کا بھانجا ہوتا تھا، تخت پر بٹھایا، لیکن جلد ہی اسے بھی معزول کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا۔ اسی طرح چک خاندان کے ہاتھوں کشمیری خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

چک خاندان سنہ ۱۵۵۵ء تا ۱۵۸۶ء

غازی چک نے سنہ ۱۵۵۵ء میں کشمیر کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی، اور نو سال حکومت کرتا رہا۔ اس خاندان کے چھ بادشاہ ہوئے۔ خود غازی چک نے ملک میں امن و امان قائم کرنے کی کوشش کی اور بعض علاقوں کو جیسے لداخ اسکردو، گلگت، کشتوار، پونچھ وغیرہ کو جو سرداروں کی کش مکش کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے، پھر کشمیر میں شامل کیا۔ حسین شاہ چک (۱۵۶۳ء تا ۱۵۷۰ء) نے فارسی علم و ادب کو بہت فروغ دیا۔ بعد میں حکومت سے دست برداری اختیار کر لی۔ علی شاہ نے نو برس حکومت کی اور ۱۵۷۹ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد یوسف شاہ تخت پر بیٹھا۔

یوسف شاہ کی طبیعت عیش کوشی کی طرف زیادہ مائل تھی، اس کا نام تاریخ میں بادشاہ کی حیثیت سے زیادہ، حبہ خاتون کے شوہر ہونے کی وجہ سے مشہور رہا ہے، حبہ خاتون کو یوسف نے جھونپڑے سے اٹھا کر محل شاہی تک پہونچایا تھا۔ یوسف کو موسیقی کے ساتھ شاعری سے بھی دلچسپی

تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ نظم و نسق سے اسے کم لگاؤ رہ گیا تھا۔ آخر اس نے حکومت سے دست برداری اختیار کر لی، اور وزیر سید مبارک خاں بیہقی نے حکومت سنبھالی۔ پھر یوسف نے اکبر سے حکومت کی بحالی کے لئے مدد طلب کی، اور جب اکبر نے راجہ مان سنگھ اور میرزا یوسف رضوی کو فوج دیکر اس کی مدد کے لئے بھیجا، تو کشمیری امرا نے خود اسے حکومت کا پیش کش کیا۔ وہ راجہ مان سنگھ کو اطلاع دیئے بغیر فوج کا ساتھ چھوڑ کر کشمیر چلا آیا، اس کے پہنچتے پہنچتے کچھ امیر اپنے قول سے پھر گئے، تاہم اس نے لڑ کر دوبارہ ۱۵۸۰ء میں حکومت حاصل کی۔

اکبر یوسف شاہ کے رویہ سے سخت ناراض ہو گیا۔ اور اس نے یوسف کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ جب یوسف کو جانے میں تامل ہوا تو اکبر نے راجا بھگوان داس، شاہ رخ میرزا اور شاہ قلی خاں کو بھاری فوج کے ساتھ کشمیر بھیجا۔ یوسف نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، تاہم بھگوان داس کے سمجھانے بجھانے سے اکبر کے دربار میں جانے پر آمادہ ہو گیا۔ اکبر نے اسے اپنے دربار ہی میں رکھا اور کشمیر لوٹنے سے منع کر دیا، اور دربار سے پنجہزاری منصب اسے عطا کی۔

یوسف کے بعد عمائدین سلطنت نے اس کے بیٹے یعقوب کو ۱۵۸۵ء میں تخت پر بٹھایا۔ اس نے چک سلسلے کے بانی کی طرح مذہبی معاملات میں غلو سے کام لینا شروع کیا، اس لئے بقول پیر غلام حسن کویہامی، اکابر کشمیر کی ایک بڑی تعداد کے مشورے سے جناب شیخ بابا داؤد خاکی اور حضرت یعقوب صرفی جیسے سربرآوردہ علما اکبر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کشمیر کی تسخیر کی دعوت دی۔

مغلیہ عہد ۱۵۸۶ء تا ۱۷۵۲ء

۱۵۸۶ء سے لے کر ۱۷۵۲ء تک کوئی ڈیڑھ سو ناظم کشمیر پر دہلی کی طرف حکومت کرتے رہے۔ پہلا ناظم، قاسم خاں میر بحر مقرر ہوا تھا۔ اُس کو یعقوب شاہ چک اور اس کے ساتھیوں نے کافی پریشان رکھا۔ آخر میں کچھ کشمیری امرا کے اس سے پھر جانے کی وجہ سے وہ تھک کر بیٹھ رہا۔ اکبر سے لے کر مغل حکمراں احمد شاہ کے زمانے تک کشمیر کی سیاسی زندگی کو بڑے سیاسی نشیب و فراز سے گذرنا پڑا۔ تاہم جہاں تک فارسی زبان اور ادب کا تعلق ہے۔ یہ زمانہ اس کی ترقی کے لئے کافی مساعد ثابت ہوا۔ مغل حکمرانوں اور امرا کو فارسی سے جو لگاؤ اور شعر و سخن کا جو ذوق تھا۔ اس کا اثر کشمیر میں بھی نمایاں تھا۔ کشمیر کے فارسی شعرا اور ادیبوں کی سرپرستی ہوئی اور باہر سے بھی کئی سخن ہرا کشمیر آئے۔ اس اعتبار سے کشمیر کے ناظم ظفر خاں احسن کا دور بہت درخشاں رہا۔ احسن خراسان سے تعلق رکھتا تھا۔ اور کابل، دکن اور ہند میں عرصہ تک اپنے باپ کا نائب رہ چکا تھا۔ ۱۶۳۲ء میں وہ اپنے باپ کا نائب ہو کر کشمیر آیا، اور اپنے ساتھ اس عہد کے کچھ نغز گفتار سخن سنجوں کو بھی کشمیر لایا۔ ان میں میرزا صائب اور میر الٰہی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میرزا صائب سے قیام کابل کے زمانے ہی میں اس کی ملاقات ہو چکی تھی۔ جیسے سخن سنج باہر سے آئے تھے ان کے مرتبے کے کئی شعرا کشمیر میں بھی موجود تھے، اور ان کے نغموں سے فضا گونج رہی تھی۔

جہانگیر کو کشمیر سے عشق تھا، وہ اکثر موسم بہار یہیں بسر کرتا تھا۔ اس کی حسن پسند نظر نے جہاں کہیں دامنِ کہسار، آب رواں اور سایہ دار چنار کے کنج دیکھے، اس مقام کو ایک باغ فرحت بخش میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ سرینگر

کے اطراف و اکناف میں شالیمار، اچھ بل، ویری ناگ، چشمہ شاہی، کتنے ہی ایسے حسین گوشے ہیں، جو مغل ذوقِ حسن کاری کی یادگار کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔ نشاط نور جہاں کے بھائی آصف خاں نے بنوایا تھا۔ ذیل کے شعر میں شاعر نے جہانگیر کے بطون کی پردہ کشائی کی کوشش کی ہے۔

از شاہ جہانگیر دم نزع چو پرسند
باخواہش دل گفت کہ کشمیر دیگر ہیچ

کشمیر کے حسن پر مرنے والے اس شہنشاہ کی موت بھی کشمیر سے دور نہیں ہوئی۔ کشمیر سے جاتے ہوئے بہرام گلہ میں اس کا انتقال ہوا۔

شاہ جہاں کے عہد میں نو ناظموں نے کشمیر پر حکومت کی۔ شاہ جہاں کو بھی کشمیر سے محبت تھی، لیکن اسے یہاں کے لوگوں کی فلاح کا اس سے زیادہ خیال تھا۔ اس نے بہت سے رفاہی کام کیے تھے۔ ظفر خاں احسن نے جو اس کے زمانے میں گورنر رہا، کئی باغ بنوائے تھے اور ان میں دور دور سے میووں کے درخت منگوا کر لگوائے تھے۔ شاہ جہاں کے بیٹوں میں دارا شکوہ کا کشمیر سے گہرا تعلق رہا۔ وہ، اس کی بہن جہاں آرا اور اس کی بیگم نادرہ بیگم کا قیام عرصہ تک کشمیر میں رہا۔ اپنے پیر ملا شاہ بدخشانی اور ان کے معتقدین کے صوفیانہ اوراد اشغال اور وظایف میں مشغولیت کے لئے اس نے چشمہ شاہی کے قریب پہاڑ کے ڈھلوان پر ایک خانقاہ جہاں متصوفانہ کتابوں کا ایک کتب خانہ بھی تھا تعمیر کروائی تھی۔ اس کا نام کنتلون پڑ گیا تھا، لیکن اب وہ پری محل کے نام سے مشہور ہے۔ اس رومان خیز نام نے کئی شاعروں کے تخیل کو دعوت پرواز دی اور کشمیر کے کئی خوش فکر شعرا نے اس پر نظمیں لکھی ہیں۔

فاضل خاں ناظم کشمیر (۱۶۹۸ تا ۱۷۰۱) کے عہد میں آنحضرت کے مشہور موئے مبارک، جو مکہ کے خاندان شریف کے ایک فرد سید عبداللہ، اپنے ساتھ لائے تھے، اور کچھ عرصہ بیجاپور کے آثار محل میں بھی محفوظ رہ چکے تھے، اور اورنگ زیب نے انہیں نورالدین ایشا بری سے لے کر، اجمیر کی درگاہ میں رکھوایا تھا، آخر کار کشمیر لائے گئے۔ اور اب حضرت بل میں لاکھوں عوام کی زیارت کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

اورنگ زیب متقشف سہی، لیکن فطری حسن و خوبی کے اثر کے لئے کورا نہیں تھا۔ اسے ۱۶۶۵ء میں کشمیر آنے کا موقع ہوا تھا، جب اس کی لڑکی روشن آرا بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ کشمیر کے نظاروں کی لطافتوں کو راستے کی زحمتوں اور کشمیر کے غریب لوگوں کی کلفتوں کا بدل نہیں سمجھتا تھا۔ قیام کشمیر کے زمانے میں اس نے نظم و نسق کی اصلاح بھی کی تھی۔

اورنگ زیب کے بعد دہلی میں جو افراتفری کا دور دورہ شروع ہوا کشمیر کو بھی اس کا وافر حصہ ملا۔ بہادر شاہ (۱۷۰۷ء) سے لے کر احمد شاہ تک (۱۷۵۱ء) کشمیر پر جو ننتیس ناظموں نے حکومت کی اور بعضوں نے بہت تھوڑے عرصہ کے لئے اور بعض ایک سے زیادہ مرتبہ ناظم مقرر ہوئے مثلاً ابوالبرکات خاں وقفے وقفے سے پانچ مرتبہ ناظم رہا۔ دہلی کے حکمرانوں کو اپنی عیش کوشی کی وجہ سے یا سازشوں کے درمیان اتنی فرصت نہیں ملی۔ کہ وہ کشمیر آنے کی تکلیف اٹھاتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اکثر ناظم مقامی مفادات پیدا کر لیتے تھے، اور انہیں کشمیر چھوڑنا گوارا نہ ہوتا۔ چنانچہ ابوالبرکات خاں کا کچھ ایسا ہی حال تھا۔ آخر میں اس کا بیٹا، ابوالقاسم خاں بھی ناظم رہا، مشکل سے چند ماہ حکومت کرنے پایا تھا احمد شاہ درانی کا کشمیر پر حملہ ہوا

اور ۱۷۵۱ء سے یہاں افغانوں کا تسلط ہو گیا۔

سیاست اور نظم ونسق کے اعتبار سے کشمیر میں مغلوں کے عہدِ حکومت کے بارے میں اختلاف رائے کی بڑی گنجائش ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ سامراجی نظام جہانبانی تھا۔ حکومت عام طور پر عوام کے مفاد کے لئے نہیں تھی۔ تاہم کئی ناظم ایسے آئے جنہیں عوام کی خاطر عزیز تھی۔ انھوں نے رفاہِ عام کے بھی کام انجام دیئے۔ جہاں تک فارسی علم وادب کا تعلق ہے، مغلوں کے بہت سے کارنامے ایسے درخشاں رہے کہ، کشمیر ایران صغیر کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ نئے ایرانی علماء اور شعرا جو ہندوستان ہوتے ہوئے کشمیر آئے تھے، ان کے ساتھ نئے تصورات اور نئے اسالیب بھی آئے، جس کے نتیجے میں کچھ ایسے سربرآوردہ شاعر کشمیر سے اُٹھے جن کی اہمیت تاریخ ادبیات ایران میں گھٹائی نہیں جا سکے گی۔

افغان عہد افغانوں کی حکومت کا دور کشمیر میں دورِ ابتلا سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بامزئی نے درست لکھا ہے کہ افغانوں کو کشمیر کی حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کی دعوت دیتے ہوئے، اہل کشمیر کو دھوکا ہوا تھا کہ وہ ہندوستان کے مغل شہنشاہوں کی طرح مہذب اور انسانی ہمدردی رکھنے والے حکمرانوں کو اپنے اوپر مسلط کر رہے ہیں۔ ان کی اس چوک نے انہیں گویا کڑھائی سے چولہے میں جھونک دیا۔ اس کیفیت کو ایک شاعر نے ذیل کے شعر میں ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔ کہتا ہے۔

پرسیدم از خرابی گلشن ز باغباں
افغاں کشیدہ گفت کہ افغاں خراب کرد

افغان کشمیر پر ستر سال مسلط رہے۔ عبداللہ خاں ایشک اقاسی

جس نے کشمیر پر افغانوں کے تسلط کو قائم کرنے میں کارنمایاں انجام دیا تھا پہلا افغان ناظم مقرر ہوا تھا۔ وہ بہت سخت گیر حکمراں تھا۔ اس کے جانے کے بعد خواجہ عبداللہ خاں کابلی ناظم اور سکھ جیون مل، جو پنجاب کا ایک کھتری تھا، اس کا صاحب کار یا مشیر مقرر ہوا۔ اس نے ابوالحسن بانڈی کی مدد سے خواجہ عبداللہ خاں اور اس کے دو لڑکوں کو قتل کر دیا، اور خود راجہ بن بیٹھا۔

سکھ جیون مل نے ابوالحسن بانڈی کو صاحب کار اور مدارالمہام مقرر کیا اور ابتدا میں اس نے سلیقے سے حکومت کی، لیکن بعد میں صاحب "خزانہ عامرہ" کے بیان کے مطابق :-

"بہ تحریک جہانند جو مشیر خاص و مدارالمہام سلوک بامسلمانان متغیر شد۔"

سکھ جیون مل فارسی میں شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتا تھا، وہ خود بھی شاعر تھا اور اپنے عہد کے بہت سے شعرا کی اس نے سرپرستی بھی کی۔ اس نے ایک شاہنامہ کشمیر بھی لکھوانا شروع کیا تھا، جس کی تفصیل بعد میں آ رہی ہے۔ اس کی بغاوت نے احمد شاہ کو اس کے خلاف نورالدین خاں بامزئی کو بھیجنے پر مجبور کیا۔ سکھ جیون مل نے مقابلہ کیا اور آخر شکست کھائی۔ اور اس کی دونوں آنکھیں نکلوا دی گئیں اور کابل بھیج دیا گیا۔

نورالدین خاں بامزئی تین مرتبہ کشمیر کا گورنر رہا، اس کے بعد خرم خاں دوسری مرتبہ اور پھر امیر خاں جوان شیر حاکم ہو کر آیا۔ یہ اتنا اچھا ماہر نظم و نسق نہیں تھا، جتنا اچھا صاحب نظر اور صاحب ذوق انسان تھا۔ اس نے دارہ باغ کو جو درشتے کا موروثی باغ تھا، از سر نو تعمیر کروایا، اور

اسے اپنی قیام گاہ کے لئے منتخب کیا۔ یہ عمارت دریائے جہلم کے کنارے بڈشاہ پل سے ملحق ہے۔ اور شیر گڑھی کے نام سے موسوم ہے۔ امیرا کدل اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے جھیل ڈل میں ایک باغ، باغ امیر آباد کے نام سے بنوایا تھا۔

افغان ناظموں میں سے کوئی ستائیس نے کشمیر پر حکومت کی۔ آخری زمانے میں ان کی بدانتظامیوں اور اہلِ کشمیر کے ساتھ ان کے ناروا سلوک نے، اہلِ کشمیر کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف، نجات دہندہ کی حیثیت سے نظریں اُٹھانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ بیربل در نے یہ فرض اپنے اوپر لیا، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں جاکر اسے کشمیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ رنجیت سنگھ کو جب پس وپیش ہوا، تو اس نے اپنے بیٹے راج کاک در کو یرغمال کے طور پر اس کے دربار میں چھوڑا۔ اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تیس ہزار سوار بیربل در کی سرکردگی میں کشمیر پر حملہ کرنے کے لئے بھیجے۔ اس فوج کی کمان راجہ گلاب سنگھ، دیوان چند اور سردار ہری سنگھ کو سونپی گئی۔ پیر پنجال کی بلندیوں پر بڑی گھمسان کی لڑائی لڑی گئی، جس میں آخر کار افغانوں کو شکست ہوئی۔ کشمیر کے آخری افغان ناظم جبار خاں سے ایک آخری لڑائی، شوپیاں میں لڑی گئی، جس میں جبار خان زخمی ہوا، اور افغانستان کی طرف فرار ہوگیا۔ اس طرح کوئی پانچ صدی کی حکمرانی کے بعد، کشمیر سے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دربار میں بیربل در کی خدمت گزاری کی اور اس کے بیٹے راج کاک در کو خلعت سے سرفراز کیا۔

بیربل در کی افغانوں سے مخاصمت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عظیم خان

E+B 1821

کے دورِ حکومت میں، میرزا پنڈت در اور سکھ رام صفایا کے ساتھ اسے کشمیر کے مالیہ کا اجارہ عطا ہوا تھا۔ جب حسابات کی جانچ ہوئی تو محصولات کی رقم میں ایک لاکھ کا غبن نکلا، اس پر سردار عظیم خاں بیربل در سے مواخذہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میرزا پنڈت نے اس کی ضمانت لی۔ اور راتوں رات بیربل در کو جموں روانہ کر دیا، جہاں سے وہ راجہ گلاب سنگھ کا سفارشی خط لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے یہاں پہنچا۔ کہتے ہیں جانے سے پہلے اس نے دیوانِ حافظ سے فال لیا تھا۔ اور جو شعر برآمد ہوا تھا اس کا آخری مصرعہ ہے۔

بہ شہر خود روم و شہریارِ خود باشم

بیربل کے فرار ہونے کے بعد، سردار عظیم خاں اور میرزا پنڈت کے درمیان جو گفتگو ہوئی بڑی دل چسپ ہے۔ عظیم خاں نے سوال کیا "بیربل کجا رفت؟" میرزا پنڈت نے جواب دیا "ہر گاہ او را ہوس دنیا نماندہ باشد بہ گنگا خواہد رفت اگر ہوس دنیا باقی باشد، پس پیش رنجیت سنگھ رفتہ، فوج گرفتہ می آید"۔ سردار نے پوچھا "پس چہ صلاح؟" اس نے جواب دیا "کشتن میرزا پنڈت" پھر عظیم خاں نے سوال کیا "بقایا می بیربل؟" میرزا پنڈت۔ "بنام میرزا پنڈت"۔ اس برجستہ سوال پر عظیم خاں خاموش ہو گیا۔

سکھوں کا عہد

کشمیر میں سکھوں کی حکومت کا زمانہ اٹھائیس سال پر حاوی ہے۔ اس دوران گیارہ ناظم مقرر ہو کر کشمیر آئے۔ پہلے ناظم دیوان مسر چند نے کشمیر سے افغانوں کے اقتدار کے آخری آثار کو مٹانے اور سکھوں کا تسلط مستحکم کرنے کا کام انجام دیا۔ دوسرے ناظم دیوان موتی رام کے دور میں پنڈت بیربل در کو مالیات کا افسر مقرر

کیا گیا۔ موتی رام کے جانشین سردار ہری سنگھ نلوہ کے دورِ نظامت میں بھی بیربل در اپنی خدمت پر مامور رہا۔ لیکن اس کی ترقی نے در فرقے کے ایک فرد پنڈت گنیش در کو اس کا دشمن بنا دیا۔ اس نے سردار ہری سنگھ نلوہ کے پاس مخبری کی کہ بیربل در پہاڑی سرداروں کے ساتھ سازش کر کے سکھوں کی حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب یہ خبر سنی تو بیربل در کو ملازمت سے برطرف کر دیا اور اس کی ساری املاک ضبط کر لیں۔ اس طرح اس مطلق العنان راجہ کے ہاتھوں وہ اپنی زندگی کا آخری زمانہ کرب و افلاس میں کاٹنے پر مجبور ہو گیا، جس کو اس نے کشمیر کی حکومت دلائی تھی۔

۱۸۲۶ء میں زبردست خاں حاکم مظفرآباد نے کشمیر کو سکھوں کے تسلط سے آزاد کرانے کی کوشش کی، اس کی کوششیں ناکام رہیں۔ ۱۸۳۱ء میں سردار بھما سنگھ ناظم ہو کر آیا۔ اس کے زمانہ کا مشہور واقعہ، سید احمد بریلوی اور ان کے ساتھی جانبازوں کی بھارت کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کی کوشش تھی، اور چونکہ سکھ انگریزوں کے حلیف تھے، اس لئے جانبازوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا، لیکن بالاکوٹ کی لڑائی میں سید احمد شہید ہوئے اور ان کے پیرو منتشر کر دیئے گئے۔

کرنل مہان سنگھ، سکھ ناظموں میں سب سے زیادہ قابل تھا۔ اس نے عوام کی بھلائی کے بہت سے کام کئے اور لوٹ مار، جو سکھ فوجیوں کی عادت بن گئی تھی، اس سے انہیں روکا۔ اس پر فوجیوں نے بغاوت کر دی اور رات کو سوتے میں کرنل کو قتل کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے، گلاب سنگھ کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اس نے بغاوت تو فرو کر دی، لیکن کشمیر پر تسلط کا خیال اس کے ذہن میں سما گیا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے بعد،

جب سکھ سلطنت میں افراتفری مچ گئی تو انگریزوں کے علاقے پر سکھوں نے حملہ کر دیا، لیکن انہیں شکست ہوئی اور تاوان کی رقم کے معاوضے میں لاہور کی حکومت نے کشمیر انگریزوں کے حوالے کرنا چاہا۔ راجا گلاب سنگھ کے لئے یہ اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اس نے رقم تاوان خود ادا کرنے کا ذمہ لیا، اور اس کے معاوضے میں، کشمیر اپنے قبضے میں دینے کی درخواست کی۔ گلاب سنگھ نے انگریزی حکومت کی جو خدمات انجام دی تھیں، اس کے صلے میں پچھتر لاکھ روپے کے معاوضہ میں عہد نامہ امرتسر کی رو سے کشمیر اس کے حوالے کر دیا گیا، اور ۱۸۴۶ء (م ۱۲۶۲ھ) سے کشمیر ڈوگرا تسلط کے تحت آگیا۔

کشمیر میں سکھوں کا دور، جیسا بدنام اور حوصلہ فرسا رہا تھا، اس کا کچھ حال اس عہد کے شاعر، حمید اللہ شاہ آبادی نے اپنے "بیوج نامہ" میں لکھا ہے، جس کی تفصیل آگے دی گئی ہے۔

ڈوگرا عہد

معاہدہ امرتسر کے طے پانے کے بعد، مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنے زیروں لکھپت اور ہیتوں کو فوج دے کر کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا۔ اس وقت شیخ امام الدین سکھوں کی طرف سے کشمیر کا ناظم تھا۔ سکھ حکومت کے سربراہ، لال سنگھ نے امام الدین کو خفیہ طور پر چٹھی بھیجی کہ وہ گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ نہ دے۔ چنانچہ کشمیری فوج نے امام الدین کی سرکردگی میں، ڈوگرا فوج کا مقابلہ کیا، جب کامیابی کی صورت نظر نہیں آئی تو گلاب سنگھ نے انگریزوں سے مدد طلب کی۔ آخر انگریز فوج کی مداخلت سے گلاب سنگھ کا قبضہ کشمیر پر ہو گیا۔ اور اس نے بیربل در کے بیٹے راج کاک در کو کشمیر کا ناظم مقرر کیا۔

گلاب سنگھ نے کشمیر میں امن کی بحالی کی کوشش کی اور پنڈت راج کاک در

ناظم کشمیر کے ناروا سلوک اور مظالم کی وجہ سے شال باف، جو کشمیر سے ہجرت کر جانے کی تیاری کر رہے تھے، گلاب سنگھ نے انہیں روکا اور ان کی شکایتوں کو دور کرنے کا حکم دیا۔ گلاب سنگھ اب پہاڑی علاقے کا سب سے زیادہ طاقتور راجہ ہو گیا تھا۔ اس نے اسکردو، لداخ، کشتوار اور ضلع جہلم کو سلطنت کے حدود میں شامل کر کے اسے وسعت دی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۵۶ء میں کشمیر کی حکومت اپنے بیٹے، رنبیر سنگھ کے سپرد کر دی، اور خود کشمیر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ اس کے ایک سال بعد ۱۸۵۷ء میں ہند کی آزادی کے لئے پہلی لڑائی لڑی گئی، اس لڑائی میں رنبیر سنگھ نے اپنے باپ کے حکم کی بنا پر انگریزوں کی مدد فوج اور روپے سے کی۔ آخر آزادی خواہوں کو اپنی کوششوں میں ناکامی ہوئی، اور انگریزوں کا تسلط بھارت پر مستحکم ہو گیا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں، جہاں تک درباری زبان کا تعلق ہے اگلے طویل عہد کی روایت جاری رہی، حالانکہ جدید ہندوستانی زبانوں میں اردو، ہندوستان کے اور علاقوں کی طرح کشمیر میں پھیل رہی تھی، اور ادبی زبان کے طور پر رائج ہونے لگی تھی، مہاراجہ رنبیر سنگھ نے نظم ونسق کی اصلاح کی اور نئے عہد کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے، تعلیم کے نئے طریقے رائج کیے گئے، اور نئے اسکول قائم ہوئے، ذریعہ تعلیم کی جگہ اردو نے لے لی، لیکن علمی اور ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی ہی کا چلن رہا، مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جو دارالترجمہ قائم کیا تھا، اس میں فارسی سے کئی ترجمے اردو اور دوسری زبانوں میں کیے گئے تھے۔ خاص طور پر فارسی اور عربی کی تعلیم کے لئے علیحدہ مدرسے بھی قائم کیے تھے۔ رنبیر سنگھ کے جانشین پرتاپ سنگھ کے عہد میں اردو

کو دفتری اور سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا، اس کے باوجود ادبی اعتبار سے فارسی اپنی جگہ پر قائم رہی۔

ریاست میں سیاسی آزادی کی جدوجہد ۱۹۲۴ء سے شروع ہوئی اس کے ایک سال بعد، ہری پرتاپ سنگھ کا انتقال ہوگیا، اور مہاراجہ ہری سنگھ ان کے جانشین ہوئے۔ ۱۹۴۷ء تک انھوں نے حکومت کی۔ لیکن اس سارے دور میں ذمہ دار حکومت کے لئے جدوجہد جاری رہی۔ پہلے پڑھے لکھے نوجوانوں نے ینگ منز مسلم ایسوسی ایشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، پھر کسی قدر وسیع پیمانہ پر مسلم کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، جس کے کام کو ریاست کے سارے حصوں میں پھیلانے اور سارے نقطۂ خیال کے لوگوں کو اس میں شامل کرنے کے مقصد سے اس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کردیا۔ اس جدوجہد میں عوامی قائدین، غلام حیدر شاہ، قاضی گوہر رحمٰن، اللہ رکھا ساغر، غلام احمد اشائی، اور دوسرے کئی اصحاب، منظرِ عام پر آئے اور ہم سے قریب تر زمانے میں شیخ محمد عبداللہ، مرزا افضل بیگ، بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق چودھری غلام عباس، مولانا محمد سعید نے قیادت کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔

تقسیم ہند کے بعد کشمیر کا الحاق، ہندوستان کے ساتھ عمل میں آیا، اور اب یہاں نمائندوں کی حکومت قائم ہے، اور وہ ساری تحریکیں جو ہندوستان کی، سماجی اور علمی اور ادبی زندگی میں برپا ہیں، ان کا حصہ دار کشمیر بھی بن گیا ہے۔

٭٭٭

۲

آغازِ سخن

فارسی زبان کشمیر سے بہت قدیم زمانے میں روشناس ہوئی۔ اہل کشمیر کے تہذیبی رشتے ایران سے قدیم زمانے سے رہے تھے۔ وادی کے ابتدائی بسنے والے جو ہند یوروپی اور ہند ایرانی شاخ سے کٹ کر وسط ایشیا اور بلتستان اور دردستان ہوتے ہوئے کشمیر میں آکر بسے تھے، لفظوں کا ابتدائی ذخیرہ اپنے ساتھ لائے تھے، کشمیر کے وسط ایشیا کے ان ملکوں سے تجارتی اور تہذیبی تعلقات کی بدولت ترقی یافتہ فارسی زبان کے اثرات بھی یہاں پہنچتے رہتے تھے۔ ہندو راجاؤں کے عہد میں بھی یہ تعلقات قائم رہے، پھر اسلامی عقائد، طرز زندگی اور طرزِ فکر کی لہریں، ایران کو اپنے آغوش میں لینے کے بعد، جب وسط ایشیا کی طرف بڑھیں، تو یہ کشمیر کی سرحدوں سے بھی آکر ٹکرانے لگیں۔ کشمیر کے کارکوٹ راجہ چندرا پیڈ کے عہد میں سب سے پہلے اس نئی رو کا شعور کشمیر کے حکمرانوں کو ہوا۔ اس کے بعد راجہ للتا دتیہ

نے اس خطرہ کو بہت قریب محسوس کیا تو اپنی سلطنت کو، اس کے اثر سے مصئون اور محفوظ رکھنے کے لئے، اس نے چین کے شہنشاہ سے مدد کی درخواست کی اس راجہ کو وسط ایشیا، افغانستان اور ہند کے مغربی علاقوں پر فوج کشی کرتے ہوئے زندگی کی اس نئی رو سے رو در رو ہونے کے مواقع بھی ہو چکے تھے۔ اس کے بعد جب سندھ پر محمد بن قاسم کا تسلط ہو گیا، اور عربی فارسی بولنے والوں کی حکومت اس خطہ ارض پر قائم ہو گئی، تو محمد بن قاسم نے ملتان کے راستے سے کشمیر کی طرف بھی بڑھنے کی کوشش کی تھی۔ اس زمانہ میں کشمیر میں راجہ چندرا پیڈ کا راج تھا، اور اس نے چین سے مدد لینی چاہی تھی لیکن محمد بن قاسم کے دمشق طلب کر لئے جانے کی وجہ سے یہ خطرہ ٹل گیا تھا۔

جہاں تک مملکت کی توسیع کا تعلق تھا، یہ خطرہ ٹل گیا، لیکن نئے خیالات نئے عقائد اور نئی طرز فکر کا پھیلاؤ اس آسانی سے رک نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ محمد بن قاسم کے ہاتھوں راجا داہر کی شکست کے بعد، اس کے بیٹے جیسیا نے کشمیر میں پناہ لی تو اس کے ساتھ نیا مذہب، ایک شامی مسلمان کی صورت میں، جس کا نام حاتم بتایا جاتا ہے، کشمیر کی سرحدوں میں داخل ہو گیا۔ حاتم نے کشمیر میں اپنا حلقۂ احباب پیدا کر لیا تھا، اور اس حلقے میں اس نے اسلامی عقائد بھی پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔

راجہ ترلوچن پال پر محمود غزنوی کے حملے کے موقع پر کشمیر کا راجہ سنگرام راج کچھ تو ترلوچن پال سے دوستی کی وجہ سے، لیکن زیادہ تر اپنے بچاؤ کی خاطر راجہ ترلوچن پال کی مدد کو گیا تھا۔ ۱۰۱۵ء میں محمود نے کشمیر پر بھی حملہ کیا اور لوہر کوٹ اس کے قبضے میں آ گیا۔ اس موقع پر وہ لوہر کوٹ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پھر ۱۰۲۱ء میں اس نے نئے حملہ کی تیاری کی اور لوہر کوٹ تک آیا۔ وہ آگے

کشمیر کی طرف بڑھنا چاہتا تھا، لیکن برف باری کی وجہ سے پہاڑوں پر عبور و مرور کی دقتوں نے اسے آگے جانے سے روکا اور اس طرح کشمیر دوسری دفعہ بھی محفوظ رہ گیا۔

محمود کے بعد وسط ایشیا سے کچھ ترک سرداروں نے بارہویں صدی عیسوی میں کشمیر میں اثر و نفوذ پیدا کر لیا تھا۔ یہ ترک مسلمان تھے اور راجا بھکشاچر نے اپنے دشمن راجا سُسلا کے خلاف لوہر اپر حملے میں ان سے مدد لی تھی۔ راجا ہرش کی بت پرستی سے نفرت، اسلامی عقائد کے اثر کا نتیجہ بتائی جاتی ہے۔ اسی اثر کے ماتحت اس نے بتوں کو توڑا اور مندروں کو مسمار کیا تھا پنڈت کلہن نے ہرش کے لئے "ترسکہ" کا لفظ استعمال کیا ہے، جو مسلمان کے مترادف ہے، جنوب ہند کے علاقوں میں بھی "ترک" کے معنی مسلمان کے لئے جاتے ہیں۔ تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں مسلمان کشمیر میں خاصی تعداد میں موجود تھے۔ اس کا اندازہ ہم کو وینس کے مشہور سیاح مارکو پولو کے بیان سے ہوتا ہے۔ کشمیر سے ملحقہ علاقہ دردستان، جس سے کشمیر کا قدیم زمانے میں گہرا ربط رہا تھا، اس وقت تک اسلام کے حلقۂ اثر میں آچکا تھا، اور فارسی کا وہاں چلن ہو چکا تھا۔ دردستان سے کشمیر کے لوگوں کے تجارتی اور سماجی راہ و رسم کی وجہ سے اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ فارسی کے اثرات بھی وادی میں پہنچنے لگے تھے۔ تاریخ بیہقی کے مطابق، محمود کے دربار میں کشمیر کے ایک نائی کا لڑکا تلک ملازم تھا۔ اس نے اپنی تعلیم کشمیر میں ختم کرنے کے بعد فارسی کی تکمیل قاضی ابوالحسن شیروانی کی خدمت میں کی تھی۔ تلک کے سپرد فارسی اور ہندی ترجمانی کی خدمت تھی۔

ہندو راج کے آخری زمانے میں، راجاؤں کی کمزوری اور امیروں کی

لوٹ کھسوٹ اور کشت و خون نے اہلِ کشمیر کو بہت بددل بنا دیا تھا۔ اور انہیں ایسے سہارے کی تلاش ہو گئی تھی جو انہیں روحانی سکون کے ساتھ، سماجی امن اور مساوات بھی عطا کر سکے۔ اس صورتِ حال نے اسلامی عقیدوں کی اشاعت کے لئے کشمیر میں راہ ہموار کر دی تھی۔ اسی زمانہ میں تین نو عمر منچلے، کشمیر پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک رینچن نامی والیٔ تبت کا لڑکا تھا، جو اپنے چچا کی زیادتیوں سے تنگ آ کر کشمیر آیا تھا تاکہ راجا سہدیو کے وزیر رامچندر سے امداد طلب کرے، دوسرا شاہ طاہر بن فوا شاہ کا بیٹا شاہ میرزا اور تیسرا لنکر چک، جو چک حکمرانانِ کشمیر کا مورثِ اعلیٰ تھا، وہ مخالفوں کے خوف کی وجہ سے دروستان سے کشمیر بھاگ آیا تھا۔ کشمیر میں حالات ایسے سازگار ثابت ہوئے کہ ان تینوں کو کشمیر کی حکمرانی میں حصہ ملا۔ رینچن بدھ مت کا پیرو تھا، شاہ میرزا اور لنکر چک مسلمان تھے۔

رینچن کو حکومت کا سب سے پہلے موقع ملا، ذوالچو کی ترکتازیوں کے زمانے راجا سہدیو کے کشتوار بھاگ جانے کی وجہ سے کشمیر میں تراج پھیل گیا تھا۔ اس کا تدارک، رینچن اور شاہ میرزا نے خوش اسلوبی سے کیا۔ اقتدار میں خلا ممکن نہیں۔ سہدیو کے کشمیر سے بھاگ جانے کے بعد رینچن، رینچن شاہ کے لقب سے بادشاہ بن بیٹھا۔ رینچن نے دنیا کے سارے نو دولتیوں کی طرح، اپنے حقوقِ جہانبانی کو مستحکم بنانے کے لئے، سہدیو کے سپہ سالار رامچندر کی حسین اور عقلمند بیٹی کوٹا سے شادی کی۔ کوٹا، رینچن کو اپنی زندگی کیساتھ اپنے عقائد کا بھی شریک بنانے پر مصر تھی، لیکن پنڈتوں کے مذہب میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، اور وہ تشویش میں تھا۔

اس پس منظر میں سید شرف الدین بلبل شاہ، کشمیر کے افق پر نمودار

ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں، وہ اس سے پہلے بھی کشمیر آئے تھے۔ اس دفعہ وہ جہلم کے کنارے اس مقام پر ٹھہرے تھے، جہاں اب ان کا مزار ہے۔ دریا کے اُس پار رینچن شاہ کا محل تھا۔ صبح موذن کی آواز "اللہ اکبر اللہ اکبر" پر رینچن کی آنکھ کھلی۔ دریا کے کنارے حضرت سید شرف الدین کے ساتھ، خدائے واحد کے پرستاروں کو محو عبادت دیکھا۔ ان کے خشوع وخضوع سے وہ ایسا متاثر ہوا کہ سوچنے لگا کہ کیا یہ نیا مذہب اس کی روح کو تسکین دے سکتا ہے؟ اس کی نجات کا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے؟ وہ بلبل شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بلبل شاہ نے اس کے سارے شکوک رفع کیے، اور اس کو تسلی دی، اس طرح رینچن شاہ نے مذہب اسلام اختیار کیا۔ اس کے ساتھ اس کے بہت سے ارکان سلطنت بھی حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔

مورخین نے رینچن کے حلقہ اسلام میں داخل ہونیکی تاریخ "طلوع آفتاب دین محمدی" ۷۲۶ھ لکھی ہے، جو غالباً بعد کے کسی شاعر کی کہی ہوئی ہے تاہم اس میں شبہ نہیں کہ وسط ایشیا سے تعلق کے سبب جہاں فارسی کا رواج ہو چکا تھا، اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، اور دوسرے ایسے علاقوں سے ربط پیدا ہو جانے کے نتیجے کے طور پر، فارسی کشمیر میں اس زمانہ میں بھی اجنبی زبان نہیں تھی۔ مسلمانوں کی خاصی تعداد جو اس وقت یہاں موجود تھی، وہ فارسی سے آشنا تھے۔ کچھ فارسی علماء بھی یہاں موجود تھے، جن میں حضرت سید شرف الدین کے رفیق مولانا احمد علامہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ سلطان شہاب الدین کے زمانے تک موجود تھے اور "فتاوئ شہابی" کے مصنف ہیں۔ بڈشاہ کے دربار کے ملک الشعرا، ملا احمد کشمیری انہیں کے نواسے ہوتے ہیں۔

فارسی زبان، علم و ادب کے ایک نشوونما یافتہ ذریعہ اظہار کے روپ

ہیں ان صوفیائے کرام اور علما کے ساتھ بھی کشمیر پہنچی، جو تعلیم، تبلیغ دین اور ارشاد ہدایت کے لیے یہاں، اسی وقت سے آنے لگے تھے، جب اسلامی عقائد کا دائرہ وسط ایشیا کے ملکوں اور ترکستان تک وسیع ہوا۔ یہ انہیں بزرگوں کی تعلیم کا فیض تھا، کہ دیکھتے ہی دیکھتے فارسی ساری وادی میں پھیل گئی اور مقبولیت کے مراحل طے کرنے لگی۔ شعروادب سے آگے بڑھ کر علمی کارناموں کے لئے بھی فارسی کا وسعت سے استعمال ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ سرکاری زبان، عدالت اور مراسلات کی زبان بن گئی۔ مغلوں نے ہندوستان آنے سے پہلے، ایران سے اپنے تعلق کی وجہ سے اپنی زبان ترکی کو چھوڑ کر، فارسی زبان کو ایک علمی، ادبی اور تہذیبی رشتوں کی زبان ہونے کے سبب اختیار کر لیا تھا، اور مغلوں کے ہندوستان پر تسلط اور ان کے اثرات کی وجہ سے یہ رفتہ رفتہ سارے مشرق کی علمی، ادبی اور سیاسی مراسلت کی زبان کی اہمیت اختیار کرتی گئی۔ فارسی کو اس مقام تک پہنچانے میں کشمیر کا بھی حصہ رہا۔

کشمیر میں فارسی کو ایسی ہمہ گیری حاصل ہو چکی تھی کہ کشمیر کے پنڈتوں نے بھی اسے علمی اور ادبی زبان کے طور پر اختیار کر لیا، اور تحریر اور تقریر دونوں پر ایسا قابو حاصل کر لیا تھا کہ اس زمانے کے کسی ایرانی کو بھی، اس لحاظ سے اہل کشمیر پر تفوق نہیں رہا تھا۔ اس لئے اہل ایران کے یہاں کشمیر "ایران صغیر" کہلانے لگا تھا۔ حضرت شرف الدین کے ہم صحبت مولانا احمد علامہ جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، علوم دینیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ سلطان شہاب الدین کے عہد تک موجود تھے اور اس زمانے میں انھوں نے "فتاویٰ شہابی" مرتب کی تھی۔

کشمیر کی نئی فضا میں زندگی کے مختلف شعبوں میں فارسی کے رواج، نظم

ولسنی کی ضرورتوں کے لئے اس کے استعمال اور علوم وفنون میں اس کے چلن نے اس کو کچھ نیا آب و رنگ بھی بخشا تھا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر کچھ نئے الفاظ، کچھ نئی اصطلاحیں نمودار ہوئیں اور کچھ مروجہ الفاظ کو نئے معنی پہنائے گئے۔ یہ عمل جیسا کہ بعض مورخین نے بتایا ہے، قدیم ہندو راجاؤں کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں علمی زبان یعنی سنسکرت جو رائج تھی اس میں فارسی عربی کے الفاظ جیسے "دیو یرا" (دبیر) "گنجورا (گنجور) وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔ بعد کے لفظوں اور اصطلاحوں میں مثال کے طور پر "نہالی" کا لفظ ہے جو ابھی ابھی نشو ونما پائے ہوئے پودے کے لئے کشمیر میں مستعمل ہے۔ اس طرح یہاں اس کے عام مفہوم سے مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے اردو میں یہ لفظ "توشک" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ غالب کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی برد لیالی نے مجھے

کشمیر میں یہ اصطلاح "نہالی" کی تصغیر کے طور پر بہت خوبصورتی سے استعمال کی گئی ہے۔ "ختم بندی" عمارتوں میں چھت کے نیچے منقش لکڑی کی جو زیر چھتی لگائی جاتی ہے، اس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ختم بندی کا خوبصورت کام کشمیر کے ساتھ مخصوص ہے

مصوری کے اصطلاح میں ایک لفظ "آبینہ" ہے یہ تصویروں میں پانی کی وہ تہ یا بنیاد کے لئے استعمال ہوتا ہے جس پر بعد میں رنگ چڑھائے جاتے ہیں۔ "ارشاد" کی اصطلاح شاہی فرمان کے لئے جموں اور کشمیر میں ڈوگرا راجاؤں کے زمانے میں رائج تھی۔ "ہفردی" الوئس کے مفہوم میں

اب بھی مستعمل ہے۔ اس کے علاوہ وزیر یا وزیر اعظم کے لئے "دیوان" کی اصطلاح جو اور ریاستوں میں رائج تھی، کشمیر میں بھی رائج رہی۔ مشیر مال، وزیر مال کا عہدہ ہوتا تھا۔ "مقدم" رائج الوقت اصطلاح ہے۔ "مقیم" کا مفہوم "کارندہ" لیا جاتا ہے کشمیری خنجر کے لئے "پیش قبض" کی اصطلاح مروج رہی۔ "تکیہ" جو اپنے لغوی مفہوم کے علاوہ درویشوں کی قیام گاہ کے لئے مستعمل ہے، کشمیر میں چنڈو بازی کے پوشیدہ اڈوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ سلاطین کے زمانے میں نظم ونسق اور فوج میں بہت سی عام اصطلاحیں لے لی گئی تھیں، جن کا یہاں ذکر تحصیل حاصل ہے۔ لیکن ایک خاص اصطلاح "انجمن" فوجی مجلس مشاورت کے لئے رائج رہی۔ سکھوں کے عہد میں شالی کی صنعت پر جو محصول عائد کیا جاتا تھا اُس کے لئے "حاکمی" کی اصطلاح رائج تھی۔

کشمیری موسیقی کو بہت سی اصطلاحیں فارسی سے ملیں اور سازوں کے نام بھی سازوں کے ساتھ ایران سے آئے، لیکن کچھ نام مخصوص کشمیری سازوں کے لئے فارسی سے وضع بھی کئے گئے۔ کشمیر میں ساز، نائی (بانسری) نفیری، طوطا گری، الغوزہ، ستاری، قانون، غرض کئی اصطلاحیں رائج ہیں۔ "راست" ایک کشمیری راگ کے لئے، حبہ خاتون کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے۔

دفتری اصطلاحات میں ایک اصطلاح "کارکن" کی ان پنڈتوں کے لئے مستعمل تھی، جو فارسی لکھ پڑھ کر سرکاری ملازمتوں میں داخل ہوتے تھے۔ "بہارگلشن کشمیر" کے مرتبین کا یہ کہنا ہے کہ پنڈتوں میں فارسی کا رواج، بہت قدیم زمانے سے ہوچکا تھا اور سلطان قطب الدین کے عہد تک بہت سے پنڈت فارسی میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔

فارسی کا ایک بہت اہم رول یہ بھی رہا ہے کہ، اس نے ہندوستان کے بہت سے علاقوں کی طرح کشمیر میں بھی یہاں کی زبان کو نشو ونما دینے اور پالنے پوسنے میں بڑے سہارے کا کام کیا۔ سلاطین کے زمانے سے، جب کشمیر ایک نئے عہد میں داخل ہوا نئے خیالات اور تصورات کے لئے فارسی نے الفاظ مہیا کئے۔ اور اظہار کے سانچے فراہم کئے، فارسی لفظ کشمیری زبان میں اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ خود اس کے اپنے الفاظ بن گئے ہیں۔

کشمیر کی ادبی نشو ونما کے لئے بھی فارسی نے اصناف اور اظہار کے سانچے جیسے قصیدہ، غزل، رباعی وغیرہ کے روپ فراہم کئے۔ کشمیر کی ذہانت اور اس کے علماء اور ان کے کارناموں کو کشمیر سے باہر علمی اور ادبی دنیا سے روشناس کرانے میں بھی فارسی کے وسیلے نے بڑی خدمت انجام دی۔ اس کے ساتھ ساتھ، خود کشمیری ذہانت نے بھی فارسی کی تشکیل اور باز تشکیل اور اس کی مقبولیت اور اہمیت کو بڑھانے میں اپنا حصہ ادا کیا۔

کشمیر میں فارسی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکے گا کہ پنڈت علماء نے بہت سی مذہبی کتابوں کے علاوہ، لعتیں، منقبتیں، مناجاتیں اور دعائیں بھی فارسی میں منتقل کرلی تھیں۔ ذیل میں بہادیو شیوجی کی ایک مقبول منقبت کے چند شعر درج ہیں جو خسرو کی منقبت کی زمین میں لکھی گئی ہے اور ہر گھر میں پڑھی جاتی تھی۔

ہماں اصل جہیشر بود شب شاہی کہ من دیدم
غضنفر چرم در بر بود شب شاہی کہ من دیدم

ابا از سوئے جب بنگر چو صد خورشید تاباں تر
ہلالش تاج بر سر بود شب شاہی کہ من دیدم

بدستش آب کوثر ریزہ و ناقوس نیلوفر
سوار کلبہ بر بود شب شاہی کہ من دیدم

سہ چشمش بر جبیں از مہر و ماہ و نار روشن تر
سہ کاں دست بستہ بود شب شاہی کہ من دیدم

۳

کشمیری سلاطین

ابتدائی عہد

۱۳۳۹ء تا ۱۴۲۰ء

شاہ میرزا نے جو تاریخ میں شاہ میر یا شہمیر نام سے بھی موسوم کئے جاتے ہیں ۱۳۳۹ء میں کشمیر کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور شمس الدین کا لقب اختیار کرکے جہانبانی شروع کی۔ اس نے کوئی چار سال حکومت کی اور ملک صدر الدین رینچن شاہ کے انتقال کے بعد، ملک میں جو انتشار پھیل گیا تھا، اسے ختم کیا۔ امن و امان قائم ہونے کے بعد تہذیب اور شائستگی کے کاموں کو فروغ دینے کی طرف جب توجہ ہوئی، اسکے سامنے سب سے مقدم کام ذہنی تربیت اور تعلیم کا تھا۔ اس سلسلے میں فارسی ایک نشوونما پائے ہوئے ذریعہ اظہار کے طور پر ملک میں رائج ہوئی اور اطراف واکناف سے علماء، فضلا، زہاد اور صاحب قلم کشمیر میں بڑی تعداد میں آنے لگے۔ شمس الدین کو علم وادب کو فروغ دینے کے کم مواقع نصیب ہوئے۔ اس کا انتقال ۱۳۴۲ء میں ہو گیا۔ تاریخ

وفات "آمدہ شمس باز زیر سحاب" سے نکالی تھی۔ اس کا جانشین میرزا جمشید ہوا، جس نے کوئی چودہ مہینے حکومت کی۔ لیکن علاء الدین کی تخت نشینی (۱۳۴۳ء) کے بعد سلطنت کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہانگرد، اسی زمانے میں کشمیر آئے، اور کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد لوٹ گئے۔

سلطان شہاب الدین (۱۳۵۷ء تا ۱۳۷۶ء) کے عہد سے سلطنت کا عروج شروع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ تہذیب اور شائستگی کے کاموں کو بھی فروغ ہونے لگتا ہے۔ کشمیری کی مشہور عارفہ شاعرہ، للہ وید اور حضرت نورالدین ریشی کا بھی زمانہ تھا۔ جنھوں نے کشمیری میں عرفان اور محبت کے نغمے سنائے، اور یہ نغمے ابھی تک اہل کشمیر کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ مشہور عالم دین اور پیشوا، حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کی تشریف آوری کشمیر میں اسی زمانہ میں ہوئی تھی، آپ صرف چار مہینے یہاں قیام کرکے واپس تشریف لے گئے۔ اس چار ماہ کے دوران آپ اور آپ کے رفقائے، یہاں کے عوام کو اسلام کے عقائد اور احکام کو سکھانے کے لئے ظاہر ہے کہ فارسی ہی سے کام لیا تھا۔ سلطان شہاب الدین کے عہد میں ملا احمد علامہ نے "فتاویٰ شہابی" مرتب کی تھی۔ ملا احمد علامہ، بڈشاہ کے درباری شاعر ملا احمد کشمیری کے نانا ہوتے ہیں۔ اس کی طرف اگلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

حضرت امیر کبیر دوسری دفعہ سلطان قطب الدین کے زمانے میں کشمیر آئے۔ مورخین کا بیان ہے کہ آپ کے ہمراہ، آپ کے معتقدین اور رفقا میں کوئی سات سو افراد موجود تھے، آپ نے اس دفعہ چھ مہینے کشمیر میں قیام کیا، اور جب تشریف لے گئے تو بہت سے رفقا کو سلطان، اس کے خاندان کے افراد اور عوام کی تعلیم و تربیت کے لئے یہیں چھوڑ گئے۔ حضرت امیر کبیر خود اسلامی

تصوف کے بڑے عالم، متقی اور زاہد تھے۔ آپ نے بادشاہ کو بھی تصوف کی تعلیم دی تھی۔ آپ کے کہنے سے سلطان نے اپنے بسائے ہوئے شہر قطب الدین پورہ میں ایک مدرسۂ قرآن وسیع پیمانے پر قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ سے بعد میں ابوالمشائخ شیخ سلیمان جیسے عالم قرآن اور علم تجوید کے ماہر اٹھے۔ شیخ سلیمان کو امام القرار کا لقب ملا تھا۔ مورخین کشمیر میں سے بعض کا بیان یہ ہے کہ شیخ پہلے ہندو تھے، مذہب اسلام کو اختیار کرنے کے بعد علوم دین اور علوم قرآن کی طرف ان کی توجہ ہوئی اور ایسا بلند مقام حاصل کیا، جو کم علما کو حاصل ہو سکا ہے۔

سلطان قطب الدین کا عہد (۱۳۵۴ء تا ۱۳۷۳ء) کشمیر میں فارسی زبان، ادب اور علم وفن کے ارتقا کے آغاز کا زمانہ ہے۔ سلطان نے اپنے نام پر ایک وسیع شہر قطب الدین پورہ کے نام سے آباد کیا تھا، جو بعد میں علم وفن اور ادب وشاعری کا مرکز بنا۔ خواجہ اعظم سلطان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"با وجود شغل ملکی، میں کمالات علمی بسیار داشت"

شعر وسخن سے بھی اسے دلچسپی تھی اور قطب تخلص کرتا تھا۔ اس کی ایک غزل کے اشعار ہیں۔

ای بگرد شمع رویت عالمی پروانہ   وز لب شیریں تو شوریست در ہر خانہ

من بہ چندیں آشنائی میخورم خون جگر   آشنا را حال اینست وای بر بیگانہ

قطب کی اس غزل میں، زبان کی شستگی، بندش کی چستی اور جذبات کی ملائمت، ایک حکمراں کی فکر کے لئے قابل تحسین ہے

اپنے بسائے ہوئے شہر میں سلطان نے ایک دار العلوم بھی قائم کیا تھا، جو جلد ہی علم دین اور فارسی علم وادب کی تعلیم کا مرکز بن گیا۔ طلبا کے قیام اور

تعلیم کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا تھا۔ بعد میں ڈوگرا عہد میں سنسکرت کے لئے جو پاٹ شالہ رنبیر سنگھ نے قائم کیا تھا، وہ اسی نمونہ پر قائم ہوا تھا۔ اس وقت بھی کشمیر میں طلبا کی مفت تعلیم کی جو روایت جاری ہے وہ اس زمانے میں قائم کی ہوئی روایت کا تسلسل ہے۔ سلطان قطب الدین کا دارالعلوم سکھوں کے عہد تک قائم رہا۔ اس دارالعلوم نے فارسی ادب اور شاعری کا ذوق پیدا کرنے میں بھی بنیادی خدمت انجام دی۔ اس مدرسہ کے صدر جہانگیر کے عہد میں ملا جوہر ناتھ رہے، اور ملا محسن فانی استادِ غنی کے علاوہ ملا عبدالستار مفتی، اس مدرسے کے نامی اساتذہ میں سے ہیں۔ یہاں کے فارغ التحصیل علماء میں شیخ رحمۃ اللہ تارابلی، غنی، نافع، خواجہ قاسم ترمذی اور ملا محمد کادس کے نام نمایاں ہیں۔ ایک اور اہم ادارہ عروۃ الوثقیٰ کے نام سے موسوم تھا اسے جمال الدین محدث نے قائم کیا تھا۔ جمال الدین محدث، حضرت امیر کبیر کے ساتھ کشمیر آئے تھے۔ سلطان قطب الدین کے اصرار پر وہ کشمیر ہی میں رہ گئے۔ کوچہ اشائی میں اب تک اس مدرسہ کے کھنڈر، آثار الصنادید کی حیثیت سے باقی رہ گئے ہیں اور یہ مقام کشمیری میں بگر کمر آروتش کے نام سے مشہور ہوگیا ہے۔

حضرت امیر کبیر کی آمد کے زمانے میں بھی کشمیر میں فارسی کے اچھے شاعر موجود تھے چنانچہ سید محمد خاوری نے، جو ایک مشہور عالم اور شاعر تھے، امیر کبیر کی کشمیر میں تشریف آوری کے موقع پر قطعہ تاریخ کہا تھا۔ جو حسبِ ذیل ہے:

میر سید علی شہ ہمداں	سیر اقلیم سبعہ کرد نکو
شد مشرف ز مقدمش کشمیر	اہل آں شہر اند وہدایت جو
سال تاریخ مقدم او را	گفتم از مقدم شریف بجو

خواجہ اعظم نے لکھا ہے کہ:-

"از رفقاء سادات و خدمہ قریب ہفصد کس ہمراہ آنجناب بودند و خاص و عام این ولایت را بہ ارشاد و ہدایت رہنمائی نمودند۔"

آپ کے کشمیر سے لوٹنے کے بعد، جو بزرگ یہاں رہ گئے، ان کی تعداد کافی وسیع ہے۔ ان میں سے جو علم و فن میں سربر آوردہ حیثیت رکھتے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ پیر حاجی محمد قاری، سید جلال الدین عطائی۔ مولانا احمد سید کمال الدین، سید جمال الدین محدث، جن کا ذکر گذر چکا ہے، سید کمال الدین ثانی، سید فیروز، سید محمد کاظم، سید رکن الدین، سید فخر الدین، سید محمد قریشی، سید احمد قریشی، سید بہاء الدین، سید کبیر بیہقی اور پیر حاجی قاری۔

پیر حاجی محمد قاری، سلطان قطب الدین کے دار العلوم کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ وہ فارسی کے شاعر بھی تھے۔ ان کے کلام کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب ان کا آخری وقت تھا، سر کے شدید درد میں مبتلا تھے اور یہ اشعار ان کی زبان پر تھے۔

زین جہاں رفتیم و دل برداشتیم ۔۔۔ با جہانباں را جہاں بگذاشتیم
الغنی جستیم از دست اجل ۔۔۔ وادریغا، ما غلط پنداشتیم

سید محمد کاظم کے ذمہ حضرت امیر کبیر کے کتب خانہ کی دیکھ بھال کا کام رہا تھا۔ امیر کبیر نے علم دین کی اشاعت وعظ و نصیحت اور اسلامی عقائد کو ریاست کے طول و عرض میں پھیلانے کے مقصد سے اپنے رفقاء میں سے اکثروں کو دیہات اور گاؤں میں بھیج دیا تھا۔ چنانچہ سید محمد قریشی کشمیر آنے کے بعد بجبہارہ میں مقیم ہو گئے تھے، [illegible] ہوں نے ایک بہت بڑی مسجد تعمیر کروائی تھی۔
سید جلال الدین عطائی [illegible] ضلع شبر پرگنہ چلے گئے تھے۔ ان کی کوشش سے اسلامی

تعلیمات کے اس علاقے اور اطراف واکناف میں پھیلنے میں بڑی مدد ملی۔ خود سلطان قطب الدین اور اس کے اہل خاندان کی تعلیم و تربیت سید کمال الدین کے سپرد تھی، جو عربی اور فارسی اور دینیات کے بہت بڑے عالم تھے۔ پیر عالم حسن لکھتے ہیں کہ ان کی تعلیم کے اثر سے بیشمار لوگ قرب الٰہی اور شہود کے بلند ترین مرتبے تک پہنچ گئے۔

حضرت امیر اپنے روحانی مراتب کے علاوہ اپنے زمانے کے جید عالم بھی تھے۔ عوام کے ارشاد اور ہدایت کے لئے آپ نے کئی رسالے تصنیف کئے تھے۔ ان رسالوں میں سے کچھ عربی میں ہیں لیکن زیادہ تر فارسی میں ہیں۔ عربی کے رسائل حسب ذیل ہیں۔

رسالہ معرفت زہد۔ رسالہ اورادیہ۔ چہل حدیث۔ رسالہ ذکریہ
رسالہ قدوسیہ۔ رسالہ اربعینیہ۔ رسالہ خواطریہ۔ رسالہ احادیث

یہ سارے رسالے سرینگر کے محکمہ ریسرچ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔
ان کے علاوہ فارسی میں حسب ذیل رسالے آپ کی تصنیف ہیں۔

رسالہ منہاج العارفین۔ رسالہ مکتوبات۔ رسالہ حل مشکلات۔
رسالہ ذکریہ۔ رسالہ فقریہ۔ رسالہ اخلاقیہ۔ رسالہ کشف الحقائق
رسالہ اصطلاحات نور الدین جعفر۔ رسالہ مراۃ التائبین۔ رسالہ مشبہ وغیرہ۔ رسالہ فتوتیہ۔ رسالہ نفسیہ۔ رسالہ مناجات۔

ریسرچ لائبریری کے مخطوطے میں عربی اور فارسی کے مذکورہ بالا رسائل ایک جگہ مجلد ہیں۔ آخری رسالہ "مراۃ التائبین" نامکمل ہے۔ رسالے خوشخط لکھے ہوئے ہیں، لیکن ان میں ترقیمہ نہیں ہے، جس کی وجہ سے سنہ اور کاتب کا نام اور مقام کا پتہ نہیں چل سکتا۔

دوسرے ماخذوں سے آپ کی حسب ذیل مزید تصانیف کے نام بھی ملتے ہیں۔

مجموعہ احادیث۔ شرح اسمای حسنیٰ۔ ذخیرۃ الملوک۔ شرح فصوص الحکم شرح قصیدہ لامیہ ابن فارض۔ آداب المریدین۔ اوراد فتحیہ۔ رسالہ عقلیہ۔ رسالہ وجودیہ۔ رسالہ درویشیہ۔ رسالہ ہمدانیہ۔ رسالہ مشارب الاذواق۔ رسالہ سیر الطالبین۔ رسالہ مکتوبات۔ رسالہ اعتقادیہ۔ رسالہ نوریہ۔ رسالہ صفریہ۔ رسالہ معرفت زاہد۔ واردات امیریہ۔ چہل اسرار۔

حضرت امیر کے سارے رسائل، بلند متصوفانہ اور معرفت کے مطالب سے پُر ہیں۔ "رسالہ مشیہ ونگیر" میں خطرات نفس اور ہوا و ہوس کے خدشات سے متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ایعزیز، روندگان ایں راہ و محرمان ایں درگاہ عاشقان جانباز والہانہ تن گذارند کہ گاو ہوا را بہ تیغ ناکامی قربان کردند، و منازل تعلقات را بہ اقدام قل اللہ ثم ذرہم قطع کردند و از غزوات ذیل عدو کہ بَعُدھم ویمنیھم عبارت ازاں است تبرا نمودند و از رعونت گفتگوی از او ہی ہمیت بخشونت بیت الاخراں دنیا قائم نفس برداشتند وجمیع تمتعات دنیا ونیل درجات عقبیٰ را نابود انگاشتند و در بادیہ طلب تحمل مکارہ ومحن آفات و تجرع کاس بلیات را شعار خود ساختند۔"

مکتوبات کا اسلوب نسبتاً سہل ہے جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے اندازہ ہوگا۔

"در خبر است کہ جمعی از اکابر صحابہ از حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم درخواست کردند کہ بمیں ہمت مثنوی، ایشانرا در منازل

درجات علا و مناظر فردوس اعلےٰ ترین خود گرداند۔ خواجہ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمود کہ اعینونی بکثرت السجود یعنی انوار فرہمایوں ہمای ہمت احمدی و آثار ارشاد محمدی را خاصیتی است کہ مس کفر و معصیت مداد ذہب ایمان میگرداند اما تا رابطہ جہد و کوشش مسترشد و شفقت و نصیحت مرشد از طرفین محکم نگردد حصول این کمال صورت نہ بندد۔"

رسالہ مناجات، حضرت ایوب انصاری کی مشہور مناجات کا انداز رکھتا ہے۔ اس رسالہ کا بھی ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"ای ملکا، پادشاہا، قبلہ روئے دل مارا بہ تشریف رب اشرح لی صدری در اشعہ آفتاب کبریا منور دار و بلبل زبان حال مارا باستمداد و عنایت حضرت صمدیت ناطق و نغمہ گرداں، و لیسند صبح دولت وصال از مشرق عنایت طلوع کن و بجناح تنزیہہ در فضای بید ای عالم تقدیس طیران بخش و جراحت بردل ریشی بمرہم شفای رحمت توانائی دہ۔"

بعض رسالوں میں نظم کے ذریعہ مطالب کی وضاحت کی گئی ہے۔ "رسالہ فتوتیہ" میں اس طرح کی ایک نظم سے اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ای چو الف عاشق بالای خویش
انس تو با وحشت و سودای خویش

فارغ ازیں مرکز خورشید گرد
غافل ازیں دائرہ لاجورد

بر سر کار آی چرا خفتہ
کار چناں کن کہ پذیرفتہ

مست چہ خفتی کہ کمیں کردہ اند
کار شناساں نچنیں کردہ اند

بار عناں کش بہ شب خیر گول
ہرچہ عنا بیش، عنایت فزول

زاہل وفا ہر کہ بجای رسید　　بیشتر از راہ عنای رسید

جو علما حضرت امیر کبیر کے ساتھ کشمیر آئے تھے، ان کے مختلف مقامات میں تشریف لے جانے کی وجہ سے علم دین کے ساتھ ساتھ فارسی زبان اور ادب کی اشاعت بھی ہوتی گئی۔ امیر کبیر کی وفات ۷۸۶ھ (م ۸۵-۱۳۸۴ء) میں ہوئی اور ختلان میں مدفون ہوئے۔ وفات کے موقع پر کئی مرثیے اور تاریخی قطعے لکھے گئے تھے۔ ان میں سے شیخ محمد ہرای کے قطعے کا تذکرہ خواجہ اعظم دیدہ مری نے اس انداز سے کیا ہے کہ پتہ چلتا ہے وہ کشمیر میں تھے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"شیخ محمد ہرای، کہ از صلحا و بلغای وقت بود، چنیں گفت۔ قطعہ تاریخ۔

مفخر عارفاں شہ ہمداں　　کز دمش باغ معرفت بشگفت
مظہر روی حق کہ رویش را　　عاقبت از جہانیاں بنہفت
عقل تاریخ سال رحلت او　　سید ما علی ثانی گفت

خواجہ اعظم نے حضرت امیر کبیر کا ذکر کرتے ہوئے، اس عہد کے ایک مورخ قاضی ابراہیم کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"قاضی ابراہیم ولد حمید الدین کہ قریب بآں عہد بود در تاریخ خود ایں معنی را نوشتہ"

قاضی ابراہیم کا ذکر خواجہ نے اپنی تاریخ میں مزید ایک دو جگہ اور بھی کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تاریخ فارسی میں کشمیر کی قدیم تاریخ ہے ڈاکٹر صوفی کا قیاس یہ ہے کہ طبیب شہاب الدین ابن عبد الکریم کی ——
"شفاء الامراض" کا تعلق بھی سلطان قطب الدین کے عہد سے تھا۔ یہ ۱۳۸۸ء (م ۹۰ ۸ ھ) کی تصنیف ہے۔ اس کے ترقیمے کے شعر حسب ذیل ہیں۔

بفضلِ خداوند و سعی شہاب | مرتب شد او این ہذا الکتاب
زہفت صد زیادہ نوہ سال بود | دہم روز از ماہ شوال بود

سلطان سکندر، کشمیری خاندان کا بڑا عالی ہمت اور جری حکمراں تھا۔ اس نے باغی امرا کی قرار واقعی سرکوبی کی اور انہیں مطیع کرکے، ملک میں امن و امان قائم کیا۔ اس کی تخت نشینی کی تاریخ کسی شاعر نے کہی تھی۔

شاہ عادل سکندر ثانی | کہ از و یافت سر فرازی تاج
ملک روشن بنور شرع از وست | گرچہ بودہ زکفر چوں شب داج
بہر تاریخ سال سلطنتش | عقل گفتا بشرع دادہ رواج

سلطان سکندر اس کی شوکت اور عظمت کے بارے میں پیر غلام حسن نے لکھا ہے:۔

"او از جمیع سلاطین کشمیر بشوکت و عظمت و کثرت لشکر ممتاز بود و مہابت بسیار داشت۔"

اس نے علماء، شعرا اور پیشوایانِ دین کی قدردانی کی اور ان کا احترام ملحوظ رکھا۔ اسی لئے جیسا کہ خواجہ اعظم نے لکھا ہے:۔

"علماء و فضلا، و سادات بسیار در عہد او بکشمیر آمدہ۔"

جن علماء کی اس نے سرپرستی کی ان کی تفصیل طویل ہے۔ سلطان نے ان میں سے ہر ایک کے علم و فضل کے شایانِ شان خدمت بھی تفویض کی تھی۔ سلطان سکندر نے جامع مسجد کے قریب ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جو مدرسہ جامع مسجد کے نام سے موسوم تھا۔ مدرسہ میں قرآن اور علوم دینیہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مدرسہ کی صدارت سلطان نے میر محمد علی بخاری کے لئے تفویض کی تھی جو چنگیز خاں کی اولاد میں تھے۔ اور ملّا محمد یوسف کشمیری ہمدانی مدرسہ میں

فلسفہ کا درس دیتے تھے۔ ریاضی کی تعلیم ملا صدر الدین کاشی کے سپرد تھی اور مولانا سید حسین منطقی منطق اور ماوراطبیعات پڑھاتے۔ اور ملا محمد افضل بخاری معلم حدیث تھے۔ ملا محمد یوسف انشاپرداز اور شاعر بھی تھے، لیکن ان کی انشا اور کلام کے نمونے اب دستیاب نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر صوفی نے لکھا ہے کہ محمد صادق کشمیری جو "طبقات شاہ جہانی" کے مصنف تھے، ان کے بھائی ہوتے ہیں۔ ملا یوسف کے بارے میں صوفی کہتے ہیں کہ وہ اہل قلم اور اہل سیف دونوں تھے لیکن یہ درست نہیں۔ اس سلطان کے دورِ حکومت میں بلخ کے ایک امیر، حاجی ابراہیم ادھم کشمیر آئے اور علم و حکمت کی اشاعت میں مصروف رہے۔ علوم ظاہری اور باطنی میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ تارک الدنیا تھے اور سارا وقت عبادت اور یاد الٰہی میں صرف کرتے تھے۔ وہ اہلِ قلم بھی تھے اور ان کی تصنیف جو اولیا اللہ کے حالات پر مشتمل تھی، "مقامات" کے نام سے موسوم ہے۔ ان کا انتقال ۱۴۳۲ء (م ۸۳۶ھ) میں ہوا اور شاعر واری میں مدفون ہوئے۔

سکندر کے عہد کے دو اہم واقعات کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جن کا اثر کشمیر میں فارسی کی ترقی اور اشاعت پر مستحسن ثابت ہوا۔ ان میں سے ایک حضرت امیر کبیر کے فرزند سید میر محمد ہمدانی کی کشمیر میں آمد ہے۔ آپ ۱۳۸۹ء (م ۷۹۶ھ) میں کشمیر تشریف لائے اور آپ کے ہمراہ سادات، علماء اور صوفیا کی خاصی تعداد کشمیر آئی، جن میں کئی اچھے اور صاحب ذوق ادیب یا مصنف بھی تھے۔ خواجہ اعظم نے آپ کے ہمراہ آنے والوں کی تعداد چھ سو بتائی ہے، لیکن پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ آپ کے ساتھ تین سو فضلا آئے۔ سکندر کا وزیر سہہ بٹ، حضرت سید ہمدانی کے ہاتھ پر ایمان لایا اور ملک سیف الدین کے نام سے موسوم ہوا۔ ملک سیف الدین جیسا کہ نئے عقیدے والوں کا جوش مشہور ہے، اتنا سچا ایمان دار ثابت

ہوا کہ وہ کسی بے ایمان کو جیتا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، اسی جوش میں اس نے بہت سے غیر مسلموں کو رنج پہنچایا، اور سلطان سکندر نے اسے منع نہیں کیا یہ واقعہ سکندر کی بدنامی کا سبب بن گیا۔

حضرت سید میر نے سلطان سکندر کو تصوف کی تعلیم دی تھی اور اس کے استفادہ کے لئے ایک رسالہ تصوف بھی فارسی میں تصنیف کیا تھا۔ خواجہ اعظم نے آپ کی ایک شرح منطق کا تذکرہ بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"چوں در مجلس سلطان سید محمد حصاری، در بحث علمی معارضہ بحضرت سید کردند شب بعنایت امیر کبیر قدرت یافتہ شرح شمسیہ منطق را بنام سلطان تصنیف فرمودند"

حضرت سید محمد، باقی ساری عمر کشمیر ہی میں رہے اور آپ کے رفقا نے دینی تعلیم کو پھیلانے کی خدمت انجام دی اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی کی اشاعت بھی ہوتی گئی۔

دوسرا اہم واقعہ امیر تیمور کا خروج ہے۔ جب وہ ساحل چناب کے قریب آیا تو اس نے سکندر کے نام فرمان بھیجا تھا۔ سکندر اس سے ملنے کے لئے چلا اور بارہ مولہ پہنچا تھا کہ خبر ملی امیر تیمور سمرقند چلے گئے ہیں۔ اس لئے وہ دارالسلطنت لوٹ آیا۔ اور اپنے بیٹے شاہی خاں کو سفارت کے ساتھ سمرقند روانہ کیا۔ شاہی خاں، جو بعد میں سلطان زین العابدین کے لقب سے موسوم ہوا اور عوام میں بڈشاہ کے محبوب نام سے یاد کیا جاتا ہے، سات سال سمرقند میں مقیم رہا اور تیمور کے انتقال کے بعد وطن لوٹا۔

شاہی خاں کو اس طویل سفر اور سمرقند میں قیام سے بہت سے فائدے ہوئے۔ سمرقند اس زمانے میں ایک غیر مہذب حکمراں کے ماتحت ایک مہذب

دنیا کا صدر مقام بن گیا تھا۔ ایران کی دولت کے علاوہ اس کے علم و فن اور شعر و ادب اور صنعت و حرفت کی ثروت بھی کھنچ کر آ گئی تھی۔ شاہی خاں نے اپنے طویل قیام میں ان ساری تفصیلات سے واقفیت حاصل کی جو اس کے ذہن میں خوابوں کی طرح مرتسم رہی اور جب خود وہ پادشاہ بنا تو اس نے اپنے بہت سے خوابوں کی تکمیل کی کوشش کی۔ انہیں میں سے ایک فارسی زبان اور ادب کا فروغ بھی تھا۔

سکندر جن علما کا احترام کرتا تھا، ان میں سید تاج الدین بیہقی کے بیٹے، سید محمد بیہقی بھی تھے۔ وہ سید حسین منطقی کے چچا ہوتے ہیں۔ یہ سلطان سکندر ہی کے زمانے میں کشمیر آئے تھے اور کاندہ ہامہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ سکندر نے اپنے بیٹے حاجی خاں، (زین العابدین) کی شادی ان کی صاحب زادی سے کی تھی۔ سید محمد اونچے پایہ کے شاعر تھے اور زیادہ تر صوفیانہ انداز میں شعر کہتے تھے۔ ان کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔ پیر غلام حسن کا بیان ہے کہ ان کا دیوان چالیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔

سکندر کے انتقال کے وقت سلطنت میں شعرا اور علما کی کثرت کا اندازہ خواجہ اعظم کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

"اہل شہر ماتم گرفتند و فصحا و صلحا مرثیات و تواریخ داد دعاگوی دادند"

ان مرثیوں میں مولانا احمد کے مرثیہ کے کچھ شعر خواجہ اعظم نے نقل کئے ہیں۔

کجا است شاہ سکندر کجا است میدانش ۔۔۔ در انتظار رہا کند گوی و چوگانش
عجب کہ دیدہ شود گل شگفتہ در گلزار ۔۔۔ عجب کبک خرامد بناز در کہسار
عجب کہ باغ بخندد چو مردم غافل ۔۔۔ عجب کہ باغ نگرید بسان ابر بہار

بہ آب دیدہ بشوید، ای مسلمانان | زمین روضہ شہ را برای استظہار
دریں مقام بخواہید ہرچہ می خواہید | بہ اعتقاد درست و درون بی انکار
خداشناس و پیمبر صفت سکندر شاہ | کہ آفرین خدا بر روانش باد ہزار

ایک اور مرثیہ کے بھی خواجہ اعظم نے اشعار نقل کئے ہیں۔

زہجر شاہ دل ہر کہ ہست پرخون است | جگر زسوز کباب است دیدہ جیحون است
خدای داند و شاہ جہاں و روح شریف | کہ حالت دل درویش بینوا چون است
کسیکہ از غم و اندوہ شاہ غمگیں نیست | بنزد عقل من آں بے ثبات مجنون است

علی شاہ سکندر کے بعد تخت نشین ہوا، اس کی سادہ دلی نے حکومت کا بوجھ برداشت کرنا اپنے لئے دوبھر جانا، اس لئے اس نے حج کو جانے کی ٹھانی اور اسی ارادہ سے جموں روانہ ہوا۔ جموں کے راجہ کی بیٹی اس کے عقد میں تھی۔ راجا نے اسے اس خیال سے منع کیا، اور واپس کشمیر بھجوا دیا، لیکن اس کے غیاب میں، حالات پلٹا کھا چکے تھے۔ جس کی کچھ تفصیل تاریخی حالات میں دی جا چکی ہے۔ مورخین کے بیان سے ہم کو اطلاع ملتی ہے کہ، مولانا قادری، جو بعد میں بڈشاہ کے دربار کے رکن رکین رہے، ایک تاریخ کے مصنف تھے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں۔

"مولانا قادری کشمیری کہ بعد مولانا احمد کشمیری افصح شعرا بود، در تاریخ خود نوشتہ ......"

لیکن اب اس تاریخ کا نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

RekhtaDownload.com

۳

سلطان زین العابدین تا حبیب شاہ

۱۴۲۰ء تا ۱۵۵۴ء
۸۲۷ھ تا ۹۶۲ھ

سلطان زین العابدین، بڈشاہ، کشمیری خاندان کا سب سے زیادہ اولوالعزم، بیدار مغز اور نامور بادشاہ ہوا ہے۔ یہ اپنی وسیع مشربی، رواداری اور علم وادب سے دل چسپی میں اکبر اور محمد قلی قطب شاہ کا پیش رو تھا۔ بڈشاہ میں وسیع نظری و رواداری کے ساتھ سپاہیانہ زندگی اور علم وفن کی قدر دانی کے سارے عمدہ اوصاف مجتمع ہو گئے تھے۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں اشارہ کیا گیا۔ امیر تیمور کے دربار میں طویل قیام کی وجہ سے، اُسے نہ صرف صنعت وحرفت کی ترقی اور نظم ونسق کی عمدگی کا شعور پیدا ہو چکا تھا، بلکہ فارسی عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی صحبتوں میں بھی اُٹھنے بیٹھنے کے مواقع نصیب ہو چکے تھے۔ جس کے سبب اس کا مذاق نہایت شستہ ہو گیا تھا۔ اس لئے جب اس نے خود عنان حکومت سنبھالی تو نظم ونسق کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ اپنی ریاست کی مادی اور ذہنی ترقی کی

طرف بھی اس نے پوری توجہ دی۔ جہاں تک فارسی ادب اور شاعری کی ترقی کا تعلق ہے، بڈشاہ کا دور، سنہری دور کہلانے کا مستحق ہے۔

سلطان زین العابدین کی تعلیم اچھے پیمانہ پر ہوئی تھی، اور مورخین کے بیان کے مطابق، وہ فارسی، کشمیری اور ہندی، تین زبانیں جانتا تھا، اور ان میں بے تکلف گفتگو کر سکتا تھا۔ سلطان کے استاد مولوی کبیر بڑے جید عالم تھے۔ کم سنی کے زمانے سے ہرات میں رہ کر انھوں نے تعلیم کی تکمیل کی تھی۔ بڈشاہ نے انہیں ہرات سے بلوا کر شیخ الاسلام کی خدمت سپرد کی تھی۔ بڈشاہ کو تعمیر کاری کا بھی شوق تھا، چنانچہ اس کے بنوائے ہوئے پل زینہ کدل کے علاوہ اس نے اولر جھیل میں ایک پُر فضا عمارت بنوائی تھی، جہاں بیٹھ کر وہ منظر کا لطف اُٹھایا کرتا تھا۔ یہ عمارت زینہ ڈب کے نام سے موسوم تھی۔

اس عمارت کی تعمیر پر شعرا نے قصائد لکھے اور تاریخیں کہی تھیں، ان میں سے ایک تاریخ حسب ذیل ہے۔

این بقعہ چو بنیاد فلک محکم باد | مشہور بزین ڈب در عالم باد
شہ زین عباد تا در وجشن کند | پیوستہ چو تاریخ خودش خرم باد

(۸۴۷ھ)

ان عمارتوں کے علاوہ اس زینہ گیر کا مراج میں، زینہ پور مراج میں زینہ کوٹ پرگنہ سایر میں اور ایک محل زینہ ڈب نوشہرہ میں بنوا کر شہر کو زینت بخشی تھی۔

زینہ ڈب بڑی خوبصورت عمارت تھی، جو سلطان کے آباد کیے ہوئے نئے شہر، نوشہرہ میں بنوائی گئی تھی۔ نوشہرہ اور زینہ ڈب کی تفصیل پیر غلام حسن نے حسب ذیل لکھی ہے۔

"محلہ نوشہرہ بکثرت عمارات و اسواق و دکاکین از خود احداث نمود و در آنجا طرح دولت خانہ انداختہ پائے تخت خود مقرر ساخت و برائے نشست گاہ خود دارالامنظری دوازدہ طبقہ بلند افراشت کہ در ضمن ہر طبقہ پنجاہ حجرہ بود و درمیان ہر یک حجرہ پانصد مردم جلوس می کردند و از اطاق و رواق و ایوان غرفہا اعجوبہ صنعت روزگار بود و نام آں زینہ ڈب می گفتند۔"

کشمیر میں فارسی ادب، شاعری اور علوم و فنون کی ترقی کے اعتبار سے بھی بڈشاہ کا عہد ممتاز ہے، سلطان کے دربار میں اس عہد کے سربرآوردہ، علماء، شعرا اور ادیب جمع تھے، کشمیر کے علاوہ ایران اور ترکستان سے بھی علماء آئے تھے۔ جتنے ادیب اور عالم اس کے دربار میں جمع تھے، ان کی فہرست طویل ہے۔ ان میں سے چند سربرآوردہ حسب ذیل ہیں۔

ملا احمد کشمیری، مولوی کبیر، ملا پارسا، مولانا قادری، ملا ضیائی ملا ندیمی، ملا فصیحی، ملا جمیل، ملا احمد رومی، ملا محمد رومی، ملا نورالدین، ملا علی شیرازی۔ مولانا حسین غزنوی، مولانا سید محمد منطقی، ملا حافظ بغدادی، مولانا جمال الدین، قاضی میر علی سید ناصرالدین بیہقی۔

مولوی کبیر، ملا پارسا، مولانا قادری، ملا جمال الدین، ملا ضیائی، مولانا سید محمد منطقی، قاضی جمال الدین، ملا حافظ بغدادی اور قاضی میر علی علماء اور مشائخین میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ سلطان زین العابدین نے قاضی جمال الدین کو قاضی مقرر کیا تھا۔ ملا حافظ بغدادی کو سلطان نے دربار کا رکن بنا لیا تھا۔ اور ان کا بیشتر وقت درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا۔ صوفیوں میں حضرت نورالدین

ریشی، حضرت بہاء الدین گنج بخش اور سید ناصر الدین بیہقی سر برآوردہ تھے۔ حضرت نورالدین ریشی صوفیوں کے "ریشیہ" سلسلے کے بانی مبانی تھے۔ آپ کا مقصد گوشہ نشینی، عبادت اور رشد و ہدایت کے ذریعہ خدمت خلق تھا۔ کشمیری صوفیوں کے اس سلسلے کے اعمال اور اوراد کی زیرین تہ میں، بدھ مت کے زہد و تقویٰ کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان صوفی بزرگوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جنھوں نے ہندوستان کے صوفی اور بھگت شعرا، کبیر، گرونانک، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت شیخ نظام الدین اولیا، کی طرح، مذاہب کی بنیادی سچائی، تقویٰ اور انسانی عظمت پر زور دے کر، ایسے ذہن کو نشوونما دینے کی کوشش کی تھی جو بند نہ ہو، بلکہ ہر اچھی بات کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہو۔

مولانا کبیر کے علم و فضل اور فیض کو عام کرنے کے مقصد سے سلطان نے نوشہرہ میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی تھی، جو فارسی اور عربی علوم کی اشاعت کا بڑا مرکز بن گیا۔ مولوی کبیر مدرسے کے صدر تھے۔ وہ نحو کے جید عالم مانے جاتے تھے۔ انھوں نے "شرح ملّا" کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ مدرسہ کے دوسرے اساتذہ میں ملا پارسا، اسم با مسمیٰ تھے۔ وہ بڑے عالم اور متقی انسان تھے، اور اپنا سارا وقت خانقاہ امیریہ میں گوشہ نشینی اور اوراد و وظائف میں گزارتے تھے۔ سید حسن منطقی کے بارے میں محمد اعظم کا بیان ہے کہ "مظہر فیوض الٰہی، و مصدر کمالات نا متناہی بود.. .. .. در عہد او کسی بر او فوقیت نداشت"۔ ان کا قیام موضع او نتی پور یا ونتی پور میں تھا۔ حضرت شیخ بہاء الدین گنج بخش کشمیری، حضرت امیر امیر کبیر کے خلفا میں سے تھے، اور اپنی ریاضت اور روحانی مراتب میں ممتاز تھے۔ آپ کا انتقال ۸۵۷ھ میں ہوا۔ حضرت شیخ نورالدین آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ حضرت سید حسین بھی اپنے زہد و تقویٰ کی بدولت

شہرت رکھتے تھے۔ حضرت شیخ حمزہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بارہ سال تک مسلسل آپ کے روضہ کی زیارت سے مستفید ہوتے رہے۔ آپ کے خلفا نے، آپ کے حالات اور فیوضیات کے بارے میں بہت سی تصانیف کی ہیں۔ حضرت سید نورالدین زینہ کدلی، بھی بڑے بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ کے مزار پر ایک رباعی کندہ ہے، جس کے خط کے نحواے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے ارادت مندوں میں سے کسی نے یہ رباعی کہہ کر، قبر پر کندہ کرادی ہے۔ رباعی یہ ہے۔

بہا ہیست کہ عقل آفریں می زندش | صد بوسہ زشوق بر جبیں می زندش
آں کوزہ گر دہر چنیں جام لطیف | می سازد و باز بر زمیں می زندش

حضرت سید محمد ابن منطقی بیہقی، سید حسین بیہقی کے فرزند بھی رشد و ہدایت کا مرکز تھے۔ وہ بابا میر اویسی کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے معتقدین میں سے اکثروں نے نظم و نثر میں ان کی مدح سرائی کی تھی، خواجہ اعظم دیدہ مری نے ایک نظم اپنی تاریخ میں نقل کی ہے، جس کے کچھ شعر ہیں۔

مدح بابا ی میر اویس کنم | تا زباں راست در دہاں دارم
ہست فرزند پیشوای رسل | وصف او بے حد و بیاں دارم
فاضل و شت بود و عارف دہر | ایں سخن ہم زتر جماں دارم

بابا میر اویس خود بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا ایک عارفانہ شعر ذیل میں منقول ہے۔

گناہ ما زعدم گر نیامدی بد وجود | وجو د عفو تو در عالم عدم می بود

سلطان زین العابدین نے ان کے نیک اطوار اور صفات محمودہ کا اندازہ کرتے ہوئے ان کے والد کی اجازت سے انہیں فرزند بنا لیا تھا، اور چاہتا تھا کہ ان کی تربیت کر کے، انہیں نظم و نسق کے کام میں لگائے۔ لیکن بابا میر اویسی نے اسے پسند نہیں کیا اور کوہ ماراں کے پہلو میں ایک باغ بنوا کر، اس میں گوشہ نشینی اختیار

کی اور یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ انہیں شعر و سخن سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کے ایک ترجیع بند کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

راہ صدق و صفا گرفتم پیش — میل مہر و وفا نمودم باز
از مخالف ہمی کنم آہنگ — تا رسم با نواز راہ حجاز
ہمچو شمعی ز جمع دلداراں — میر دم با ہزار سوز و گداز
مرکبم ہمت است و عقل دلیل — ہمرہم آہ و نالہ ام دمساز
بار ہجراں و کار درد و فراق — چوں کہ گردید با من ایں آغاز

حالیا چوں طریق در پیش است
گوئیا می کنم ہمی آواز

بابا میر اویسی کے بہت سے کرامات عوام میں مشہور ہیں۔ آپ کے چچا سید حسین بیہقی، سلطان زین العابدین کے وزیر تھے۔ کچھ امراان کے مخالف ہوگئے تھے، اور انہیں اشرار کے ہاتھوں قتل کرا دیا۔ کچھ لوگ بابا میر اویسی کی عبادت گاہ میں بھی گھس آئے اور آپ کو زخمی کیا۔ اسی حالت میں آپ نے یہ قطعات کہے تھے

منم آں رند جہاں گرد مسیحا نفسی — کہ من ایں ہر دو جہاں را نشمارم بہ خسی
اگر ز عشق تو ام سر برود گو برود — ہرگز ایں سرِ نہاں تو نگویم بہ کسی

اپنی بے گناہی کی طرف ذیل کے اشعار میں اشارہ کیا ہے۔

من خار غم ز مصلحت اہل روزگار — می داں یقین کہ کشتن من ہست بیگناہ
اکنوں بیا و شعر بخواں بر مزار من — تا روی ظالمان ستمگر شود سیاہ

آپ کا انتقال ۸۸۹ھ میں ہوا۔ اعظم دیدہ مری نے بھی جو آپ کے مزار کے قریب رہا کرتے تھے، بعد میں جب کسی اور مقام پر منتقل ہونے لگے، تو

آپ کی منقبت میں ایک نظم لکھی تھی، جو ان کی تاریخ میں شامل ہے۔

اسی زمانے میں سید محمد قادری بھی ہوئے ہیں، جن کی دو تصانیف "شرح لمعات" اور "خاور نامہ" کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن کلام کا نمونہ اب دستیاب نہیں ہوتا۔ حضرت میر سید محمد ہمدانی سے تعلق رکھنے والے علماء میں سے ایک عالم سید محمد سامانی تھے، جن کی کتاب "تنویر السراج" کا تذکرہ مورخین نے کیا ہے۔ یہ سراج کی تشریح ہے۔ لیکن ان ہمارے علماء میں جو روحانی فضیلت بابا میر اویسی کو حاصل ہے، وہ دوسرے علماء کو کم نصیب ہوئی۔ علم و فضل کے علاوہ روحانی بزرگی ان کی نمایاں خصوصیت تھی۔ انچہ والد سید حسین منطقی بھی صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، ہمدانی سید حسن منطقی کا احترام بدشاہ کو بہت ملحوظ تھا۔ بابا اویسی بھی صاحب دل اور صاحب فکر صوفی ہونے کے باوجود اپنے اطراف کی دنیا سے بے خبر نہیں تھے۔ اس کا اندازہ ان کی ایک نظم کے اقتباس سے ہوتا ہے، جس میں اپنے زمانے کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

آزمودم جہان و اہل جہاں — انچہ ہستند آشکار و نہاں
ہمہ دربند خویشتن مشغول — ہمہ در کار خویشتن حیراں
نے ترحم بحال غمزدہ — نے تکلم بلطف و با احساں
جملہ در قصہ خواں یکدگر اند — اوفتادہ چو موش در انباں
کار شاں نے بغیر کذائی — یار شاں نے بہ خلق جز بہتاں
کس نگوید کہ این خران تا کی — جاں دہند از برائے یک لب ناں

نوشہرہ کے دار العلوم کے اساتذہ میں مولوی کبیر کے علاوہ، جن کا ذکر گزر چکا ہے، کئی ایسے علماء شامل تھے، جن کا مقام بہت بلند ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔ ملا احمد کشمیری، ملا حافظ بغدادی، ملا پارسا بخاری، ملا

جلال الدین خوارزمی، میر علی بخاری، اور ملا یوسف راشدی۔ علوم و فنون کی اشاعت کا سلطان کو جو بے پایاں شوق تھا، اس کی پیش رفت میں، اس نے ایران اور ترکستان سے نہ صرف علمار کو طلب کر کے، اپنے دربار میں احترام کی جگہ دی تھی، بلکہ بہت سی کتابوں کے قلمی نسخے بھی طلب کئے تھے، جن کے لئے ایک وسیع کتب خانہ بھی بنوایا تھا۔ یہ کتب خانہ سلطان فتح شاہ کے زمانے تک موجود تھا۔ پیر غلام حسن کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان نے نوشہرہ کے دارالعلوم کے علاوہ کئی اور مدرسے قائم کئے تھے۔

سلطان کا ایک اہم کارنامہ، ایک دارلترجمہ کا قیام تھا، جس کے بارے میں ڈاکٹر غلام محی الدین نے اپنی تاریخ "کشمیر" میں لکھا ہے کہ یہ مفید ادارہ دارالعلوم نوشہرہ سے متعلق تھا۔ اس دارالترجمہ میں ملا احمد کشمیری اور دارالعلوم کے اساتذہ میں بہت سے علمار تراجم کی خدمت انجام دیتے تھے۔ سلطان کے دربار اور نظم ونسق کی زبان فارسی تھی، اور دارالعلوم میں ذریعہ تعلیم بھی فارسی ہی تھا۔ اس تعلق سے عربی کی کتابوں کے علاوہ سنسکرت کی اہم کتابوں سے ترجمے فارسی میں کیے گئے تھے۔ علوم و فنون کے درمیان سے زبانوں کے حدود کو ڈھانے کی سلطان کی یہ بڑی مستحسن کوشش تھی۔ سنسکرت سے ترجموں کے لئے سریورا سوم پنڈت اور بودھی بھٹ کی خدمات بھی دارالترجمہ کو حاصل رہیں۔ ان پنڈتوں کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ وہ فارسی اور عربی سے بخوبی واقف تھے۔ ملا احمد کشمیری نے انہیں کی مدد سے "مہا بھارت" اور پنڈت کلہن کی شہرۂ آفاق تاریخ "راج ترنگینی" کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ ویدوں اور شاستروں کے بھی فارسی میں ترجمے ہوئے تھے۔ پیر غلام حسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ دارالترجمہ میں فارسی اور عربی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت میں بھی کیا جاتا تھا۔ مشہور مجمع الحکایات،

"کتھا سرت ساگر" کا ترجمہ بھی ملا احمد نے "بحر الاسمار" کے نام سے فارسی میں کیا تھا۔ پیر غلام حسن نے ان کی کئی اور تصانیف بتائی ہیں۔

دار الترجمہ کا یہ وہی نقش اول ہے، جو لبعد میں ہم کو رنبیر سنگھ کے قائم کئے ہوئے دار الترجمہ میں بھی ملتا ہے۔ رنبیر سنگھ کے قائم کئے ہوئے دار الترجمہ میں بعض کتابوں کے ترجمے ایک سے زیادہ زبانوں میں کئے جاتے تھے، اور یہ دار الترجمہ رنبیر سنگھ کے بنا کئے ہوئے سنسکرت پاٹ شالہ سے ملحق تھا، جو جموں کے رگھوناتھ مندر کے احاطے میں واقع تھا۔ اس سے ملحق سنسکرت کا وسیع کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا، جس کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے اور جس کے مخطوطات سے شٹائین اور بعض دوسرے مستشرقین نے استفادہ کیا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر ڈوگرہ عہد میں آرہا ہے۔

طب کی تعلیم کے لئے بڈشاہ نے ایک مدرسہ طبیہ اور علاج کے لئے دار الشفاء بھی قائم کیا تھا۔ اس کے دربار میں سر برآوردہ طبیب موجود تھے، جو مدرسہ طبیہ میں درس بھی دیتے ہیں۔ مشہور طبیبوں میں محمد بن احمد بن یوسف بن الیاس کا نام ملتا ہے، یہ طب میں ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں، جو "کفایہ مجتہدیہ" کے نام سے موسوم ہے، لیکن عام طور پر یہ "کفایہ منصوری" مشہور رہی۔ یہ کتاب سارے ہندوستان میں، طب کے نصاب میں شامل ہے۔ مصنف نے کتاب میں سلطان زین العابدین کی مدح کی ہے اس کی تصنیف کا زمانہ سلطان زین العابدین ہی کا زمانہ ہے اس بنا پر چارلس ریو نے اسے سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہد سے منسوب کیا ہے۔

فارسی کے ساتھ ساتھ بڈشاہ نے سنسکرت علوم کی بھی سرپرستی کی تھی اس کے دار الترجمہ سے جو پنڈت منسلک تھے، ان کا تذکرہ گزر چکا ہے، ان کے علاوہ

پراجیہ بھٹ اور جونا راجا بھی قابلِ ذکر ہیں۔ جونا راجا نے سریورا کی شرکت میں "راج ترنگینی" کا تکملہ لکھا تھا، اور اسے سلطان کے عہد تک پہنچایا تھا۔ یہ حصے "راجاولی" اور "زبتہ راج ترنگینی" کے نام سے موسوم ہیں۔

بڈشاہ کا شعر و سخن کا مذاق پاکیزہ تھا۔ اس نے شعرا کی بھی سرپرستی کی تھی اور ملا احمد کشمیری کو اس کے دربار میں ملک الشعرا کی حیثیت حاصل تھی۔ سلطان شعر بھی کہتا تھا، لیکن اب اس کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ دربار میں ملا احمد سے اس کی نوک جھونک رہا کرتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ مورخین بیان کرتے ہیں کہ، ملا احمد جب دربار میں آئے تو ان کی دستار کا شملہ اوپر کو اُبھرا ہوا تھا۔ یہ دیکھتے ہی سلطان کو معاً پھبتی سوجھی اور برجستہ یہ شعر کہا۔

شاخ پیشانی ملا احمد کشمیر بیں   گر نہ بدستی تو در آفاق انسان شاخدار

ملا احمد اس پھبتی کو کیسے پی لیتے۔ انھوں نے فی البدیہہ یہ شعر موزوں کر کے پڑھا۔

شاخ پیشانی، خدیوا، گر نداری ذاشتم   تا نیائم در میان مادہ گاواں در شمار

بعض حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے، سلطان ملا احمد سے بدظن بھی ہوگیا تھا، اور انھیں، ملک بدر کر دیا تھا۔ اپنی جلا وطنی کے زمانے میں وہ پھگلی میں مقیم رہے، اور وہیں سے ایک قطعہ معذرت کے طور پر لکھ کر سلطان کی خدمت میں بھیجا تھا، جو حسب ذیل ہے۔

فی نجوم زبیند اختری   فی بمنطق زجز وکل اثری

برمن این کسر وجر چرا رانند   احمد از غیر منصرف خوانند

اس قطعہ کو پڑھ کر سلطان نے انکی خطا معاف کر دی، اور وہ بدستور دربار میں حاضر ہونے لگے۔ اسی زمانے کے ایک مورخ سید علی کی تاریخ کا تذکرہ بھی

خواجہ محمد اعظم نے کیا ہے۔ ان کا یہ بھی بیان ہے کہ :۔

"در عہد سلطان زین العابدین فضلا و شعرای بسیار در کشمیر بودند، چہ از مولد و لایت وچہ از متولدان این شہر تمام لطافت، چوں کس ضبطانہ کرد، حالات شان مستور ماند"

فارسی کو پھیلنے کا سلطان کو اس قدر شوق تھا کہ پنڈت لڑکوں کو وظیفے عطا کر کے مدرسوں میں شریک کرواتا تھا، اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہیں اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرتا تھا۔ پنڈتوں میں فارسی کے رواج پانے اور ان میں اونچے درجے کے شاعر اور انشا پرداز پیدا ہونے کا بڑا سبب سلطان کی یہی ہمت افزائی اور سرپرستی تھی۔

سلطان زین العابدین کی تصنیف "شکایات" کا تذکرہ ڈاکٹر صوفی نے کیا ہے۔ سلطان کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ اس کے دربار کا مشہور گویا زعفران، موسیقی کے فن میں بڑا ماہر تھا۔

سلطان حیدر شاہ کو بھی فارسی شاعری سے لگاؤ تھا، اور ڈاکٹر صوفی نے لکھا ہے کہ اس نے اپنی لکھی ہوئی فارسی نظموں کا مجموعہ مرتب کیا تھا، لیکن یہ اب دستیاب نہیں ہوتا۔

سلطان زین العابدین کے بعد، سلطان حسن شاہ کا عہد بھی علم و ادب کی ترقی کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ حسن شاہ کو خود علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کے عہد میں بھی ایران اور ترکستان سے علما کشمیر آتے رہے۔ حسن شاہ نے علوم و فنون کی سرپرستی میں، سلطان زین العابدین کی مثال کو اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ بڈشاہ کے عہد میں فارسی میں سنسکرت علوم کے تراجم کا جو کام شروع ہوا تھا، وہ حسن شاہ کے زمانے میں بھی جاری رہا اور مزید کئی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔

علم و ادب کے ساتھ ساتھ حسن شاہ کو فلسفہ سے بھی دل چسپی تھی۔

علم و فن سے ہٹ کر، حسن شاہ کو موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اپنی اس دل چسپی کی پیش رفت میں اس نے ہندوستان سے موسیقی کے ماہرین کو کشمیر بلوایا تھا۔ مورخین ان ہندوستانی سنگیت دانوں کی تعداد بارہ سو بتاتے ہیں۔

تعمیرات سے اس کی دل چسپی بھی کچھ کم نہیں تھی، چنانچہ اس نے کئی عمارتیں بنوائی تھیں۔ ان عمارتوں میں روپا لانک بہت مشہور رہے، جو سلطان نے جھیل ڈل میں تعمیر کروایا تھا۔ ایک اور عمارت سونا لانک بھی اس کے مقابل میں بنوائی تھی۔

سلطنت میں علم و فن کی ترقی سے ملکہ اور شہزادیوں کو بھی دل چسپی تھی اس دل چسپی کی بدولت سلطان کی والدہ گل خاتون نے ڈل کے کنارے پکھری بل میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کروایا تھا۔ مورخین نے اس عمارت میں کمروں کی تعداد تین سو ساٹھ بتائی ہے۔ اس عظیم الشان مدرسہ کے انتظامات اور اخراجات کا اندازہ اس کی وسعت سے ہو سکتا ہے۔ مدرسہ کے اخراجات کے لئے ملکھا اور وادئ سندھ کے گاؤں بناہام اور لار وقف کئے گئے تھے۔ حسن شاہ کی ملکہ، حیات خاتون بھی علم کا شغف رکھتی تھیں، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد جب گل خاتون کے مدرسہ کی عمارت تعمیر طلب ہو گئی تھی، تو اس نے اپنے اخراجات سے اس کی مرمت کروائی تھی۔ اس مدرسہ کے صدر بابا اسمٰعیل کبروی مقرر ہوئے تھے، جو حسن شاہ کے پیر طریقت اور شاہ ہمدان کے فرمانے پر قائم کئے ہوئے۔ مدرسہ قرآن کے صدر ابو المشائخ شیخ سلیمان کے فرزند تھے۔

خواجہ اعظم دیدہ مری نے سلطان حسن شاہ کے حالات میں اس کی ذاتی دلچسپیوں کا ذکر کچھ زیادہ اچھے الفاظ میں نہیں کیا۔ مثلاً لکھتے۔

"از راہ تن پروری و نازنینی باموز خطیر سلطنت نداده بعیش و عشرت

و بہ علم موسیقی پرداختہ حکومت خود ضائع ساخت "۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ فنونِ لطیفہ سے سلطان کی دل چسپی، سلطنت میں حسن کاری کے ذوق کو ترقی دینے کا باعث ہوئی تھی۔ اس کے زمانے میں اچھے مصور، نقش کار، تعمیر کار اور خطاط موجود تھے۔ جامع مسجد، جو اس زمانے میں جل گئی تھی اس کی باز تعمیر اور تزئین میں سلطان نے ذاتی ذوق کا ثبوت دیا تھا، اور اس کی دیواروں کو نقش و نگار اور کتابوں سے زینت دی تھی۔

بیہقی خانوادہ کے کئی بزرگوں نے، جس میں بابا میر اویسی کے والد سید حسین بیہقی اور بھائی سید حسن بیہقی پیش پیش تھے، کشمیر میں علم کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ سید حسن کی صاحبزادی حسن شاہ کے عقد میں تھیں۔ جب حسن کا انتقال ہوا، تو اس کا لڑکا محمد شاہ کمسن تھا۔ اس کی پرورش نانا نے کی۔ اس طرح ان کو حکومت میں دخل دینا پڑا۔ اس پر کئی امرا اس کے مخالف ہو گئے تھے۔ بابا میر اویسی کے انتقال کے بعد وہ کچھ عرصہ کے لئے ہندوستان بھی چلے گئے تھے۔

سید حسین بیہقی کی ایک تصنیف "ہدایت الاعمیٰ" دستیاب ہوئی ہے، جو اسلامی عقائد اور مسائل کے بارے میں ہے۔ اس رسالے میں وحدت، ایمان، معرفت، شریعت، طریقت، حقیقت، کرامت، وجد و سماع، غنا و مزامیر، حسن اور باغ کو دیکھنے کے مسائل عبادت، بدعت اور دوسرے مسئلوں سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"اما بعد بداں کہ طالب حق و سالک راہ مطلق کہ می گوید فقیر حقیر، ساکن شہر کشمیر، طالب راز ہمیشہ در نیاز بے زینت و زن فقیر حسین غفر اللہ لہ و لوالدیہ دریں رسالہ کہ نام ایں ہدایت الاعمیٰ کردہ شد ہر اعمیٰ کہ در تیہ ضلالت و بدعت گرفتار است و راہ گم کردہ است

خوانندہ و شنوندہ را راہ نماید ...۔"

اپنے ذیل کے اشعار میں راہ شریعت پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں :

گفتار خوش از حبین کشمیر شنو　　آثار بداہست تعزیر شنو

جز راہ شریعت تو نیابی رہ را　　در شرع روای جواں وای پیر شنو

ملک احمد یتو، جن کا ذکر اوپر آیا ہے، حسن شاہ کے وزیر تھے - ان کی ملکہ شاہ بیگم کو بھی علم سے لگاؤ تھا، اور اس نے بھی ایک مدرسہ بنوایا تھا، جہاں علوم دینیہ کی تعلیم دی جاتی تھی - تازی بٹ اور اس کے بیٹے نے بھی مدرسے قائم کئے تھے ۔

حسن شاہ کے عہد میں خواتین میں علم دوستی کا جو جذبہ کارفرما تھا، اس کا اندازہ گل خاتون، اور حیات خاتون کی مثال سے ہوا ہوگا - اسی طرح کی ایک اور علم دوست خاتون، زاہدہ خاتون تھیں - ان کی کچھ عارفانہ کہاوتیں فارسی میں ملتی ہیں - ایک کہاوت ہے ۔

"ہر کہ از بود وا رہیدہ، از اندوہ رستہ و از غم بیم جستہ"

حضرت نور الدین ریشی کی معتقد خواتین میں بی بی دہہت کے نام قابل ذکر ہیں، جو اپنے زہد اور ریاضت کے لئے مشہور تھیں ۔

حسن شاہ کے عہد کا ایک اہم واقعہ مولانا میر شمس عراقی کی کشمیر میں آمد ہے اس سلسلے میں پیر غلام حسن کی لکھی ہوئی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

"در سنہ ۸۹۷ھ میر شمس عراقی از جانب سلطان حسین میرزا والی خراسان بطور سفارت بکشمیر آمدہ، مراسلہ شاہی معہ یک پوستین کیشی از پوشش خاص سلطان بہ حسن شاہ ارمغان آوردہ پیغام فرستادن بعضی تحایف و نفایس کشمیر کہ

خواہش خاطر سلطان خراسان بود ظاہر ساخت"۔
اس کے کچھ عرصہ بعد حسن شاہ کا انتقال ہو گیا۔ آٹھ سال تک میر شمس عراقی کشمیر میں رہے اور بقول غلام حسن:۔

"ظاہراً در سلک مریدانِ بابا اسمٰعیل در آمد، و در باطن بابا سجاؔر را مذہب شیعہ مرغوب ساختہ خود بجانب خراسان رجعت نمود، و در عہد فتح شاہ باز بکشمیر آمدہ مذہب شیعہ را رواج کلی داد"۔

شیعہ عقاید کی اشاعت بعد میں کشمیر کے امرا اور عوام کے اختلافات کی ایک وجہ اور سبب مخاصمت بن گئی۔ آخر کار، چک خاندان کے ہاتھوں، جنھوں نے شیعہ عقائد قبول کرلئے تھے، کشمیری خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔
شمس عراقی نے شیعہ عقائد پر ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی جو "احوط" کے نام سے موسوم ہے۔

قطب الدین پورہ کا دار العلوم اس زمانے تک قائم تھا، اور اس زمانے میں اس کی صدارت پر مولانا رضی الدین فائز تھے جو اپنے عہد کے سربرآوردہ عالم فاضل اور علم بلاغت میں شہرہ آفاق تھے۔ بابا شیخ داؤد خاکی اور ملا شمس الدین پالی، جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے، انہیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ مولانا مصنف بھی تھے اور پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ ان کی تصنیف کی ہوئی کتابیں بلند پایہ مانی جاتی ہیں۔ مولانا رضی الدین کے علاوہ ایک اور عالم ملا حاجی گنائی بھی قطب الدین پورہ کے مدرسہ میں درس دیتے تھے۔ مولانا رضی الدین کے سسرے مولانا لوئی گنائی، جو ملا میچی کے نام سے مشہور رہیں، اچھے عالم تھے اور اشاعت علم میں مصروف رہے۔

ایک اور سربرآوردہ عالم ملا عبدالوہاب، ملا فیروز کے فرزند تھے جو علم تصوف، منطق اور معما میں کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی رسالے لکھے تھے، جن میں مشہور یہ ہیں۔

تعریف فی التصوف۔ شرح مواقف۔ شرح شمہ منطق۔ ملا عبدالوہاب نے حاشیے بھی لکھے تھے ان کی تصانیف بلند پایہ تسلیم کی جاتی ہیں۔

بابا فتح اللہ ثانی جو بعد میں شیعہ حکومت کی داروگیر کی وجہ سے سیالکوٹ منتقل ہو گئے تھے، علوم اسلامی میں تبحر رکھتے تھے۔ کشمیر کے علما میں ان کا بلند مقام اس وجہ سے ہے کہ حضرت شیخ حمزہ نے ان کے آگے زانوی شاگردی طے کیا تھا۔ ان کے کشمیر چھوڑنے کا باعث یہ ہوا کہ یہ بڑے سخت سنی تھے اور صاحب کردار انسان تھے۔ اس لیے شمس الدین عراقی ان کے مخالف ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کے ایک مرید کو موسیٰ رینہ نے جو شمس عراقی کا معتقد تھا قتل کر دیا تھا، اور اس کے ملازم بابا فتح اللہ کے قتل کی فکر میں بھی تھے۔ سیالکوٹ میں انھوں نے درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ وہاں وہ "فتح اللہ حقانی" کے نام سے مشہور تھے ان کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ان کی دو صاحبزادیاں، مشہور علمائے کشمیر مولانا کمال اور مولانا جمال کے عقد میں تھیں۔

مولانا حافظ بصیر جو بلہ بابا کے لقب سے مشہور رہیں، فقہ، حدیث، تفسیر کے علاوہ فلسفہ، منطق اور ریاضی میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ حضرت بابا داؤد خاکی، شیخ یعقوب صرفی اور شمس الدین پال انہیں کی تعلیم سے فیض یاب ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ۹۶۶ھ میں ہوا۔ شیخ یعقوب صرفی نے مرثیہ کہا تھا، جس کا تاریخی شعر حسب ذیل ہے۔

آں حافظ علم و ادب، بودہ بصیر از علم   تاریخ خوتش زاں سبب شد عالم تفسیر داں

مولانا محمد آنی جو مولانا عبدالرحمٰن جامی کے شاگرد رشید تھے، کشمیری سلاطین کے آخری عہد میں کشمیر آئے تھے۔ ان سے علوم ظاہری و باطنی میں لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ وہ شاعری میں بھی اُستاد کا مرتبہ رکھتے تھے اور زیادہ تر پند و موعظمت میں شعر کہتے تھے۔ شیخ یعقوب صرفی شاعری میں انہیں سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا ایک شعر پیر غلام حسن نے نقل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے۔

عرق نشست ز پندم رخ نکوئی ترا زمن مرنج کہ میخواہم آبروئی ترا

دورِ خانہ جنگی کے زمانے میں کسی پائدار ادب کی تخلیق کا سراغ کم ملتا ہے اس سارے دور میں میرزا حیدر دغلات کے کشمیر میں اقتدار حاصل کرنے تک چند تواریخ لکھی گئیں، جن میں قاضی ابراہیم کی "تاریخ قلمرو کشمیر" جو ۱۵۱۴ء (م ۹۲۰ھ) کی تصنیف ہے اور سید علی محمد کی "تاریخ کشمیر" اہمیت رکھتی ہیں۔

میرزا حیدر کے اقتدار پر تسلط جمانے کے بعد حالات میں کچھ بہتری پیدا ہوئی۔ اور کچھ ادبی اور تہذیبی امور کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ میرزا حیدر نے حمام تعمیر کروائے، عمارتوں کے طرز تعمیر میں کچھ نئے عناصر داخل کئے اور شالبافی کی صنعت کو پھر سے رواج دیا جو سلطان زین العابدین کے بعد سے کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

میرزا حیدر اچھا اہل قلم بھی تھا۔ اس کی مصنفہ "تاریخ رشیدی" اس عہد کے حالات کے بارے میں مستند تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تاریخ اس نے کشمیر ہی میں لکھی تھی۔

میرزا حیدر کے انجام کا تذکرہ تاریخی حصے میں گذر چکا ہے۔ اس کے قتل ہونے کی تاریخ کسی شاعر نے حسب ذیل کہی تھی۔

شہ گورگاں میرزا حیدر آنکہ بملک شہادت زند کوس شاہی

قضای الٰہی چنیں بود تاریخ   شدہ بہر وصلش قضای الٰہی

"تاریخ رشیدی کے علاوہ میرزا کی کچھ اور تصانیف بھی ہیں۔

میرزا حیدر اپنی تاریخ کی ترتیب کے بارے میں معذرت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لاجرم کل العباد المفتقی الی اللہ الغنی محمد حیدر ابن محمد حسین گورگانی که بین الخلایق حیدر معروفم با وجود عدم استطاعت و قلت بضاعت بحکم ضرورت در این امر خطیر استقدام می نمایم۔"

دیباچے میں مولانا شرف الدین علی یزدی کی توصیف کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"پس ہم جہت تیمن و تبرک را اول مقدمہ ظفر نامہ حضرت قدوۃ المدققین و زبدۃ السالکین العالم بالفرع والاصول و المنقول مولانا شرف الدین علی یزدی بجنس ... نقل کردم۔"

تصنیف کا سبب یہ بتایا ہے کہ مغل خواقین کے حالات میں تو مغل تیمور تک تواریخ ملتی ہیں اس کے بعد کے خواقین کے حالات مشروح نہیں ہوئے ہیں، اس لئے اس تاریخ کے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میرزا حیدر کو شعر سے بھی لگاؤ تھا۔ کشمیر کے بارے میں ان کی ایک رباعی ذیل میں درج ہے۔

یک لالہ رخی کہ مہر افزاید نیست   دمہ مہر و وفا چنانچہ باید نیست
در گلشن کشمیر بسی جوش گل است   آن گل کہ ازو بوی وفا آید نیست

اسی عہد میں ایک اور تاریخ بھی لکھی گئی تھی، جو تاریخ کشمیر کے نام سے موسوم ہے اور اس کے مصنف ملا حسین قاری ہیں۔

۵

چک سلاطین کا عہد

(۹۶۲ھ/۱۵۵۶ء تا ۹۹۲ھ/۱۵۸۳ء)

چک سلاطین کے عہد میں فارسی علم و ادب اور شاعری کو پھر سے نئی تحریک نصیب ہوئی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ چک سلاطین شیعہ مسلک پر چلتے تھے، اس لیے اس زمانے میں ایران سے کئی شیعہ علما کشمیر آئے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ چک حکمرانوں میں بعض علم و ادب کے قدردان اور سرپرست تھے، حسین شاہ اور یوسف شاہ خود شاعر تھے۔ پیر غلام حسن، سلطان زین العابدین بڈشاہ کے بعد، کشمیر میں علم و فن کی کساد بازاری پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "پس در عہد چکاں حسین شاہ چک کہ در سخن گستری طبع عالی داشت و پرورش و قدردانی سخنوراں بسیار می کرد، حرفہ شعر و سخن اندک رواج یافت۔"

حسین شاہ کے عہد میں کچھ اچھے فارسی شاعر منظر عام پر آئے، جن میں ملا نامی

اول، ملا ناجی ثانی، ملا جہدی، بابا طالب اصفہانی قابل ذکر ہیں۔ بابا طالب حسین شاہ کے بعد بھی موجود رہے۔

حسین شاہ خود بھی اچھا شاعر تھا لیکن اس کا کلام زیادہ نہیں ملتا، واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خوش فکر شاعر تھا۔ ملا ناجی ثانی اس کے دربار کا شاعر تھا، اور اسے پادشاہ کے مزاج میں بڑا رسوخ تھا۔ ایک دفعہ عید کے موقع پر، حسین شاہ نے اسے خلعت عطا کی تھی۔ اس پر ناجی نے اس سے ایک گھوڑا عطا کرنے کی استدعا کی۔

؎ "خلعت شاہی مرا پیی رسد باز ایں رسد"۔ اس کے جواب میں حسین شاہ نے لکھ بھیجا

؎ ایں چنینی کم فہم را نہ ایں رسد نہ آں رسد

حسین شاہ، سلطنت کے کاموں کی مصروفیت کے باوجود شعر وسخن کی دلچسپیوں کیلئے بھی وقت نکال لیتا تھا، اور کبھی کبھی فکر شعر بھی کرتا تھا۔ خواجہ اعظم دیدہ مری نے اس کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں۔

دلا، برخیز دکاری کن کہ جاں درکار می آید	حمائل کردہ تیغ و بستہ خنجر یار می آید

یاران، حذر کنید کہ آتش بلند شد	آں ترک آل پوش سوار سمند شد

حسین شاہ کی سرپرستی کا شہرہ سن کر، جو شاعر اور عالم ایران اور دوسرے مقامات سے کشمیر آئے تھے، ان میں ملا ناجی اول و ثانی، بابا طالب اصفہانی کے علاوہ، میر علی اور مولانا جہدی بھی قابل ذکر ہیں۔ ان سب کی رسائی دربار تک ہوگئی تھی اور حسین شاہ نے ان کی فزار واقعی سرپرستی کی۔ میر علی شاعری کے علاوہ دوسرے علوم و فنون میں بھی کمال رکھتا تھا۔ اس کے علمی کمالات کے بارے میں میر غلام حسن نے لکھا ہے:

"علامہ زماں، و فاضل دوراں، صاحب نطق و بیاں بود"

میر علی اچھا خوش نویس بھی تھا، لیکن یہ نستعلیق کے موجد میر علی سے، جو

شہرہ آفاق حیثیت رکھتے تھے، مختلف ہے۔ اس نے حسین شاہ کی سرپرستی میں مرفہ حالی کی زندگی بسر کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پوٹا کدل میں جہاں وہ رہتا تھا، اس نے ایک مسجد بنوائی تھی۔ انتقال کے بعد وہ اسی مسجد میں دفن ہوا۔ حسین شاہ کے مزاج میں اسے کس قدر دخل تھا، اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے، کہ ایک دن، سلطان اپنے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا، میر علی بھی موجود تھا۔ حسین شاہ نے ایک پھول توڑ کر اسے دیا۔ اس پر میر علی نے فی البدیہہ شعر کہا تھا:

گل بدستم چہ نہی ، در کف من خار خوش است

ایں گل تازہ برآں گوشۂ دستار خوش است

اس کا ایک شعر اور ہے۔

سبو سبو دہ و خم خم دل لوند مرا   قدح چہ آب زند آتش بلند مرا

ملا ناجی اول صرف و نحو کا عالم تھا اور شعر و سخن میں بھی کمال رکھتا تھا۔ اس نے حسین شاہ کی مدح میں قصائد لکھے تھے اور ایک مثنوی کشمیر کی تعریف میں بھی کہی تھی۔ شراب کی تعریف میں وہ اس طرح رطب اللسان ہے:۔

عروسیست مئی، شادی آئین او   کہ تواں رواں داد کابین او

بخاموشش چہرہ زبانی دہد   بفر توت زور جوانی دہد

ملا کی غزل کے کچھ شعر ہیں:۔

ہرگز دلم بغیر تو مائل نمی شود   وز دیدہ نقش روی تو زائل نمی شود

از دوریت چہ باک کہ ایں بعد ظاہری   اصلا میان ما و تو حایل نمی شود

دستم بریدہ باد چہ کار آیدم بگو   در گردن بتاں چو حمایل نمی شود

ملا مہدی کو علی شاہ سے تقرب حاصل رہا۔ اس نے حضرت علی کی منقبت میں بڑی عمدہ نظم کہی تھی، جس کا ایک شعر حسب ذیل ہے:

مرتضیٰ پادشہ کشور عالی نسبتی است　　　آفتابی است کہ برتاج شرفش درخش بنی است

یوسف شاہ کی شخصیت کے اطراف جلتا رومان بنا ہوا ہے۔ اس کی زندگی اور عہد کے حالات اتنے ہی تاسف انگیز رہے۔ اس کے زمانے میں امراء کے آپس کے خلفشار اور مذہبی مناقشوں کی وجہ سے، حالات علم و ادب کے فروغ کے لئے زیادہ سازگار نہیں تھے، تاہم ہنگاموں کی بیرونی دنیا کے اندر اس نے اپنے لئے سرود و نغمہ اور محبت اور الفت کی ذہنی آسائشوں کی ایک دنیا بسالی تھی، جس کا مرکز اس کی محبوبہ اور ملکہ حبہ خاتون تھی۔ حبہ خاتون کشمیری کی شاعرہ اور خوش گلو مغنیہ بھی تھی لیکن اس سے بڑھ کر خود وہ شعر کا موضوع لا واقع ہوئی تھی۔ چنانچہ عاشق مزاج بادشاہ کی توجہ کا وہ مرکز بنی ہوئی تھی۔ پیر غلام حسن لکھتے ہیں:

"پس شب و روز در مصاحبت و موانست آں دل افروز مسرت اندوز در مکانات خوش و مناظر دل کش میان مرغزارہا اوقات بسر می کرد۔"

یوسف شاہ اچھا شاعر تھا۔ اس کی شعری تحصیلات کے بارے میں پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ "طبعی موزوں داشت، اشعار فارسی، و ہندی و کشمیری بدیہہ می گفت" اور خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اس کی غزل کے کچھ شعر ہیں۔

لیلیٰ بجنازہ را بر مجنوں بجنوند اند　　　زور کمند جذبہ معجز نمائی اوست

دل بہ درد من جاناں لسان غنچہ پر خون است
چہ بے رحمی نہ پرسیدی کہ احوال دلت چون است

یوسف کا ایک منظوم خط بھی ملتا ہے۔ لوہر چک کی بغاوت کے موقع پر

ابدال بٹ کے بھائی علی بٹ نے راسے غلط مشورہ دیکر اپنا مطلب براری کی کوشش کی تھی۔ یوسف شاہ اس کی دھوکا دہی کو تاڑ گیا اور اس خط کے جواب میں یہ منظوم نامہ لکھ کر اس کے پاس بھجوایا تھا:

چہ می گوئی اے گرگ ابدال رنگ　　بہ ترسانی از آب دریا نہنگ
غضنفر بصد فر بر آورد سر　　حذر کن ز روباہ بازی گذر
تو بودی کشاورز آبای من　　کشاورز را کی سزد جای من
بشمشیر و خنجر ترا نیست کار　　کشاورز را با دلیری چہ کار
نزادہ سنم دیگراں زیر دست　　بہ پور علی شاہ کہ آرد شکست
تو از مکر خود سید پادشاہ　　در انداختی ہمچو رستم بچاہ
پی حرب من لشکر آراستی　　شبیخون کناں سوی من تاختی
تو گر ہوشیاری نہ من بے خودم　　ہمہ ہوشیارم ہمہ بخردم
من آنگہ عناں باز پیچم زراہ　　کہ پا مرد ہم پا ستانم کلاہ
ترا آنچہ بایست گفتم تمام　　تو دانی دگر بعد ازیں والسلام

حرب و پیکار کی فضا میں یوسف کے شعری ذوق کا یہ کارنامہ قابلِ تحسین ہے۔

بابا طالب اصفہانی کو بادشاہ اور امرا میں اہمیت حاصل تھی۔ اس نے امرا کی نزاع میں صلح وصفائی کی بھی کوشش کی تھی انھیں شعر و سخن کا ذوق بہت اچھا تھا، جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے اندازہ ہو گا:

در حلقۂ ما زمزمہ سور نباشد　　ما غمزدگاں را دل مسرور نباشد
بی روی تو بیروں کنم از دیدہ نظر را　　گر ذوق تماشای تو منظور نباشد
ویرانۂ دل چوں سر تعمیر ندارد　　بگذار کہ این غمکدہ معمور نباشد

از سر کوی تو دل باد یدہ تر بیرود   شعلہ در دل، نالہ، بر لب خاک بر سر بیرود

حرف شرح درد دل گر آشنا بر لب کنم   خوں زجیب دیدہ تا دامان محشر بیرود

یوسف شاہ کے درباری شعرا میں مولانا احمد کو بڑا درجہ حاصل تھا۔ وہ اچھا شاعر اور عالم تھا۔ مغلوں کے ساتھ یوسف شاہ کی جنگ پر اس نے ایک مثنوی لکھی تھی، جس کے دو شعر حسب ذیل ہیں:

چناں خون رواں شد ز دشت نبرد   کہ چوں سیل رفتہ زجا پای مرد

چکا چاک شمشیر برندہ فرق   زمیں را بدریای خوں کردہ غرق

اس زمانے میں ایسا قحط پڑا تھا کہ خواجہ اعظم لکھتے ہیں: "مثل آں در کشمیر کم یاد دادہ باشد"۔ مولانا احمد کے ذیل کے اشعار میں اس طرف اشارہ ملتا ہے:

گر نظر بر ہلال می کردند   لب نانی خیال می کردند

گردن خود دراز می کردند   دہن آز باز می کردند

محمد امین مستغنی یوسف شاہ کے مصاحبوں میں تھا۔ اس کے کلام کا پایہ کسی ایرانی شاعر سے کم نہ تھا۔ جب یوسف شاہ اکبر کے دربار میں گیا ہوا تھا اور اس کے ہوا خواہ متفکر تھے، مستغنی نے دیوانِ حافظ سے فال لیا تھا، اور یہ شعر بر آمد ہوا تھا:

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور   کلبہ احزاں شود روزی گلستاں غم مخور

مستغنی کے کچھ شعر اور یہ ہیں:

جہاں ز گم شدہ من اگر ہمہ خبر است   سر دنی کہ بگیرم از د سراغ کجاست

بیا کہ شب مارا بسر برد بر تو بہر   رخی کہ در رہ ما می نہد چراغ، کجاست

کشمیر کی تعریف میں مستغنی کی ایک رباعی ہے:

دوشینہ بچشم دل نہاں از مردم دیدم نہ بہشت بلکہ کشمیرِ دوم
خاکی ز عبیر و مشک آگندہ عبیر آبی ز صفا وجود خود یافتہ گم

یوسف شاہ کے بیٹے اور جانشین، یعقوب شاہ کو خانہ جنگی اور خلفشار باپ سے ریاست کے ساتھ ورثہ میں ملے تھے۔ لیکن کشمیر کی شعر خیز فضا اور باپ کے شعری ذوق سے بھی اسے حصہ ملا تھا چنانچہ شعرا سے اُس سے بھی ربط رہا۔ میرزا علیخاں جو میرزا مجرم بیگ تاشلیقی کا بیٹا تھا، اس کے دربار کا اچھا شاعر تھا۔ اس کا ایک شعر ہے:

شام چو از چہرہ فگندی نقاب تاب نیاورد نشست آفتاب

میرزا علی خاں، راجہ بھگوانداس کی فوج پر یعقوب خاں کے شب خون کی لڑائی میں مارا گیا۔

یعقوب کے زمانے میں شیعہ سنی فسادات کا زور تھا۔ ان جھگڑوں میں ملا علینی کا بھی تھوڑا بہت ہاتھ رہا تھا۔ انہوں نے مولانا جامی کے شعر:

حریفاں بادہا خوردند و رفتند تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

کے تخطیہ کے طور پر یہ دو شعر کہے تھے، جس پر مولانا جامی کے پرستار ان سے سخت ناراض ہو گئے تھے:

ہنوز آن ابر رحمت در فشان است مئی و میخانہ با مہر و نشان است
دریں دیر مسدس خم تہی نیست تہی گفتن بغیر از ابلہی نیست

ان مناقشوں میں کشمیر کے ایک جوہر قابل کا نقصان ہوا، یہ قاضی میر موسیٰ شہید تھے۔ قاضی شہید کشمیر کے قاضی ابراہیم کے بیٹے تھے۔ باپ کے بعد وہ کشمیر کی قضاءت پر مامور رہے تھے۔ پیر غلام حسن ان کی شہادت کے سلسلے میں یہ تفصیل لکھتے ہیں:

"قاضی موسیٰ کہ از احفاد قاضی میر علی بہ علوم غریبہ و فنون عجیبہ آراستہ بود، اباً و جداً از عہد قاضی ابراہیم فیصلہ امور قضایا ی ایں دیار تعلق بہ خاندان ایشان داشت۔ ۔ ۔ ۔ یعقوب خاں او

را بہ تعصب مذہب تکلف ساخت کہ فرقہ اہل سنت را مرعوب و منقوص نماید تا کہ در میان مساجد کشمیر موذنان فقرہ علیؑ ولی اللہ بہ اذان ملحق سازند۔ قاضی موسیٰ بہ نظر رعایت سنت از صولت او نترسیدہ تجوز این امر خطیر نگردید۔ یعقوب خاں اور اتہمت موافقت شمس چک نمودہ بر سر دیوان شہید ساخت"۔

چک سلاطین کے عہد میں حضرت مخدوم شیخ حمزہ کا فیضان جاری ہوا۔ آپ شہمیری سلاطین کے آخری زمانے میں پیدا ہوئے تھے، اور کشمیر کے مشہور رینہ خاندان سے آپ کا تعلق تھا اس طرح آپ ایک متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے، لیکن آپ نے دین کو دنیا پر ترجیح دی، اور ساری عمر یاد خدا میں گذار دی۔ آپ کا انتقال ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) میں ہوا۔ آپ کے فیض صحبت سے جو علما اٹھے، انہوں نے کشمیر میں علم و فضل کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر آپ کے بھائی بابا علی رینہ ہیں۔ وہ اور شیخ کے ایک اور مرید بابا داؤد خاکی نے علم ظاہری اور باطنی کے لئے رہبری کی تلاش میں دور دراز کے سفر بھی کئے تھے اور ملتان کے علماء اور صوفیاء سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ کشمیر واپس ہونے کے بعد بابا داود نے حضرت مخدوم کی خدمت میں روحانی مدارج طے کئے۔ بابا علی رینہ نے زاہدوں اور عرفا کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی، جو "تذکرۃ العارفین" کے نام سے موسوم ہے۔

حضرت بابا داؤد خاکی، حضرت مخدوم سے فیض پائے ہوئے علماء میں سب سے زیادہ سر برآوردہ ہیں۔ ان کے والد شیخ حسن گنائی مشہور خطاط تھے "گنائی" کا خطاب ان کے مورث اعلیٰ کو بادشاہ نے دیا تھا، جس کے معنی "اہل قلم" کے ہیں۔ یہ خطاب صاحب تصنیف اور خطاطوں کے لئے موزوں تھا۔ بابا داؤد

۱۵۲۱ء/ ۹۲۸ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ملا بشیر اور علامہ رضی سے، جو اس زمانے کے مشہور عالم تھے، انہوں نے عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم حاصل کی تھی۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد، شہزادہ نازک شاہ کی اتالیقی کی خدمت ان کے سپرد ہوئی، لیکن اس خدمت کو انہوں نے حضرت مخدوم شیخ حمزہ سے بیعت ہونے کے بعد ترک کر دیا۔

چک سلاطین کے شیعہ عقائد میں غلو کی وجہ سے، جو منافقتے سلطنت میں پھیل گئے تھے، اور علما، اور فضلا بے گناہ مظالم کا شکار ہو رہے تھے، اس کا اندازہ پیر غلام حسن کے اس بیان سے ہوتا ہے، جو قاضی موسیٰ شہید کے تذکرہ میں نقل کیا گیا ہے۔ جب حالات کی اصلاح خود ریاست کے اندر کی قوتوں سے نہ ہو سکی، تو بابا داؤد خاکی اور ان کے ساتھ شیخ یعقوب صرفی نے، ہندوستان جا کر شہنشاہ اکبر سے امداد مانگنی ناگزیر سمجھی۔ چنانچہ یہ دونوں ہندوستان گئے اور اکبر کو مداخلت پر آمادہ کیا۔ ان کے ساتھ کشمیر کے اور عمائدین بھی تھے۔

بابا داؤد خاکی، جتنے بڑے عالم تھے، اتنے ہی بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتیں علم، مذہب اور متصوفانہ خیالات کے لئے وقف ہو گئی تھیں۔ انہوں نے خاکی تخلص، اظہار انکسار کے لئے اختیار کیا تھا۔ ان کے قصیدے معرکتہ الآرا ہیں۔ یہ قصیدے لامیہ، جلالیہ، غسلیہ، کے عنوانوں سے موسوم ہیں۔ ان کی دوسری تصنیف "ورد المریدین" ہے جس کی شرح "دستور السالکین" کے نام سے لکھی تھی، ایک اور "رسالہ غزوریہ" ہے جس کی شرح انہوں نے "مجموعتہ الفوائد" کے نام سے لکھی ہے۔

بابا داؤد کے قصائد عالمانہ ہیں۔ قصائد کے علاوہ انہوں نے غزل بھی کہی ہے، لیکن ان کی غزل تصوف اور عرفان کے ادق رموز اور نکات

ہیے پر ہے خاکی کی غزل کے دو شعر ہیں:

گہ بمسجد روم وگاہ بہ میخانہ شوم | من بےچارہ نزاعی طلبم از ہر سو
نتوانم کہ شمارم کرم و نعمت تو | گر زبانم شود اندر تن من از ہر سو

بابا داؤد کا انتقال ۱۵۸۵ء (م ۹۹۴ھ) میں ہوا، لیکن انتقال سے پہلے انہوں نے علم کی تلاش اور حقیقت کی وہ لَو جو انہیں زندگی بھر بے چین رکھے ہوئے تھی، اور شعر وسخن کا عارفانہ انداز، جو ان کی فکر کا خاصہ تھا، اپنے حلقہ کے بہت سے طالبین میں منتقل کر دیا تھا۔ چنانچہ، ان کے بعد، ان کے فیض یافتہ علما میں سے علم وادب کے بہت سے پرستار منظر عام پر آئے۔

شیخ یعقوب صرفی، اس عہد کے ایک اور جید عالم، روحانی پیشوا اور شاعر ہیں، جن کا فیض کشمیر، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک میں بھی جاری رہا۔ ان کی پیدائش کا سنہ ۱۵۲۱ء (م ۹۲۸ھ) ہے۔ صرفی کا تعلق مشہور "گنائی" خاندان سے تھا۔ "گنائی" نسبت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ صرفی نے بہت ہی کم عمری میں قرآن حفظ کر لیا، اور مولانا آنی کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہو گئے تھے۔ مولانا آنی ملا جامی کے شاگردوں میں ممتاز تھے۔ انہوں نے بابا داؤد خاکی کے استاد مولانا حافظ بصیر سے بھی اکتساب کیا تھا۔ وطن کے علما کے فیض صحبت سے جب ان کی علمی پیاس کو تسکین نہیں ہوئی، تو وہ سیالکوٹ، لاہور، کابل، سمرقند اور مشہد بھی گئے اور وہاں کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ حج کے لئے جب مکہ گئے تو شیخ ابن حجر مکی سے حدیث میں سند حاصل کی۔ نزکتان میں انہیں شیخ حسین خوارزمی کی مسند طریقت پر بٹھایا گیا۔ آگرہ میں قیام کے زمانے میں شیخ سلیم چشتی سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی، اور شیخ چشتی کے آخری سفر حج میں صرفی بھی ان کے ساتھ تھے۔

صرفی بڑے ژرف نگاہ عالم اور ہمہ گیر طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مولانا شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے ان سے حدیث کا درس لیا تھا۔ وہ کثیر تعداد تصانیف کے مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف ہیں، "حاشیہ رباعیات" "حاشیہ روائح" "شرح صحیح بخاری" "حاشیہ توضیح دالتلویح" "مناسک حج" "رسالہ اذکار" "کنز الجواہر" "چہار رسالہ"۔ ایک دیوان اور خمسہ شامل ہے قرآن کی ایک تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی لیکن وہ مکمل نہ ہو سکی۔ یہ تفسیر "مطالب الطالبین" کے نام سے موسوم ہے۔

صرفی کے دیوان میں غزل، قصیدہ، نعت، منقبت، رباعی، غرض ہر صنف کا کلام موجود ہے، لیکن ان کا مخصوص انداز متصوفانہ اور عارفانہ ہے۔ ذیل میں ان کی غزل کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

در ہر چہ بنیم آن رخ نیکوست جلوہ گر ‏ ‏ در صد ہزار آئینہ یک رو دست جلوہ گر

دیں طرفہ تر کہ دوست بہر سوست جلوہ گر ‏ ‏ خلقی بہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دوست

صرفی کا خمسہ جوان کی پانچ مثنویوں "مسلک الاخیار" "وامق و عذرا" "مغازی النبی" "لیلی مجنوں" اور "مقامات مرشد" پر مشتمل ہے، ان کا معرکۃ الارا کارنامہ مانا گیا ہے۔ اس خمسہ کی تصنیف پر انہیں "جامی ثانی" کا لقب ملا تھا۔

صرفی عربی کے بھی عالم تھے۔ فیضی سے بھی ان کی دوستی تھی۔ فیضی نے اپنی بے نقط تفسیر قرآن "سواطع الالہام" پر صرفی سے تقریظ لکھوائی تھی، جو انہوں نے فی البدیہہ لکھی تھی۔ ملا عبدالقادر بدایونی سے بھی صرفی کے مراسم تھے۔ بدایونی نے ان کے علم و فضل اور تقویٰ کی بڑی تعریف کی ہے۔

کشمیر کی آزاد شاہی کے ختم سے پہلے، بابا داؤد خاکی اور شیخ یعقوب صرفی ایسے دو عظیم الشان عالم، روحانی پیشوا، ادیب اور شاعر، کشمیر کی سرزمین سے اٹھے

تھے، جن کی نظیر بعد کے ادوار میں مشکل سے مِل سکے گی۔ صرفی مغلیہ عہد کے ابتدائی چند برسوں تک زندہ رہے، اور ۱۵۹۴ء (م ۱۰۰۳ھ) میں انتقال کیا۔

اس عہد کے متقی علما میں بابا علی رینہ کا مرتبہ بلند ہے۔ وہ حضرت شیخ حمزہ مخدوم کے بھائی اور ان کے ارادت مندوں میں بھی شامل تھے۔ حضرت شیخ مخدوم سے انھیں جیسی قربت حاصل تھی، اسی مناسبت سے انھوں نے شیخ سے رُوحانی کمالات کا اکتساب بھی کیا تھا۔ بھائی کا وہ بہت احترام کرتے تھے۔ اس کا اندازہ بابا علی کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو "تذکرۃ العارفین" میں شیخ کے بارے میں لکھے ہیں۔ "تذکرۃ العارفین" بابا علی کی کشمیر کے عارفوں اور زاہدوں کے حالات اور ملفوظات پر مشتمل ایک بسیط اور ضخیم تصنیف ہے۔ آغاز میں اپنے اور شیخ کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"فیقول العبد الضعیف الفقیر الخفیف علی ابنِ عثمان کشمیری ساکن کشمیر کہ مولد و موطن ایں غریب است بہ نژاد قدیمی) موصوف بر رینہ کہ در کشمیر آں را (بہ وزارت) مخصوص دارند، و برادر حقیقی ایں فقیر کہ مرشدِ کاملِ من و زمانہ و زمانیاں است اعنی غوث الاعظم، و قطب العالم قدوۃ السالکین و زبدۃ العارفین ..... حضرت مخدوم الآفاقی غوث الزمانی حضرت مخدوم شیخ حمزہ قدس سرہٗ میخوانند ....."

کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"چنانچہ فقیر حقیر کہ برادر حقیقی حضرت مخدوم، چہ برادر حقیقی بلکہ خاکسار جناب و خادم صمیمی آں درگاہم از روی کمال تلطف امر کردند کہ برادرم علی رینہ، امشب ..... صحبتی از انبیا علیہم الصلوٰۃ والتحیۃ داز اولیای کبار علیہم الرحمۃ مشاہدہ کن۔ فقیر بعد تفاخر و مباہات بطور پاسبانی

بعد از نماز عشا حلقہ بر در نشستم و آہستہ بادب بندگی و عبودیت نفسی نفسی ...... کہ از قلیل ہم کمتر است دریں کتاب مسطور ساخت۔"

تذکرہ بہت ضخیم ہے، جس کا مخطوطہ ۵۵۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ کُل بارہ ابواب پر منقسم ہے، جن میں نماز، روزہ، عبادت توبہ و استغفار، اقسام لیل و نہار، نوافل اور ختم، طلب معرفت، وحدت و تصوّف، کرامات اولیائے کشمیر، حضرت مخدوم اور آپ کے خلفا کے حالات، مخدوم کے عام اور خاص مقامات، افکار اور مراقبات کی تفصیل لکھی ہے۔

حضرت مخدوم کے ایک اور ارادت مند مولوی فیروز ثانی تھے، جن کا مسلک عشق و مستی، جذب و شوق تھا۔ پیر غلام حسن نے ان کی زندگی کا ایک واقعہ درج کیا ہے کہ انھیں ایک لڑکے سے والہانہ محبت ہوگئی تھی۔ ایک دن لڑکے کو کالے سانپ نے ڈسا، جس کے زہر سے وہ فوراً مر گیا۔ مولوی فیروز نے وارفتگی کے عالم میں اس کے زخم سے زہر کو چوس لیا، جس سے لڑکا بھلا چنگا ہوگیا، لیکن مولوی کا انتقال ہوگیا۔ لڑکا ان کے غم میں یہ اشعار پڑھ رہا تھا:-

آنانکہ زہرِ عشق بخوردند و مردہ اند — در تیغِ عشق خود سرِ خود را سپردہ اند
زاں زہرِ عشق و شوقِ شرابِ لقای دوست — جاں اَبد چو خضر بیک لحظہ بردہ اند

اپنے محبوب کی آواز سن کر مولوی پھر زندہ ہوگئے اور جذب میں رقص کرنے لگے۔

حضرت مخدوم کے ایک مُرید، مولوی محمد جعفر، ایک کتاب "رموز الطالبین" کے مصنف تھے۔ اِس کتاب کے نویں باب میں انھوں نے موسیقی کی حلت اور حرمت سے بحث کی ہے، اور شرعی دلیلوں سے نغمہ و سرود اور نظارۂ حُسن کو مباح قرار دیا ہے۔

چک سلاطین کے عہد میں کچھ اہم تاریخیں بھی لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک سید علی ماگری بن سید محمد ماگری کی مختصر تاریخ کشمیر ہے۔ یہ مکمل تاریخ کشمیر نہیں، بلکہ اس کا آغاز

حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے ورودِ کشمیر سے ہوتا ہے، اور حضرت شیخ نورالدین اور ان کے خلفا کے حالات پر تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔ اس تاریخ کا واحد مخطوطہ جو، ریسرچ لائبریری، سری نگر میں محفوظ ہے، نامکمل معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے :-

"چوں بوضوح پیوست کہ تاریخ ست و سبعین و سبع مایۃ جناب سیادت پور نبوت حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی قدس سرہٗ سید حسین سامانی و حضرت سید تاج الدین سید حسین بن سید محمد کہ برادر زادہ سید شہاب الدین دریں دیار فرستادہ کہ اگر از تعلق ..... تیمور گورگان خالی باشد برای ما بنویسند تا با جمعی کہ ہمراہ ماند دراں سرزمین بیائیم"۔

"بہارستانِ شاہی" دوسری اہم تاریخ ہے، جس کے مصنف کا نام سید محمد مہدی بتایا جاتا ہے، لیکن یہ مشتبہ ہے۔ یہ تاریخ ۱۰۳۲ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کا آغاز بغیر کسی تمہید کے ہوتا ہے اور مصنف اپنے پیش رو مورخین کا حوالہ دیتے ہوئے، کشپ رشی اور جھیل کی روایت بیان کرتا ہے۔ لیکن جھیل کے خشک ہونے کا سبب وہ عام تاریخوں سے مختلف بتاتا ہے۔ لکھتا ہے :-

"در کشمیر در زمان قدیم آب بر زمین مستولی بود تا دو ہزار و دویست سال کہ آں کشپ سرمی گفتند و در ہمسائیگی آن کشپ سر مرد زاہدی متاہل بود از اہل ہند کشپ نام پس از حضرت عزت خواست زمین خشک را جہت عبادت و بود ند خود، پس حق سُبحانہٗ تعالیٰ سہ نفر از فرشتگان فرستاد امر کردہ اند واج آں آب تا خشک شد و آں قدر جای کہ آں زاہد نشیند و عبادت کند بجہت او تعین کردہ اند۔ آں زمین را بکشتل نام کردہ اند، یعنی آں سنگ تراشیدہ است"۔ ..

اختتام کا قطعہ تاریخ حسبِ ذیل ہے:۔

بحمد اللہ کہ گشت ایں نامہ مختوم ۔۔۔ بلطفِ ایزدی دانای قیوم
در احوال شہاں مُلکِ کشمیر ۔۔۔ کہ بودند از حشم ہر یک جہانگیر
بترتیبی کہ بایست بی کم و بیش ۔۔۔ نہ بر وفق خیالِ بیہدہ کیش
بہارستانِ شاہی کردہ شد نام ۔۔۔ بود در باغِ عالم تازہ چوں نام
چو تاریخ تمام ایں خُوب ارقام ۔۔۔ کہ یادا تا قیامت نیک فرجام
بپرسیدم ز عقل راست تدبیر ۔۔۔ بگفتا نامہ شاہانِ کشمیر

دسویں صدی کے اواخر میں گجرات کے ایک بزرگ، میر حیدر، کشمیر آئے اور تیلہ مولہ میں مقیم ہوگئے تھے۔ اپنے کشمیر پہنچنے کا حال جو انھوں نے اپنی تصنیف "ہدایت المخلصین" میں بیان کیا ہے، کتاب کے اقتباس میں ملے گا یہ ۹۸۲ھ کی تصنیف ہے اور اس میں راہِ سلوک کے مُبتدیوں کے لیئے اعمال، اشغال اور اذکار کی تفصیل لکھی ہے۔ اس کے علاوہ محبت، شوق، صلاح، تقویٰ اور تصوّف کے نُکات اور حضرت شیخ حمزہ کے کچھ حالات بھی اس میں درج ہیں۔

حضرت شیخ حمزہ سے اپنی ارادت مندی کے آغاز کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:۔

"بعد پانزدہ سالگی شبی در واقعہ دیدم کہ پیغامبر خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم مع چار یار باصفا رضی اللہ عنہم اجمعین در مسجد در آمدند و مارا کسی برای طلب فرستادند و پیش خود حاضر ساختند و فرمودند کہ ای فرزند اول طہارت کن۔ برخصت آں سرور علیہ السلام طہارت کردم و حضرت سرور جامہ کشیدہ بدست عزیزی داد کہ ایں جامہ ایں پسر را بپوشاں باد بخدمت بگیر کہ او از اولادانِ ما است

حوالی شما نمودیم تربیت ظاہر و باطن برین نامراد بکن۔ و آں عزیز
آں خلعت در بر من کرد و مارا بکنار گرفت و دست ہای من بوسید
و فرمود کہ ای فرزند من در کشمیر می باشم نام من مخدوم شیخ حمزہ
است انجا بیا کہ در خدمت من شب و روز حاضر باشی۔ من ترا
بفرزندی قبول کردم"۔

جب وہ خواب سے بیدار ہوئے تو اپنے ماموں سے رخصت حاصل کر کے کشمیر روانہ ہوئے۔ پہلے ماموں نے اجازت نہیں دی، کیونکہ انہیں میر حیدر سے بہت محبت تھی اور ان کا کوئی لڑکا نہیں۔ لیکن میر حیدر پر شوق غالب تھا نماز جمعہ کے بعد صحرا میں جا کر گریہ وزاری کر رہے تھے کہ ایک بزرگ گھوڑے پر سوار تشریف لائے اور فرمایا کہ اے فرزند میں وہی ہوں جس کے ذمے تجھے پیغمبر خدا نے فرمایا تھا۔ زاری مت کر۔ اگر تو چاہے تو میں اسی لمحہ تجھے کشمیر پہنچا دوں، لیکن سفر میں ثواب زیادہ ہے۔ اس کے بعد میر حیدر کشمیر روانہ ہو گئے اور تیلہ مولہ آ کر قیام کیا۔ لکھا ہے اب سب لوگ مجھے کشمیری سمجھتے ہیں۔

کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ ابتدا میں تھوڑا سا حال اپنا لکھا ہے کہ میری والدہ صحیح النسب سادات میں سے ہیں۔ کم سنی میں ماں باپ کا انتقال ہو گیا تھا، ماموں نے پرورش کی اور تعلیم دلائی۔ کشمیر آنے کے بعد حضرت حمزہ کی خدمت رہے اور روحانی فیوض حاصل کئے۔ بابا علی رینہ سے بھی انہیں عقیدت تھی۔ ۹۹۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

شیخ احمد چاگلی کامراجی، حضرت مخدوم کے ایک اور معتقد تھے، جنھوں نے رسالہ سلطانیہ مرتب کیا ہے۔ اس کی ترتیب کا ۹۸۲ھ ہے۔ رسالہ دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں اشغال اور اذکار کا بیان ہے اور دوسری فصل میں

حضرت مخدوم کی ولایت، مرتبہ اور عظمت کا حال لکھا ہے۔ اپنے اور رسالے کے بارے میں لکھتے ہیں

"امابعد اضعف عباد اللہ احقر فقیر اللہ احمد چاگلی کامراجی میگوید کہ این "رسالہ سلطانیہ" مرتب بر دو فصل است"۔

خواجہ میرم بزاز، حضرت مخدوم شیخ حمزہ کے معتقدین میں سے تھے، اور اکثر آپ کے ساتھ سفر و حضر میں رہتے تھے۔ اپنے مشاہدات "تذکرۃ المرشد" کے نام سے لکھے ہیں۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"این فقیر کلمہ چند بعبارت صریح از کیفیت حالات آنحضرت مندرج در بیاض کردہ بعضی مخلصاں کہ نسیاً منسیا این کلام باشد معلوم احوال شوند۔ چنانچہ اختفی نماند کہ روزی از ایام نشاط بر بساط انکشاف و اعدال آنحضرت تکیہ زدہ نشستہ بودند در خاطر این فقیر حقیر متصور شد کہ لفظ ہمزہ بحسب لغت ہر چند در کتب اہل سلف ملاحظہ و مطالعہ نمودیم معنیش شکستی اجل یافتیم ...... ہمیں کہ این چنیں بخاطر تکیہ متعقل شد ہمگی آن حضرت را انکشوف شد ......"

یہ رسالہ ۹۹۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔

میرم شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی "سی غزلی" مشہور ہے۔ ذیل کے اقتباس سے اندازہ ہوگا کہ شعر سے ان کے معیار بلند ہیں۔ متصوفانہ تصورات کے اظہار کے لئے عشقیہ شاعری کے اسالیب کو بڑے حسن سے استعمال کرتے ہیں۔

اشعار یہ ہیں۔

ای کردہ فراموش رہ و رسم وفا را	آموختہ آئین ستم طور جفا را
از زلف تو بر کار دلم صد گرہ افتاد	دیگر مزن ای شوخ گرہ زلف دوتا را

آئینہ انوار تجلیست جمالت | بنمائی کہ ببینیم درآں نور خدارا
از نکہت زلف تو صبا یافت نسیمی | منسوب ازآں شد دم جاں بخش صبارا
آں خطا بیہ رانتواں مشک خطا گفت | نسبت نبود با خط تو مشک خطارا
از حال دل غمزدہ مہجور نخوریی غم | رحمی بکن ای شاہ بتاں حال گدارا

حضرت شیخ حمزہ، سلطان العارفین کے ارادت مندوں میں دو بھائی خواجہ حسن قاری اور خواجہ اسحاق قاری بڑے متقی عالم تھے اور قرآنی علوم میں دستگاہ رکھتے تھے۔ دونوں قرائت اور تجوید میں مہارت رکھتے تھے۔ حضرت سلطان العارفین کے مرید ہونے کے بعد، سلوک اور عرفان الٰہی کے مدارج طے کئے اور شیوہ میں گوشہ نشین رہ کر عبادت اور ریاضت میں مشغول ہوئے۔ خواجہ اسحاق قاری حج کو بھی گئے تھے اور ڈیڑھ برس تک مکہ مقیم رہنے کے بعد وہیں انتقال کیا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

خواجہ حسن اور خواجہ اسحٰق، دونوں نے اپنے پیر کے حالات، ان کے مکاشفات اور عبادات پر بسیط کتابیں تصنیف کی ہیں۔ خواجہ حسن قاری کی تصنیف "راحت الطالبین" کے نام سے موسوم ہے، اور حضرت شیخ العالم اور اس سلسلے کے بزرگوں کے حالات میں مستند کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

خواجہ اسحاق کی تصنیف "چلچلتہ العارفین" بھی حضرت شیخ حمزہ حالات اور ملفوظات کے بارے میں مستند حوالہ کا مرتبہ رکھتی ہے۔ مصنف کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"امابعد فیقول العبد الضعیف و الفقیر الخفیف اسحاق کشمیری المعروف والمشہور بالقاری ساکن محلہ بلدیمر ہذا رسالہ المسمی بچلچلتہ العارفین کہ فرمودہ ... حضرت مخدوم حمزہ کشمیری مدظلہ کہ فقیر با

برادر عینی خود حضرت خواجہ حسن قاری وغیرہ از کمترین مریدان وخاکساران وکمترین کہترین حلقہ بگوشان بندگان خادمان آنجناب سعادت مآب است تصنیف نمودہ بطریق اختصار مرتب ساختہ بر ہفت باب منظم کرد۔"

خواجہ حسن قاری کا انتقال شیوہ میں ہوا، جہاں یہ مقیم تھے۔

بابا داؤد خاکی کی "ورد المریدین" بڑی مقبول نظم ہے، جو تصوف اور عرفان کے نکات اور مسائل سے مملو ہے۔ اس کی مقبولیت لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے مشکل مطالب کے مدنظر خود بابا داؤد خاکی نے "دستور السالکین" کے نام سے اسکی شرح بھی لکھی تھی۔ ہر شعر کے مطالب بڑی شرح وبسط کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ایک شعر کی شرح ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

چوں مشرف شد بہ صحبت ہائے او در واقعات
پس لباس صاحبی او ہمش در برشدہ است

شرح میں صحیح بخاری کی حدیث اور امن المسلمین ھو من اصحابہ کے بعد روضتہ الاحباب کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"ہر کہ آں سرور را در خواب بیند چنانست کہ در بیداری دیدہ چہ بہ صحبت رسیدہ کہ آں سرور فرمود کہ من رانی فقد رانی خان الشیطان لا یتمثلنی بے دہر کہ آں سرور را دید امید چنانست کہ آتش دوزخ نہ بیند بدلیل حدیث ......"

اسی طرح ہر بیت کی شرح میں قرآن اور حدیث کے شواہد سے مدد لی ہے۔

چک سلاطین کے عہد کے ختم کے ساتھ کشمیر میں فارسی ادب اور شاعری

کا مذہبی، متصوفانہ اور علمی کردار تبدیل ہونے لگتا ہے۔ مغلوں کے عہد میں نئے شاعر جو ایران سے ہندوستان اور کشمیر آنے لگے، ان کے ساتھ شعروادب کی کچھ نئی روایات کشمیر پہنچیں۔ سخنوروں کے ساتھ حسن وعشق کی شاعری اور ادبی اظہاروں کے جو انداز آئے وہ بعد کے شعرا کے لئے نمونہ بننے لگے۔

٭٭

RekhtaDownload.com

٦

مغل عہد

۹۹۴ھ / ۱۵۸۵ء تا ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۸ء

کشمیر پر مغلوں کے تسلط کے بعد فارسی علم و ادب اور شاعری کی ترقی کے لئے نئی راہیں کھلیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سارا تہذیبی سرمایہ جو مغلوں کی حکومت ہند کے عروج کے دور میں نشو و نما پایا اس کا حقدار کشمیر بھی بنتا گیا۔ پیر غلام حسن مورخ کشمیر اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"در حکومت شاہان مغل بازار شعر و سخن بسیار گرم بود"

یہ نیا دور مغل ناظمان صوبہ کے ساتھ آنے والے نئے ایرانی اور ہندوستان کے کچھ فارسی گو شعراء کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دور اگلے دور کے مقابلہ میں، جس میں فارسی شاعری اور تصانیف پر علمیت، مذہب اور تصوف کا اثر زیادہ غالب رہا تھا، ایک نکھرے ہوئے ادبی انداز کو نشو و نما دینے کا باعث ہوا۔ اس کا اثر فطرتاً کشمیر کے فارسی ادیبوں اور شاعروں

RekhtaDownload.com

پر بھی پڑا۔ کشمیر کے عالموں اور ادیبوں میں بعض نے جو تاریخیں لکھنی شروع کی تھیں، وہ ابتدائی دو تین صوبہ داروں کے زمانے میں مکمل ہو گئیں۔ ان میں حسن بیگ کی "منتخب التواریخ" اور حیدر ملک چاڈورہ کی "تاریخ کشمیر" قابل ذکر ہیں۔

اکبر خود ۱۵۸۹ء (م ۹۹۶ھ) میں کشمیر آیا تھا، اور باغ حسن شاہ میں جہاں اب خانقاہ نقشبندیہ ہے یا بقول ابوالفضل، کاخ یوسف خاں میں مقیم تھا۔ اس موقع پر پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ

"شعرا و بلغا، قصائد و مثنوی بہا گذرانیدند"

ان شعرا کے نام حسن نے نہیں دیئے ہیں۔ ابوالفضل نے صرف اپنے بھائی فیضی کا نام لیا ہے لیکن بہت سے ایسے علماء اور شعرا جو اکبر کے دربار سے متوسل تھے ان میں سے چند اردوئے معلیٰ کے ساتھ کشمیر آئے تھے۔ امیر فتح اللہ شیرازی نے، جو غالباً اکبر کے ساتھ کشمیر آئے تھے، کچھ عرصہ یہاں قیام کے بعد یہیں انتقال کیا۔ اکبر کو ان کے انتقال کا بڑا سخت صدمہ ہوا تھا۔ فیضی نے ان کی موت پر ایک مرثیہ کہا تھا۔ جس کے کچھ شعر یہ ہیں۔

ہیہات از وجود کامل او بود دوران را
بہ دوران جلال الدین محمد اکبر غازی
شہنشاہ جہاں را از وفاتش دیدہ پرنم شد
سکندر را شکست حسرت ریخت کافلاطوں ز عالم شد

جمال الدین انجو نے اکبر کے حکم سے اپنا لغت کشمیر میں مقیم رہ کر مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ یہ لغت ۱۶۲۲ء (م ۱۰۳۲ھ) میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور اس کے مکمل ہونے کے بعد انجو نے اسے جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ جہانگیر

نے اپنی تزک میں اس لغت کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس عظیم کام کے صلے میں انجو کو جہانگیر نے عضد الدولہ کا خطاب دیا تھا۔

اکبر کے عہد کے کشمیری علماء میں ملا محمد علی کشمیری قابلِ ذکر ہیں، جو کشمیر سے دکن گئے اور احمد نگر میں نظام شاہی امیر سعادت خاں دکھنی سے متوسل رہے۔ بعد میں وہ برہان الملک نظام شاہ کی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے۔ جب عبدالرحیم خانخاناں نے احمد نگر کو فتح کیا تو وہاں کے علماء میں اس کی ملاقات ملا محمد علی سے بھی ہوئی۔ ان کی قابلیت سے خانخاناں بہت متاثر ہوا اور انہیں اپنے درباری علماء میں شامل کر لیا۔ خانخاناں کی فرمائش پر ملا نے خواجہ سائین الدین کی تصنیف "علامۃ العلام" کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ ملا عبدالباقی نہاوندی نے "ماثر رحیمی" میں اس ترجمے کی تحسین کی ہے۔ ملا کا انتقال ملکاپور (برار) میں سنہ ۱۶۱۵ء میں ہوا۔

اکبر کے عہد میں کئی اچھے شاعر کشمیر میں تھے۔ ان میں ملا مرہمی اہمیت رکھتے ہیں۔ اکبر کے حکم سے میر محمد حسین کابلی نے ہاری پربت پر ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ صفا کدل کے قریب ایک باغ بھی بنوایا تھا، جو "باغ حسینی" کے نام سے موسوم تھا اس کے علاوہ ایک مسجد اور ایک خانقاہ بھی تعمیر کروائی تھی۔ مسجد کی تعمیر کی تاریخ مرہمی نے "حسین کنٹھ بنا کرد مسجد اولی" سے نکالی تھی۔ میر محمد حسین کے نام کے ساتھ کنٹھ یا کنٹ کا الحاق اس کنٹھ مالا کی یادگار ہے، جو اکبر نے قلعہ کی تعمیر پر خوش ہو کر محمد حسین کو عطا کیا تھا۔ میر محمد حسین کابلی کے خاندان میں میر عنایت اللہ تہمت بھی اچھے شاعر ہوئے ہیں۔

میر ابوالفتح، مشہور عالم، جو ایران سے ہندوستان آئے تھے، بعد میں شاہی لشکر کے ساتھ کشمیر آئے اور یہیں رہ گئے تھے۔ اس عہد کے جن شعراء نے کشمیر سے

باہر نام اور عزت پیدا کی، ان میں سے ایک نجمی بھی تھا۔ اس شاعر کا پورا نام معلوم نہ ہو سکا مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے "خزانہ عامرہ" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ قاسم کاہی سے وہ مشورہ سخن کرتا تھا۔ اس کی پیدائش کا سال بھی معلوم نہ ہو سکا لیکن اس کی اطلاع ملتی ہے کہ وہ ۹۸۸ھ میں کشمیر سے ماوراء النہر گیا؛ جہاں اس نے سلطان اسفندیار ابن سلطان خسرو کی ملازمت اختیار کی۔ سلطان کی مدح میں اس نے قصائد لکھے ہیں۔ اس کے ایک قصیدے کے سلسلے میں، جس کے کچھ اشعار ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں، سلطان نے اسے خلعت سے سرفراز کیا اور دو سو تنکہ کا خان مقرر کیا تھا۔ قصیدے کے کچھ اشعار حسب ذیل ہیں

چو باز صبح بر آمد ز جانب خاور	نواخت طبل اندود باز دار سحر
ز آشیاں جہاں کرد زاغ شب پرواز	عقاب چرخ ز بیضا نمود بیضہ زر
بصنع ایزد بیچوں چو بیضہ ققنس	ہمائے روز بر آورد سر ز خاکستر

منظہری کے بارے میں حسن نے لکھا ہے کہ جہانگیر نے اسے میر بحری کے عہدے پر مامور کیا تھا۔ لیکن ابوالفضل کا بیان اس کے بارے میں مرجح ہے، جس نے "آئین اکبری" میں تفصیل لکھی ہے کہ وہ عراق میں عرصے تک رہا پھر ایران، خراسان اور دوسرے مقامات کا سفر کرتے ہوئے ہندوستان لوٹا۔ ایران میں اس نے محتشم کاشی اور وحشی سے ملاقات کی تھی۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد اکبر نے اسے میر بحری کے عہدے پر مامور کیا تھا۔ میر بحری کا عہدہ، ڈل اور دوسری جھیلوں اور ندیوں کے مہتمم کا عہدہ تھا۔ اس عہدہ پر منظہری ۱۶۰۹ء (م ۱۰۱۸ھ) تک فائز رہا۔ اس کا انتقال ۱۶۱۷ء (م ۱۰۲۶ھ) میں ہوا اور سلکھا میں دفن ہوا۔

منظہری عموماً منظہر تخلص برتتا ہے۔ وہ بلا نویس شاعر تھا، تاہم وہ خوش گفتار

بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے چھ ہزار ابیات چھوڑے تھے۔ اکبر کی وفات پر اس نے جو قطعہ تاریخ کہا تھا، وہ حسب ذیل ہے۔

بادشاہ اکبر کہ پنجاہ و دو سال
عدل او ظلم زحل بیمای سوخت

مظہر از صاحب قرآں، تاریخ یافت
گفت زیں حسرت دل چغتای سوخت

مظہری کے کچھ اور شعر حسب ذیل ہیں :-

اقبال حسن، کار ترا پیش برده است
داند صلاح کار ندانسته ای که چیست

فدای آینه گردم که دل ستانِ مرا
درون خانه گلگشت بوستاں دارد

چه حالت است ندانم جمال سلمی را
که پیش دیدنش افزوں کند تمنی را

بیاست دیده مجنوں ز خویش و بیگانه
چه آشنا نگهی بود چشم لیلیٰ را

مظہری رباعی بھی خوب کہتا تھا۔ اس کی دو رباعیاں یہاں درج ہیں :-

مظہر به جہاں چو بے نصیباں می باش
وز گل بنوای عندلیباں می باش

با دیدنی از خوبی عالم می ساز
مہمان نظاره چوں غریباں می باش

در عشق به آه و ناله می باید زیست
دل کرده بغم حواله می باید زیست

آماده کفن فگنده در گردنِ جاں
کم مہلت تر ز لاله می باید زیست

خطاطی کے فن کو سلاطین کشمیر کے عہد میں بہت ترقی ہوئی تھی۔ سلاطین کے عہد کے بعد، مغلیہ دور میں بھی یہ ترقی جاری رہی اور مغل شہنشاہوں نے کشمیر کے سارے سر برآورده خوش نویسوں کی سرپرستی کی۔ اکبر کے عہد کے خوش نویسوں میں ملا میر حسن کی شہرت عروج پر تھی۔ وہ میر علی کشمیری کے شاگرد تھے۔ علم و فن سے بھی

انہیں لگاؤ تھا۔ سلاطین اپنے کتبات ان سے لکھواتے تھے۔ لیکن اس عہد کے سب سے بڑے خطاط محمد حسین "زریں قلم" تھے۔ وہ اکبر کے دربار سے منسلک تھے اور "زریں قلم" کا خطاب انہیں اکبر کے دربار ہی سے ملا تھا۔ محمد حسین مولانا عبدالعزیز کے شاگرد تھے ابوالفضل نے ان کے خط کی بہت تعریف کی، اور بعض اعتبارات سے انہیں استاد پر ترجیح بھی دی۔ بعض ماہرینِ فن کے خیال کے مطابق، ان کا درجہ، ایران کے مشہور خطاط، میر علی کے مساوی ہے۔ محمد حسین کا تعلق، جہانگیر کے دربار سے بھی رہا۔

ایک اور کشمیری خطاط علی چمن کشمیری بھی، اکبر کے دربار سے تعلق رکھتا تھا، اور اکبر نے اس کی سرپرستی کی تھی۔

شیخ احمد زاہد جو کول کے لقب سے مشہور تھے، اپنے عہد کے مرتاض بزرگوں میں سے تھے، ان کا انتقال ۱۵۸۸ء (م ۹۹۷ھ) میں ہوا۔ ان کی ساری عمر عربی اور فارسی کے علوم کی اشاعت میں بسر ہوئی۔ انہیں کے معاصرین میں شاہ ابوالفتح کلو کشمیر کے مشہور عالم باعمل اور درویش گزرے ہیں۔ ان کی نظر فقہ کے مسائل پر بہت گہری تھی، اسی لیے آخر عمر میں کشمیر کے مفتی مقرر ہوئے تھے۔ ان کی ایک تصنیف "سیف السابین" کا ذکر پیر غلام حسن نے کیا ہے، جو شیعہ عقائد کے رد میں لکھی گئی تھی۔ حسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی تالیفات اور تصانیف کثیر تھیں۔ شاہ صاحب کا انتقال ۱۵۹۱ء (م ۱۰۰۰ھ) میں ہوا۔

اس عہد کے ایک اور عالم، نورالدین عشائی بھی علم و فن کا مرکز تھے۔ انھوں نے پارہ عم کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ ان کا انتقال ۱۶۰۲ء (م ۱۰۱۱ھ) میں ہوا۔

عبدالنغی خاں قزدینی مصنف "میخانہ" کے بیان سے، اس زمانے کے ایک کشمیری شاعر غریبی کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام عبداللہ اور لقب، مزاحی تھا۔ وہ صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کا ایک شعر ذیل میں درج ہے۔

نہ اری از زلف تو از شانہ نیا مدبیروں   کہ بر آں صد دل دیوانہ نیا مدبیروں

ملا محمد امین کانی، فاضل اجل، عالم تھے۔ شاہ جہاں کے عہد کے مشہور شاعر اور عالم، ملا محسن فانی اور ملا عنایت اللہ شال ان کے شاگردوں میں تھے۔ پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ نظم و نثر میں ان کی تصانیف کثیر تھیں۔ علم فرایض کے یہ بڑے ماہر تھے اور ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا تھا۔ اس کے علاوہ متداولہ عربی اور فارسی کتابوں پر انھوں نے حاشئے بھی لکھے تھے۔ خواجہ حسن شعری نے ان کے ایک تذکرہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے انھوں نے اپنی تصنیف "گلزار خلیل" کی ترتیب میں مدد لی تھی۔ ان کا ایک منظوم کارنامہ "نظم بدیع" سنہ ۱۰۷۶ھ کی تصنیف ہے۔ اسکے علاوہ انکی "شرح تہذیب" کا تذکرہ صاحب "حدائق الحنفیہ" نے کیا ہے۔ "مناظرہ شیعہ و سنی" کے نام سے بھی انھوں نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ یہ اسلام کے جمہوری نظام کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔

مصطفیٰ از جہاں چو بیروں رفت   جانب ملک قرب بیچوں رفت
ملک بہر کسی وظیفہ نساخت   کسی از آل خود خلیفہ نساخت

ملا کانی کا انتقال سنہ ۱۰۹۰ھ میں ہوا۔

ملا عبد الرشید بتیوا، صوفی منش انسان تھے۔ بابا عثمان چھتہ بلی سے انہیں ارادت تھی، اور شاعری میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں تصوف کا عنصر نمایاں ہے، جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہوگا۔

جمال یار را دیدم درین گلزار می رقصم   چہ باشد گل کہ از مستی سر ہر خار می رقصم
خریدار غم عشقم سر سودای او دارم   گرفتہ نقد سر کف بر سر بازار می رقصم
سماع غیر رقصا ندمرا آنی بتیوا ہر دم   نہ از چنگ و نہ از بربط نہ مو سیقار می رقصم

ملا فطرتی بلند پایہ شاعر تھا۔ اکبر کے دربار میں اس کی رسائی تھی، چنانچہ اکبر نے ایک موقع پر اس کے ایک قصیدے پر بارہ ہزار روپیہ عطا کیے تھے۔

قسمت نگر کہ در خور ہر جوہری عطاست　　آئینہ با سکندر و با اکبر آفتاب
او کرد گر معائینہ خود در آئینہ　　این میکند مشاہدہ حق در آفتاب

فطرتی جہانگیر کے عہد تک زندہ رہا۔ اور خواجہ اعظم نے لکھا ہے کہ وہ غالباً ملا فہمی سے اصلاح لیتا تھا، جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

جہانگیر کے عہد میں علم و فن اور شعر و سخن کے ذوق کو کچھ اور ترقی نصیب ہوئی جہانگیر کو فارسی شاعری کا ذوق تھا اور وہ شعر بھی کہتا تھا۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ اس کی "تزک" اس کے ذوق نظر کا ثبوت ہے شعرا اور علما کا وہ قدرداں بھی تھا۔ اس کی ملکہ نور جہاں اور ملکہ کا بھائی آصف خاں سب فارسی شعر و ادب کی فضا میں پلے تھے۔ اس لئے کشمیر میں بھی جہاں جوہر قابل نظر آیا جہانگیر نے اس کی سرپرستی کی۔

جہانگیر کو کشمیر کے ساتھ اُنس، عشق کے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ اس لئے جب کبھی اسے فرصت ملتی، وہ کچھ دن کشمیر میں گذارنے کو ترجیح دیتا۔ اس کے ذوقِ نظر نے کشمیر کو بھی حسین تر بنانے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ کشمیر کے شہرہ آفاق مغل باغات ہیں۔ جہانگیر آخری دفعہ ۱۶۲۷ء (م ۱۰۳۶ھ) میں کشمیر میں قیام کے لئے آیا۔ اس وقت اس کی طبیعت ناساز تھی۔ جب سردیاں شروع ہوئیں تو اطبا کے مشورے کے مطابق وہ بادلِ ناخواستہ ہندوستان لوٹنے لگا۔ لیکن اسے کشمیر سے جو لگاؤ تھا۔ کشمیر سے بہت دور جانے نہیں دیا۔ بہرام گلہ کے قیام کے دوران اس کی طبیعت بگڑی اور وہیں انتقال ہو گیا۔ بستر مرگ پر اس کی یہ خواہش تھی کہ اسے مرنے کے بعد ویرناگ میں دفن کیا جائے۔ اس کے بارے میں اس کے جذبات کو شاعر نے اس طرح نظم کیا ہے۔

از شاہ جہانگیر دم نزع چو جستند　　باخواہش دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

جہانگیر کے ساتھ اس کے دربار سے منسلک شعرا، فیضی، طالب آملی، عرفی وغیرہ کشمیر آئے تو ان کے نغموں سے فضا گونج اٹھتی — طالب آملی نے جسے جہانگیر کے دربار میں ممتاز مقام حاصل تھا، کشمیر میں قیام کے زمانے میں کشمیر پر ایک نظم کہی تھی، جس کے کچھ شعر یہ ہیں :-

فیض پیالہ بخشد آب و ہوای کشمیر | از خشت خم نہادند گویا بنای کشمیر
کشمیر می ستانم از حق بجائے جنت | اما نمی ستانم جنت بجای کشمیر
ہر کس پئے تماشا گردند خوش فضای | رضواں فضای جنت طالب فضای کشمیر

عرفی فارسی کا سربرآوردہ شاعر، جہانگیر سے وابستہ رہا۔ کشمیر کی نزہت فزا آب و ہوا سے متاثر ہو کر، اس نے جو شعر کہا تھا، وہ زبان زد ہو گیا ہے

ہر سوختہ جانی کہ بکشمیر درآید | گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

دربار کے کشمیری علما میں جہانگیر کو ملا علی پتنگ سے لگاؤ تھا۔ ملا پست قد تھے، اس لئے جہانگیر نے انہیں ملا پتنگ کا نام دیا تھا اور وہ ملا علی پتنگ ہی مشہور ہو گئے تھے۔ ۱۰۳۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ کسی ستم ظریف نے تاریخ کہی تو ان کی پست قدی کو نہیں بھولا اور "وای پست و بلند ہمت گو" سے تاریخ نکالی۔

مولانا میر کمال الدین جو ملا کمال کے نام سے مشہور رہیں کشمیر کے عالم بے بدل تھے۔ نہ صرف کشمیر میں بلکہ کشمیر سے باہر بھی علم و دانش کی اشاعت میں وہ ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن شہری نے انہیں چنگیز خاں کی اولاد میں بتایا ہے۔ ان کے اجداد میں میر محمد علی قاضی، بڈشاہ کے عہد میں کشمیر کے قاضی تھے۔ ان کے دادا قاضی ابراہیم میرزا حیدر دوغلات کے زمانے میں سرینگر کے قاضی رہے اور والد قاضی میر موسیٰ شہید، یعقوب شاہ چک کے دور حکومت میں سرینگر کے قاضی تھے، جنہیں سرینگر کے شیعہ سنی جھگڑے میں یعقوب شاہ

کے حکم سے قتل کروا دیا گیا۔ موسیٰ شہید کے تین بیٹوں، ملا کمال، ملا جمال اور قاضی میر صالح میں سے ہر ایک علم و فضل میں امتیاز رکھتا تھا، لیکن ملا کمال کے مرتبہ کو کوئی نہیں پہنچ سکا۔

ملا کمال نے بابا فتح اللہ حقانی سے کسب فیض کیا تھا جو بابا اسمٰعیل کبروی کے فرزند تھے۔ بابا اسمٰعیل کبروی علم دین اور زہد و تقویٰ میں اپنے عہد میں سرآورد مانے جاتے تھے۔ شیعہ سنی فسادات میں، جس کا خمیازہ ملا کمال کے والد کو بھگتنا پڑا تھا، بابا فتح اللہ کشمیر چھوڑ کر سیالکوٹ چلے گئے تھے اور ان کے ساتھ ملا کمال بھی تھے۔ سیالکوٹ ایک معنی میں کشمیریوں کی نو آبادی تھی، جہاں کشمیر کے علما اور تاجر آ کر بس جایا کرتے تھے۔ ملا کمال نے یہیں علم کی تحصیل کی، اور مسجد میاں وارث میں تعلیم دینے لگے۔ ملا کمال کے فضل کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کے تین شاگرد، علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی، نواب سعد اللہ خاں علامی اور شیخ احمد سرہندی اپنے اپنے میدان میں جید علما ثابت ہوئے۔

علامہ عبدالحکیم، منطق، فقہ، حدیث اور تفسیر میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کی شہرت ہند سے نکل کر اسلامی مراکز علوم، جیسے حجاز، بخارا، مصر بلکہ مراقش اور استنبول بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ نواب سعد اللہ خاں علامی کو دہلی میں وزارت عظمیٰ کا عہدہ عطا ہوا تھا۔ ان کے علم و فضل اور تصنیف و تالیف سے دلچسپی کا حال آگے لکھا جا رہا ہے۔ تیسرے شاگرد شیخ احمد سرہندی، مجدد الف سرہندی، مجدد الف ثانی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ "مجموعات التصوف" ان کی معرکتہ الآرا تصنیف مانی جاتی ہے۔ علامہ سعد اللہ خاں، شاہجہاں کے وزیر اعظم ہونے کے بعد اس کے ہمراہ کشمیر بھی آئے تھے۔

ملا کمال نے کچھ عرصہ لاہور میں بھی قیام کیا تھا اور درس و تدریس میں

مصروف رہے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ۱۶۰۸ء (م ۱۰۱۷ھ) میں ہوا۔ کسی نے تاریخ کہی تھی۔

"ملحق حق، قطب و تاج اولیا، ملا کمال"

اس زمانے کے ایک مشہور عالم مولوی فقیر محمد بھی تھے، جنہوں نے ملاؔ کے انتقال کی تاریخ "حدیقہ فیض" سے برآمد کی تھی۔ وہ فقہ میں ایک کتاب "حدایق حنفیہ" کے بھی مصنف تھے۔

ملا حیدر علامہ نے جہانگیر کے عہد میں ایک مدرسہ مزار شعرا کے قریب گوجوارہ میں قائم کیا تھا، یہ مدرسہ درسگاہ علامہ حیدر کے نام سے موسوم تھا۔ اس درس گاہ سے عرصہ تک تشنگان علم سیراب ہوتے رہے۔ ملا حیدر خود اس میں درس دیتے تھے۔ وہ علوم دینیہ اور عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ اس درس گاہ نے فارسی علم و ادب کی اشاعت میں بہت حصہ لیا تھا۔

مہدی مشہد کا رہنے والا تھا، مغل شہنشاہوں کی علم و ادب کی قدردانی کا شہرہ سن کر ہندوستان آیا، وہاں سے کشمیر بھی آگیا تھا، جہاں اس کا قیام رہا۔ اس کا کلام کسی تاریخ یا تذکرہ میں نہیں ملتا۔ خواجہ اعظم نے لکھا ہے کہ "کلامش مقبول طبایع سخندا نیست"۔ اس کی وفات کشمیر میں ہوئی اور سنہ وفات ۱۰۲۶ھ ہے۔

ملا جوہر ناتھ یا نانت عہد مغلیہ میں کشمیر کے سربرآوردہ علما میں سے تھے۔ ان کا عروج جہانگیر کے زمانے میں ہوا۔ سلطان قطب الدین کے مدرسہ سے علوم کی تحصیل کی تھی۔ علم حدیث سے انہیں گہرا شغف تھا۔ طلب علم میں انھوں نے دور دراز ملکوں کے سفر اختیار کئے تھے۔ فریضہ حج سے بھی فارغ ہوئے، اور مکہ میں قیام کے زمانے میں ملا علی قاری ہروی اور ابن حجر مکی سے استفادہ کیا تھا

کشمیر لوٹنے کے بعد، علوم دینیہ کی درس و تدریس میں مصروف رہے اور قوتِ لایموت کے لئے اون کی کتائی کا کام کرتے تھے۔ ملا کا انتقال ۱۶۱۷ء (م ۱۰۲۶ھ) میں ہوا۔ ان کے سربرآوردہ شاگردوں میں ملا حیدر ابن خواجہ فیروز نے بھی شہرت حاصل کی۔ کشمیر سے وہ دہلی گئے تھے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے فقہ، حدیث اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ملا حیدر نے ۱۶۴۷ء (م ۱۰۵۷ھ) میں کشمیر میں انتقال کیا۔

خواجہ حبیب اللہ حبیؔ، علی شاہ چک کے عہد میں نوشہرہ میں پیدا ہوئے تھے (۹۶۳ھ ۱۵۵۵ء) لیکن ان کی شاعری کا عروج یوسف شاہ اور اس کے بعد کا ہے۔ حبیؔ نے ملا حسن آفاقی کے روبرو زانوے شاگردی طے کیا تھا اور عربی اور فارسی کی متداول کتب کا درس لیا تھا۔ بعد میں انھوں نے شیخ یعقوب صرفی کے پاس علوم کی تکمیل کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ شیخ محمد خلیفہ کے مرید ہوگئے، اور اتنی ریاضت کی کہ بہت سے لوگ ان کے عقیدت مندوں میں داخل ہوگئے، سماع سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ ایک موقع پر شہنشاہ جہانگیر جب ان کے پاس گئے تو انھیں سماع میں مشغول پایا تھا۔

حبیؔ دو کتابوں "راحت القلوب" اور "تنبیہ القلوب" کے مصنف ہیں، اور یہ دونوں کتابیں تصوف میں ہیں۔ انھوں نے سنہ ۱۶۰۲ء میں اپنے اُستاد شیخ یعقوب صرفی کی سوانح حیات بھی لکھی تھی، جو "مقاماتِ حضرت ایشان" کے نام سے موسوم ہے تھی۔ نے فارسی میں ایک دیوان بھی چھوڑا ہے، جس میں غزلوں کے علاوہ قصیدے رباعیاں اور قطعات بھی شامل ہیں۔

شاعری میں حبیؔ کا بلند پایہ ہے۔ سادہ زبان اور چھوٹی بحروں میں عمیق خیالات کو خوبی سے باندھنے میں انھیں مہارت تھی۔ انکی ایک مرصع غزل کے چند شعر ہیں۔

اے کہ بہشت بریں با تو عذابم عذاب
آتش دوزخ ہمہ با تو گلابم گلاب

گرمی شوقت چہ کرد، نرمیٔ ذوقت چہ کرد
سینہ کبابم کباب، دیدہ پر آبم پر آب

جبیؔ بے چارہ بیں اشک فشاں بر زمیں
کردہ زراہت چنیں، زدست شراب شکباب

جبیؔ کو کشمیر کے اور شعراء اور علماء کی طرح، تاریخ گوئی میں بڑا کمال حاصل تھا چنانچہ انھوں نے آنحضرت، آپ کے صحابہ اور دوسرے بزرگانِ دین کے بارے میں بڑی برجستہ تاریخیں کہی ہیں

جبی کا انتقال ۱۶۱۷ء (م ۱۰۲۷ھ) میں ہوا۔ ان کے کچھ اور شعر ہیں:

ای ہر کہ ترا یافتہ او ہر دو جہاں یافت
وہ ہر دو جہاں چیست بگو بہتر ازاں یافت

ایں دولت پائندہ کہ بخشند بعاشق
او گرچہ گدای است ولی بہ ز شہاں یافت

ای دل بگفتگوی قناعت چہ می کنی
ایں عمر خویش صرف صناعت چہ می کنی

نامہ سیہ ز گفتن بے ہودہ کردہ
در حیرتم کہ روز قیامت چہ می کنی

جبی مراد خود مطلب نامراد شد
ورنہ نخوش شرح ارادت چہ می کنی

حیدر ملک چاڈورہ کی تاریخ "واقعات کشمیر" ۱۰۲۹ھ میں مکمل ہوئی تھی حیدر ملک کا پورا نام ملک حسن بن کمال الدین ہے۔ جہانگیر کے عہد میں اس خاندان کو عروج حاصل ہوا۔ اس زمانے میں جامع مسجد سرینگر جل گئی تھی۔ جہانگیر نے اس کا معائنہ کرکے ملک حیدر کے والد، ملک محمد ناجی کو اس کی تعمیر کا کام تفویض کیا تھا ملک محمد، حبیب شاہ چک کے بیٹے یوسف خاں کے مصاحبین میں سے تھے اور جب یوسف خاں بنگالہ گیا تو یہ اس کے ساتھ گئے تھے۔ چک خاندان کے قلع قمع کے بعد اکبر اور خاص طور پر جہانگیر نے ان کی سرپرستی کی۔ ملک حیدر شیر افگن کے قتل کے شاہد عینی تھے، اور قتل کے بعد مہر النساء کو جہانگیر کے دربار میں پہنچایا تھا جہانگیر

نے ان کی اور ان کے بھائی علی ملک کی قرار واقعی قدر دانی کی اور حیدر ملک کو رئیس الملک اور چغتائی کا خطاب عطا کیا اور کشمیر کا حاکم مقرر کیا تھا۔ یہ تفصیلات حیدر ملک نے اپنی تاریخ میں بیان کی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"دراں ہنگامہ مہرالنسا را جہانگیر شاہ پیش خود طلب نمودند و اول چیزی کہ بعرض خدیو جہاں متاع رسانید این بود کہ حیدر ملک و علی ملک کشمیری ہر دو برادر خدمات خوب بجا آوردند لایق عنایت و تربیت اند آنہا را طلب نمودہ سرفراز باید کرد۔"

اپنے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"احقر مریدان اخلاص پرست حیدر ملک چاڈورہ کہ بہ لقب چغتائی سرافراز و بخطاب رئیس الملکی از ابنائے جنس ممتاز است باوجود اشتغال بخدمات شاہنشاہی خواست کہ بر سبیل ایجاز و اختصار سطری چند در بیان احوال آبا و اجداد خود کہ اہل شوکت و حشمت بودہ اند و سائرہ سلاطین و امرا ملک کشمیر صیت عن اللہ عیر سبک تقریر سمت تحریر در آورد تا احوال ایشاں از صحائف روزگار و الواح لیل و نہار محو نگردد۔"

ان کی تاریخ "راج ترنگینی" کے حوالے اور ستی سر کی روایت سے شروع ہوتی ہے اور ۱۰۲۹ھ کے واقعات پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔

جہانگیر کے عہد کے علما میں بابا نصیب الدین غازی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ وہ عام طور پر "ابوالفقرا" کی کنیت سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کا نام بعض مورخین نے بابا نصیر الدین بھی لکھا ہے۔ غازی کی ولادت ۹۷۷ھ (م ۱۵۶۹ء) میں ہوئی۔ مدرسہ ملا کمال اور ملا جمال سے علوم ظاہری کی تحصیل کی۔ اس کے بعد

بابا داؤد خاکی کے ارادت مندوں میں داخل ہو گئے۔ اپنی ریاضت کی بدولت بابا داؤد خاکی سے خرقۂ خلافت پایا۔ وہ گاؤں گاؤں گھوم کر لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ روحانی اوصاف کے ساتھ ساتھ، وہ صاحب تصنیف وتالیف بھی تھے۔ شعر و سخن سے بھی انہیں شغف تھا۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ "نورنامہ" کی ترتیب ہے۔ اس سے قبل شیخ نورالدین ریشی کے حالات سنسکرت زبان اور شاردا رسم خط میں مندرج تھے۔ ایک اور تصنیف جو "ریشی نامہ" یا "درویش نامہ" کے نام سے موسوم اور، کشمیر کے مشائخین اور بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ نصیب، کشمیر کے نام سے منسوب ہے! اور یہ بھی کشمیر کے مشائخین اور بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے اپنی تاریخ "کشمیر" کے حصہ دوم میں اس کا ذکر کیا ہے، ان کا قیاس ہے کہ یہ بھی بابا نصیب ہی کی تصنیف ہے۔

بابا نصیب الدین کی فکر شعری کا محور اخلاق اور تصوف کے مسائل تھے۔ آپ کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں۔

چہ بندی دل دریں دنیا کہ روزی چند مہمانی
کہ ناگاہ مرگ پیش آید، خوری آن دم پشیمانی
یکی اندیشہ کن، بنگر کساں بودند دریں دنیا
کجا رفتند یارانی کہ بودند مونس جانی!
تیاری کن زروزی آنکہ وقت مرگ در پیش است
چہ مغروری دریں دنیا، مگر مردن نمی دانی!

بابا نصیب الدین غازی کا بڑا اہم کارنامہ ان کی تصنیف "نورنامہ" ہے جو حضرت شیخ نورالدین ریشی کے حالات پر مشتمل ہے۔ شیخ ریشی کے حالات

پر فارسی میں یہ پہلی بسیط تصنیف ہے، جس میں حضرت شیخ العالم کی حیات، ان کے اوراد اذکار اور کشمیری شاعری کے بارے میں بڑی تفصیلات ملتی ہیں۔ سببِ تالیف کے سلسلے میں بابا نصیب الدین لکھتے ہیں۔

"اما میگوید فقر حقیر نصیب کشمیری خاکروب جمیع عزیزاں و بزرگاں و فیاضاں کہ چوں از تربیت باطن حضرت مخدوم شیخ حمزہ قدس اللہ سرۂ العزیز و لطائف ظاہر و باطن حضرت بابا داؤد خاکی نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ ... ... در طریق حقیقت و معرفت و ولایت رخصت یافت" ... ... "

آگے لکھا ہے کہ ولایت ہند کے بزرگوں کے حالات میں کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن کشمیر میں جو بزرگ گذرے ہیں، ان کے حالات جس طرح چاہئیں لکھے نہیں گئے اور یہی باعث اس تالیف کا ہوا۔

بابا نصیب الدین غازی نے طویل عمر پائی اور شاہ جہاں کے عہد تک بقید حیات رہے۔ ان کا انتقال ۱۶۳۷ء (م ۱۰۴۷ھ) میں ہوا، اور سری نگر سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر بجبہارہ میں دفن ہوئے۔

جہانگیر کے عہد میں جن شعرا کی سخن سنجیوں نے کشمیر کی فضا کو مسحور کر رکھا تھا ان میں ملا ذہنی کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ ملا ذہنی بابا نصیب الدین غازی کے معتقدین میں سے تھا۔ خواجہ اعظم لکھتے ہیں کہ شاعری کے فن میں کمال کے ساتھ ساتھ وہ تقویٰ سے بھی متصف تھا۔ نیز "در فن سخندانی در کشمیر بے نظیر بود"۔ اس نے اپنے فن کو اپنے مذہبی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا تھا۔ چنانچہ خلفائے اربعہ کی منقبت میں چار طویل قصیدے لکھے تھے۔ جب یہ قصائد لکھ کر، اس نے بابا نصیب الدین غازی کی خدمت میں پیش کیے تو انھوں نے اس کی بڑی تحسین کی۔ ذہنی کے اشعار

ہے، اس کی خودداری طبیعت اور کمال کا شعور واضح ہوتا ہے۔ کہتا ہے:

خرم دل از نعیم گلستاں کس نیم
روشن نظر ز شمع شبستان کس نیم

دانشورم ز فیض دل نکتہ دان خویش
طفل طبانچہ خورد دبستان کس نیم

کلکم ز نظم خود ہمہ شب بیت زد رقم
سرگرم انتخاب ز دیوان کس نیم

ہمت نمی فروشم و منت نمی خورم
یعنی مراد دل طلب از خوان کس نیم

مانند نکتہ سر بگریبان نشستہ ام
دست طمع دراز بدامان کس نیم

ذہنی چو آستانہ مقیم در خودم
لب تشنہ اجازت دربان کس نیم

ذہنی کی ایک رباعی بھی درج ذیل ہے :-

گر با تو کنم آرزوی دیدن گل
آمادہ نگاہ بر پرستیدن گل

آگاہ کند از جنون من بلبل را
چشمک زدن نرگس و خندیدن گل

خواجہ اعظم لکھتے ہیں :-

"ہر وقت بزم آرائی و محفل پیرائی ارباب سخن نمود"

انہیں محفل آرائیوں کے نتیجے کے طور پر اس دور میں چند اور شاعر منظر عام پر آئے۔ ان میں، مشتری، ملا محمد صالح ندیم، اور فہمی خاص طور پر نمایاں ہیں۔ پہلے دو شاعر، خود ذہنی کے شاگرد تھے۔ فطرتی، جس کا ذکر گذر چکا ہے۔ اساتذہ کے انداز میں کہتا تھا۔ اس کے دو شعر ہیں۔

از باغ و گل ہوائے دماغم فرو نشست
بای ہوس بکنج فراغم فرو نشست

پرتو فگند عشق فروغ خرد نماند
سر بر زد آفتاب و چراغم فرو نشست

یہ غزل غالباً ملا ذہنی کی محفل شعر و سخن کے لئے لکھی گئی تھی یا پھر ذہنی نے مصرع دیا تھا، جس پر اس کے شاگردوں نے طبع آزمائی کی تھی۔ چنانچہ، محمد صالح ندیم کی غزل بھی اس زمین میں لکھی ہوئی ملتی ہے۔

کہتے ہیں کہ میرزا فطرت جب کشمیر آئے تو، فطرتی سے بھی ملنے کا انہیں موقع ہوا۔ جب فطرتی کے اشعار سُنے تو کہا۔

"ہر گاہ مرا اینچنیں معلوم می شد تخلص خود فطرت نمی کردم"۔

مشتری خندہ بھون کا رہنے والا تھا، اور شعر خوب کہتا تھا۔ اس کے اشعار دستیاب نہیں ہوتے۔ خواجہ اعظم نے لکھا ہے۔ "در شعر صاحب قدرت کاملہ بود"۔ محمد صالح ندیم نوہٹہ کے باشندے تھے۔ حسن کا بیان ہے کہ ندیم کی طبیعت ایسی رسا تھی کہ بہت تھوڑی مدت میں، اپنے اقران و امثال میں ممتاز بن گئے۔ بدیہہ گوئی میں وہ بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے کچھ شعر ہیں۔

در کشور توکل غم ناک، وشاد باشد — حاصل چو شد تحمل، بیداد، داد باشد

از چشم فتنہ بارت صد جور یک اشارت — آری برائے غارت، ترک اوستاد باشد

از نفس و خصلت او دل کن ندیم یکسو — باور کن کہ بد تو نیکو نہاد باشد

ذہنی کی زمین میں لکھی ہوئی غزل کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

از آہ سرد، آتش ترا غم فرو نشست — باد بلا وزید و چراغم فرو نشست

پامال دست برد خزاں غنم ندیم — خار وگلی کہ خواست زباغم فرو نشست

حسن نے محمد صالح کا تخلص ندیم لکھا ہے۔ لیکن خواجہ اعظم دیدہ مری نے محمد صالح کا تخلص ندیم اور ندیمی، دونوں ہی بتایا ہے۔ ڈاکٹر صوفی نے ندیمی اول کا ذکر کیا ہے لیکن ندیمی ثانی کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ملا ندیمی ملا ذہنی اور ملا فصیحی کی صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ حسن کا بیان ہے کہ فطرتی، ندیمی اور فصیحی کا حریف تھا۔ فصیحی کا عروج شاہ جہاں کے زمانے میں ہوا۔ چنانچہ خواجہ اعظم نے اسے شاہ جہاں کے دور کے شعرا میں شمار کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا ندیم کی ندیمی اختیار کی تھی۔

اوجی کشمیری کا عروج آصف خاں کے زمانے میں ہوا۔ یہ آصف خاں کی مدح میں اس نے قصائد بھی لکھے تھے۔ آصف خاں کے بعد جتنے ناظم کشمیر آئے، اس کی قدر دانی کرتے رہے۔ اپنے عہد کے شاعروں میں اس کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس نے ایک ساقی نامہ نظم کیا تھا، جس میں بڑی متانت اور رنگینی تھی۔ کہتے ہیں کہ مولانا محمد صوفی جنھوں نے خود بھی ایک ساقی نامہ کہا تھا، اوجی کے ساقی نامہ کا ایک شعر:

مرا دامن خویش زنجیر شد　　　مرا دست در آستیں پیر شد

سُنا تو کہا تھا کہ:۔

"اگر ایں بیت می شنیدم ارادہ نظم ساقی نامہ نمی کردم"

اوجی صاحب دیوان تھا، لیکن اس کے ساقی نامہ کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ساقی نامہ کے چند اور شعر ہیں۔

مرا شیشہ بر دوش بالای سنگ　　　نہ یارای رفتن نہ پای درنگ

اگر فی المثل حسن صد نو بہار　　　بروید ز روی زمیں سبزہ زار

نہ جنبد ز پہلویش از سال و ماہ　　　بگہوارہ چشم طفل نگاہ

چناں در غمش دیدہ خونبار شد　　　کہ شب جای خوابم جگر زار شد

بیا ساقی آں راوق تاک را　　　ضیا بخش خورشید ادراک را

بدہ تا بدانم کہ آں نوش لب　　　چرا می گریزد ز من بی سبب

اوجی کی غزل کے کچھ شعر ہیں:۔

ہر سر کہ تشنہ در خم فتراک او بود　　　دانم یقیں کہ روزِ جزا مست خود بود

از بس خیال زلف تو در سینہ جا گرفت　　　آہی کہ سر زند ز دلم مشکبو بود

روشنی اور گلشن بھی خوش فکر شاعر تھے۔ منتری لال ذہنی کے فیض یافتہ تھے۔ وہ خندہ بہلوت

کے رہنے والے تھے۔ گلشنی شیراز سے کشمیر آئے تھے، کشمیر میں انکا قیام ہو صہ تک رہا پھر یہیں پیوند خاک ہوئے

خورم کشمیری، جہانگیر کے عہد کا شاعر تھا، اس نے مشہور کلاسیکی داستان سیف الملوک اور بدیع الجمال کو منظوم کیا تھا۔ یہ مثنوی کافی طویل ہے۔ نظم حمد اور مناجات کے بعد حضرت مخدوم شیخ حمزہ کی منقبت میں کئی شعر لکھے ہیں۔ کشمیر کے اولیا کی بھی مدح سرائی کی ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کی مدح میں بھی کچھ شعر کہے ہیں۔ خورم اپنی طرف بہت کم اشارے کرتا ہے۔ آغاز داستان سے پہلے شہنشاہ جہانگیر کی مدح میں کہتا ہے۔

اگر خورم کشیدہ سر بدورت — سخن نالائقی گفتن نزورت

کشمیر کے بزرگوں میں حضرت بابا نصیب الدین غازی کے بارے میں لکھتا ہوا کہتا ہے۔

بکشمیر آمدہ اسلام روشن — جو شد بابا نصیب الدین علم زن

اس نے قصے کو نثر سے نظم میں منتقل کیا تھا، جس کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے۔

خورم را ایں حکایت آمدہ لب — شدہ از نثر با نظمش مرتب
سر انجامش بتا ئید الہٰی — سفیدی رونما اندر سیاہی

داستان کا آغاز اس طرح کرتا ہے۔

سخن سنجان دانایان پیشیں — بو زلش آنچناں کردند آئین
بملک مصر شاہی بود خوش داں — کہ نامش شاہ عاصم ابن صفواں

آگے داستان شروع ہوتی ہے، جو مشہور قصہ ہے اس کا مخطوطہ جو کلچرل اکادمی لائبریری سرینگر میں محفوظ ہے ناقص الآخر ہے۔ اس لئے سنہ تصنیف کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ آخری شعر میں صرف مہینے کا ذکر آیا ہے۔

بشہر اتمام ایں نیکو فسانہ — ز شعبان المعظم محققانہ

قاسم خاں جہانگیر کے درباری امرا میں سے تھے۔ شعر و سخن سے بھی انہیں دلچسپی تھی اور اچھا کہتے تھے۔ ان کی فکر کے ایک دو نمونے حسب ذیل ہیں۔

زلف را گویا بمستی در شراب افگندہ
بر زبان بادہ نوشاں پیچ تاب افگندہ

چوں رنج خماری کہ با فیون بنشند
آزردہ ہجرت شود از نامہ تسلی

میرزا کرامی، عبد الغنی بیگ قبول کے فرزند۔ درویش طبیعت انسان تھے۔ دہلی کے بھی بہت سے لوگ ان کے معتقد تھے۔ صاحب ریاض الشعرا نے لکھا ہے کہ ان کے عقاید الحاد کی طرف مائل تھے۔ ان کے چند شعر ہیں۔

زحال خویش کرد آگاہ ما را
بدست آئینہ دادہ آں ماہ ما را

چو تار سبحہ در افواہ ما را
فگند ایں جسم زار از ناتوانی

لذتی کشمیری آگرہ میں رہتے تھے اور شیخ فیضی کے اُستاد تھے۔ انکے دو شعر ہیں

کہ شب با ہر کہ بنشستم سحر دیوانہ می خیزد
مگر در عشق تاثیر فسوں زافسانہ می خیزد

چہ سازم چوں کنم باد شمنی کز خانہ می خیزد
بصد خون جگر پروردہ ام ایں دل کہ شد دشمن

خواجہ محمد پارسا، خواجہ مسعود پانپوری کے بھائی تھے اور حضرت بابا شیخ داؤد خاکی کے مریدوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان کے زہد و تقوی کی وجہ سے بابا شیخ داؤد نے انہیں "پارسا" کا لقب عطا کیا تھا۔ زہد و تقوی اور فقر و فاقہ میں وہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ علم و فضل کے علاوہ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ انھوں نے ایک رسالہ "تحقیقات" کے عنوان سے لکھا تھا۔ جس میں نماز، روزہ اور اسلام کے دوسرے فرائض کے بارے میں مسائل اور احکام مفصل درج ہیں۔ "تحقیقات" سے توحید کے بیان کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"توحید ذروہ علیای احوال است و عروۃ الوثقی مقامات است

تاج ابنیا است وحلۂ اولیا ست۔ وحقایق توحید نہ ہر رہ روی کہ راہ رفت بیافت ہر کہ جواہر تمکین نیافت وبمعادن تحقیق نرسید او نہ لطفی است ونہ قہری۔"

ملا حیدر علامہ کا مشہور مدرسہ، جو درس گاہ ملا حیدر کے نام سے موسوم تھا اسی زمانے میں قائم ہوا تھا۔ اس سلسبیل علم سے بھی بہت سے طالب علم سیراب ہو کر نکلے اور ملک میں علوم دینیہ، عربی اور فارسی ادب کا ذوق پھیلانے کا باعث ہوئے۔

RekhtaDownload.com

۷

عہد شاہ جہاں

۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء تا ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء

عروج

کشمیر میں شاہ جہاں کا عہد علمی، تہذیبی اور خاص طور پر ادبی نقطۂ نظر سے بہت درخشاں رہا۔ ایران سے فارسی کے علما اور شعرا جو جہانگیر اور اس کے بعد، شاہ جہاں کی سخن پروری اور سرپرستی کا شہرہ سن کر ہندوستان آتے تھے وہ کشمیر ضرور آتے، اور بعض تو یہیں رہے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ اگلے دور میں شعر و سخن کا جو ذوق پروان چڑھا تھا، اس کی باقیات اب بھی موجود تھیں۔ لیکن شاہ جہاں کے عہد میں احسن اللہ بیگ المخاطب بہ ظفر خاں احسنؔ کشمیر میں نائب ناظم مقرر ہو کر آیا، تو اس کی سخن دوستی اور سرپرستی کی وجہ سے ایران کے تقریباً سارے اچھے اچھے شاعر اور ادیب، کشمیر آئے، ان میں کئی شعرا اور ادیب جیسے صائب، کلیم، قدسی، ایسے تھے، جن کا مقام اس عہد کے فارسی سخن سنجوں میں بلند تھا ان کے کشمیر میں قیام سے شعری اور ادبی معیار بلند ہوتے

گئے۔ احسن کے یہاں جو شعری محفلیں منعقد ہوتیں، ان میں، خوب داد سخن دی جاتی۔

احسن، نجیب الدین خواجہ ابوالحسن تربتی کا بیٹا تھا، تربت، خراسان میں ایک قریہ ہے۔ خواجہ ابوالحسن اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا اور شہزادہ دانیال کی وزارت اور دکن کی دیوانی کی خدمت اس کے سپرد ہوئی۔ جب ۱۰۲۳ھ میں ابوالحسن کو کابل کی حکومت، وزارت کے ضمیمے کے طور پر عطا ہوئی تو، احسن باپ کے نائب کی حیثیت سے کابل میں رہا۔ وہیں اس کا شعر وسخن کا ذوق پروان چڑھا میرزا صائب میر الہی، اور کچھ اور قابل ذکر فارسی شاعر اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔

۱۶۳۲ء (م ۱۰۴۲ھ) میں ابوالحسن، کشمیر کا ناظم مقرر ہوا تو، ظفر خاں احسن اس کا نائب ہو کر کشمیر آیا۔ اس سے پہلے اسے کشمیر دیکھنے کی ہوس تھی، چنانچہ ایک شعر میں اس کا اشارہ ملتا ہے۔ کہتا ہے۔

نخل مراد باغ دکن خار حسرت است   دل آرزوی دیدن کشمیر می کند

احسن کو جہانگیر کی طرح کشمیر سے عشق تھا، چنانچہ اس نے اہل کشمیر کے لئے بہت سے بھلائی کے کام کئے تھے۔ اس کے پیش رو ناظم اعتقاد خاں کے دور میں، جو محصولات عائد کئے گئے تھے اور جو نامناسب احکام جاری کئے گئے تھے احسن نے شاہ جہاں کی خدمت میں معروضہ پیش کر کے، انہیں معاف کروایا۔ شاہ جہاں کے احکام کتبے کی صورت میں اب تک جامع مسجد، سرینگر کے دروازہ پر کندہ موجود ہیں۔ احسن جس طرح قلم کا دھنی تھا تلوار کا بھی ماہر تھا۔ چنانچہ شاہ جہاں کے حکم سے اس نے تبت کو فتح کر کے کشمیر کے ساتھ ملحق کیا تھا۔ احسن کو باغ لگوانے اور میوے اگانے کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ اس نے کشمیر رقم کے

صرف سے چار باغ بنوائے تھے، جن کے نام یہ ہیں: باغ ظفر آباد، باغ گلشن، باغ عنایت، اور باغ احسن آباد اور یہ باغات خواجہ جواہر یکتا کی نگرانی میں بنوائے گئے تھے، خواجہ یکتا فارسی کے شاعر بھی تھے۔ ان باغات میں میووں کے درخت اور پھولوں کے تخم احسن نے دور دور سے منگوا کر لگوائے تھے۔ ان میں گیلاس، انگور، زمبق، امرود، گلاب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

احسن دو مرتبہ کشمیر میں ناظم رہا۔ پہلے وہ ۱۰۴۲ھ ۱۶۳۲ء میں آیا اور سات سال رہا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ ۱۰۵۲ھ ۱۶۴۲ء سے ۱۰۵۶ھ تک ناظم رہا۔ اس سے پہلے جب وہ کابل میں تھا، مرزا صائب ہندوستان جاتے ہوئے کابل سے گذرا تو احسن کی قدردانی نے اسے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ صائب کے علاوہ میرزا ابوطالب کلیم بھی، کابل میں احسن کے ساتھ رہا۔ کابل میں شعر و سخن کی محفلیں گرم رہا کرتی تھیں اس زمانے میں نادم گیلانی، صوفی شیرازی، صوفی ہمدانی اور ملا رفیعی احسن کی صحبتوں کی رونق تھے، ایک اور سخنور باکمال حکیم یوسف الدین بھی اس کی محفلوں میں شریک رہتے تھے۔ کابل کی صحبتوں نے احسن کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ چنانچہ کشمیر آنے کے بعد بھی جب کبھی کابل کی یاد ستاتی تو کہہ اٹھتا تھا۔

گرچہ احسن گلشن کشمیر رشک جنت است
مرغ روح من بشوق باغ کابل می پرد

دکن میں احسن کا جی نہیں لگا، اس کا اندازہ اس کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

بیتواند آتشی از خشک و تر از نالہ زد
در دکن احسن چو یاد گلشن کابل کند

دکن میں صائب، اور ابوطالب کلیم، احسن کے ساتھ تھے۔ پھر جب وہ کشمیر آیا تو، یہ دونوں اور میر الٰہی اس کے ہمراہ کشمیر آئے۔ کشمیر میں احسن نے رفاہ عام کے کام کئے تھے، ان میں سے اس کا ایک اہم کارنامہ جامع مسجد کی دوبارہ تعمیر تھی۔

احسن کو کشمیر سے جو عشق تھا، اس کے سبب سے وہ کشمیر کی تعمیر اور تزئین

میں کوشاں رہا۔ اس کے دل میں کشمیر کی فلاح کا جیسا خیال تھا اس کا اندازہ ان دو اشعار سے ہو سکتا ہے۔ کہتا ہے :

اگر فرصتم بخشد م روزگار
کنم رشک فردوس کشمیر را

بہشت بریں از شما زاہداں
بہ احسن گذارید کشمیر را

مادی تعمیر کے ساتھ ساتھ کشمیر کی کچھ ذہنی تعمیر بھی احسن کے ہاتھوں ہوئی۔ اسے شعر و سخن کا جو ذوق ابتدا سے تھا اس میں کشمیر آنے کے بعد، اور بھی ترقی ہو گئی۔ محفل آرائیوں کا وہ سلسلہ جو اس کے کابل سے نکلنے کے بعد موقوف سا ہو گیا تھا، یہاں دوبارہ شروع ہوا۔ ان محفلوں میں سخن سنجیوں اور سخن آرائیوں کی خوب داد دی جاتی تھی۔ کشمیر آنے سے پہلے اس کا ایک مختصر سا دیوان مرتب ہو چکا تھا، لیکن کشمیر میں قیام کے زمانے میں، حکیم صدرا جو مسیح الزماں کے خطاب سے مخاطب تھے کشمیر آئے تو ان سے احسن کے گہرے مراسم ہو گئے۔ وہ بڑے سخن فہم تھے، اور شعر کی پرکھ میں انہیں استادی کا درجہ حاصل تھا۔ احسن نے اپنا دیوان ان کی خدمت میں پیش کیا اور ان کی اصلاح کے بعد ایک بسیط دیباچے کے ساتھ از سر نو دیوان مرتب کیا۔

احسن نے غزل میں اساتذہ کا انداز پیدا کر لیا تھا۔ صائب کہتا ہے کہ اس کے فن کی تربیت ظفر خاں کے فیض صحبت سے ہوئی۔ چنانچہ اس شعر میں وہ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے :-

ہر کہ چوں من از ظفر خاں یافت فیض تربیت
می رسد گر در سخن دعوای خاقانی کند

دوسری طرف احسن کو اعتراف ہے کہ اس کو صائب سے فیضان حاصل ہوا کہتا ہے۔

طرز یاراں پیش احسن بعد ازیں مقبول نیست
تازہ گوییہای او از فیض طبع صائباست

احسن کی غزل کے کچھ شعر یہاں درج ہیں۔

یک دستہ گلسنت نگارم ز باغ حسن — حسن آفریں بدست خود ایں دستہ بستہ است

احسن ز روزگار کنی شکوہ تا بد کنی — آنرا کہ نیست خاطرش از غم فگار کیست

بلبل فغاں بیہدہ در باغ می کنی — یک نالہ بہر سوختن آشیاں بس است

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چرا ست — از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است

اپنی مثنویوں میں احسن نے کشمیر کے مناظر اور اپنے بنوائے ہوئے باغات کے علاوہ باغ نشاط، باغ فرح بخش (شالیمار) قیصر ناگ (کوثر ناگ) سوکھ ناگ اور ڈل کے مناظر کی بھی تعریف کی ہے۔ کشمیر کے سفر کی سات منزلوں کی خصوصیات پر جو مثنوی "ہفت منزل" کے نام سے اس نے لکھی تھی، اسے شاہ جہاں کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

احسن کا کلیات، کشمیر، کے سبزہ زاروں، آبشاروں اور باغات کی توصیف کے اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ مثنوی "ہفت منزل" میں اس نے کشمیر کے مختلف منازل کی بڑے شاعرانہ انداز سے تفصیل بھی دی ہے۔ اس مثنوی میں اپنے "گل زار بنر گل" کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

بگل آنسر زمین یکسر منقش است — در آں جا یابی مستغنی ز کفش است
نہی چوں پا ی بر تخت سلیمان — شود کشمیر و دشت او نمایاں

نخست از حسن این گلزار مجمل بگویم چند بیت آنگه مفصل
شود برگ گل آن کاغذ که تحریر کنی بر صفحه او نام کشمیر
قلم در وصف این گلریز پر گل زبانی خواہد از منقار بلبل

جو شعرا اور علماء قیام کشمیر کے زمانے میں احسن کے ساتھ منسلک رہے تھے ان کی تفصیل، خود اس نے اپنے دیوان کے دیباچے میں دی ہے۔ پہلے دور میں، صائب اور میر الہٰی کے علاوہ، مولانا حیدر رخصالی، قاضی ابوالقاسم المعروف بہ قاضی زادہ، محمد مقیم جوہری، میر معصوم کاشانی، ابو طالب کلیم، میرزا جلالہ طباطبائی، مولانا رد نقی ہمدانی، مولانا روشنی احمد، اور محمد جان قدسی اس کی شعرو سخن کی محفلوں کے روح رواں تھے۔

دوسرے دور کے شعرا اور علماء ہیں، میرزا حسین، ملا منعمی، وحشی، انسی، میرزا ابوطالب کلیم، میرزا محمد قزوینی، سید صوفی اور میر محمد باقر علوی کے نام احسن نے لئے ہیں۔ محمد جان قدسی بھی اس زمانے میں کشمیر میں موجود تھے۔

صائب کا حصہ احسن کے مذاق شعری کی نشوونما میں خاصہ رہا تھا، صائب کو احسن سے گہرا لگاؤ تھا، اس کی مدح میں صائب نے جو قصیدے لکھے ہیں، ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک شعر میں وہ احسن کو عبدالرحیم خانخاناں پر بھی ترجیح دیتا ہے۔ کہتا ہے۔

خانخاناں را بہ بزم و رزم صائب دیدہ ام در سخا و در شجاعت چوں ظفر خان نیست

صائب اچھا غزل گو بھی تھا، اس کا کلیات چھپ چکا ہے۔ ایک قصیدہ جس میں ظفر خاں کی مدح سرائی کی ہے اس کا مطلع ہے

بحر طبعم در سخن چوں گوہر افشانی کند
در صدف گوہر ز خجلت چہرہ مرجانی کند

اس قصیدہ میں احسن کی فیض بخشیوں کی طرف اس طرح اشارہ کرتا ہے۔

دست گوہر بار او نگذاشت در روی زمیں　　　اشک در چشم یتیمی سبحہ گردانی کند

احسن کو انشا پردازی میں بھی مہارت تھی۔ اس نے اپنے دیوان کا جو دیباچہ نثر میں لکھا ہے، وہ اس کی انشا پردازی کی صلاحیتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ انشا میں احسن اپنے عہد کے مہر آور دہ انشا پردازوں، خاص طور پر میرزا جلالہ طباطبائی، ظہوری اور کسی حد تک ملا طغرا سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس کے دیباچے سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے، جس میں اپنے کشمیر میں تقرر کا تذکرہ کرتا ہے۔

"در تمادی ایں ایام آفت عین الکمال باحوال ساکنانِ کشمیر جنت نظیر راہ یافت و نسیم قہر الٰہی برآں مرز بوم گذر انداخت۔ انواع قصور و تفرقہ و فتور، بجمہور متوطنان آں بلدہ رسید و گلشن ہمیشہ بہار آں دیار از صرصر قہر ایزدی بافسردگی مبدل گردید۔ فرمان عاطفت از مکمن عنایت پادشاہ دشمن گداز رعیت نوراز بہ نام ایں خیرخواہ خلق اللہ صادر گردید کہ بکشمیر رفتہ بجبر تنگنگیہای خلایق پرداز ... ..."

صائب کے علاوہ دوسرا اہم شاعر، جو احسن کے ساتھ کشمیر آیا تھا، میر الٰہی تھا۔ میر الٰہی کا پورا نام میر عماد الدین محمود الٰہی حسینی ہے، لیکن وہ میر الٰہی کے نام سے زیادہ مشہور رہے۔ وہ ایران کے ایک نجیب سادات خاندان سے تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد شاہ جہاں کے دربار میں اس کی رسائی ہوئی اور شاہ جہانی دربار کے شعرا میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ شعر و سخن کے قدردان ہونے کے اعتبار سے، ظفر خاں احسن سے بھی اسے لگاؤ تھا۔ اسی لئے جب احسن کشمیر روانہ ہونے لگا تو، شاہ جہاں سے درخواست کر کے، اس کو اپنے ساتھ کشمیر لایا تھا۔ لکھا ہے کہ جب ظفر خاں کشمیر روانہ

ہو رہا تھا، تو شاہ جہاں نے اپنے سر دفتر سے کہا تھا کہ ظفر خاں سے اہل کشمیر کو خوش رکھنے کی ضمانت لیں۔ میر الٰہی اس وقت دربار میں حاضر تھا۔ برجستہ جواب دیا "خدا ضامن رسول و چار یارش" میر الٰہی عرصہ تک کشمیر میں رہا اور یہیں اس کا انتقال ہوا۔

کشمیر میں اخوند ملا شاہ بدخشی سے جو دارا شکوہ کے پیر طریقت تھے اور شعر و سخن میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے میر الٰہی کی نوک جھونک رہی تھی۔ ملا شاہ کی یہ بیت آب طلا سے کتابے پر لکھی گئی تھی۔

پادشاہی راگذار و دست آگاہی گزیں ۔۔۔ چوں بہ آگاہی رسیدی ہر چہ میخواہی گزیں

میر الٰہی نے جب یہ بیت پڑھی تو اس کے نیچے یہ بیت لکھ دی جس پر ملا شاہ بہت ناراض ہوگئے

من نمی گویم گدائی یا شہنشاہی گزیں ۔۔۔ خویش را مگزیں و دیگر ہر چہ میخواہی گزیں

میر الٰہی کی طبیعت غزل، قصیدہ، رباعی اور مثنوی سارے اصناف شعر میں رواں تھی اور اسے اساتذہ کا رتبہ حاصل تھا۔ اس کی غزل کے کچھ شعر درج ذیل ہیں۔

چشمت از ہر گردشی با یار عہد تازہ بست ۔۔۔ خط شکیمت کتاب حسن را شیرازہ بست
نشہ از تندی ندارم گرچہ چاک سینہ ام ۔۔۔ چوں خمار آلودہ تواند لب از خمیازہ بست

کشمیر کی تعریف میں اس نے ایک مثنوی لکھی ہے، جس میں کشمیر کے میووں، خاص کر سیب، بادام، توت بیدانہ، آلوچہ، گیلاس، زرد آلو، شفتالو، سبز آلو، آبشار، حوض (جھیل) باغ فرح بخش قصر عالی، اور نہروں کی تعریف کی ہے۔ چنار کا حسن بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں رہا چنانچہ اس کی تعریف میں کہتا ہے

چنارش چوں ز ساعد افگند ظل ۔۔۔ شود در گردن جوزا حمایل
بہر شاخش بساق عرش پیوند ۔۔۔ بشاخ گاؤ و ماہی ریشہ اش بند
بفرق آفتاب از مہربانی ۔۔۔ زہر برگی کشیدہ سائبانی

میر الٰہی کا انتقال کشمیر میں ہوا اور سنہ انتقال ۱۰۶۳ھ / ۱۶۵۲ء (م ۱۰۶۳ھ) ہے۔ پیر غلام حسن نے لکھا ہے، میر الٰہی ایک تذکرے کے بھی مصنف تھے۔

حاجی محمد جان قدسی کا وطن مشہد تھا، جہاں سے وہ ہندوستان آئے اور شاہ جہاں کے دربار میں باریاب ہوئے۔ شاعری میں ان کے کمالات نے انہیں جلد ہی ملک الشعرا کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔ غزل اور قصیدہ میں قدسی اُستاد مانے گئے ہیں۔ شاہ جہاں نے ان کو اور مرزا ابو طالب کلیم کو "بادشاہ نامہ" کے منظوم کرنے کے لئے مقرر کیا تھا یہ شاہان چغتائیہ کی منظوم تاریخ ہے۔ اور "شاہ نامہ شاہان چغتائیہ" کے نام سے بھی موسوم ہے۔ اس کی تکمیل سے قبل قدسی کا انتقال ہو گیا۔ اور ابو طالب کلیم نے اسے مکمل کیا۔

کشمیر کی تعریف میں انھوں نے جو مثنوی لکھی تھی، اس میں راستے کی دقتوں کا حال اس طرح بیان کیا ہے۔

بود قطع رہ کشمیر مشکل　　بجز نتواں رسید از راہ باطل
مگر زیں راہ باریکت خبر نیست　　کہ گوئی کوہ را موئی کمر نیست
ز بیم ایں رہ باریک و خونخوار　　نہاں موی کمر در دیدہ خار
گروہی دست از جاں بر فشاندہ　　دریں رہ چوں گرہ در تار ماندہ
رہ فتح از [illegible] کشمیر [illegible] است　　کہ گام اول او ترک دنیا است
ازیں رہ چوں تواں آساں گذشتن　　کہ گام اول است از جان گذشتن

لیکن جب مسافر کشمیر پہنچ گیا تو جو ہوش ربا مناظر پیش نظر ہوتے ہیں، ان کے بارے میں کہتے ہیں۔

خوشا کشمیر و خاک پاک کشمیر　　کہ سر بر زد بہشت از خاک کشمیر
چہ کشمیر آبروی ہفت کشور　　نگاہ از دیدن او تازہ و تر

چہ کشمیر آبروی باغ و بستاں ‏ اسیر ہر نہالش صد گلستاں
سوادش سرمۂ چشم بہار است ‏ بہشت و جوی شیرش آب لار است
بود نشو و نما این جار واں را ‏ بہار دیگر است این بوستاں را

قدسی غزل کے بھی اساتذہ میں سے تھے۔ ان کے کچھ شعر ہیں۔

بارم نشستہ تازہ در دل نگاہ کیست ‏ روزم سیاہ کردۂ چشم سیاہ کیست
دل دادن و سخن نہ شنیدن گناہ من ‏ دل بردن و نگاہ نہ کردن گناہ کیست

جوانی رفت و داغی ماند بر دل یادگار ازوی
چوآں سُرخی کہ بر ناخن پس از رنگ حنا بندد

اگر دستم دہد روزی بجیب زاہدِ خود بیں ‏ چو شمع آرم بروں یکدستہ زنار از گریبانش

قدسی کا انتقال ۱۰۵۶ھ میں ہوا اور مزارِ شعراء میں دفن ہوئے۔

قدسی کے معاصرین میں بہشتی بھی ایک خوش فکر سخن گو تھا۔ اس نے بھی کشمیر کی توصیف ایک مثنوی میں کی تھی، جس کے کچھ شعر ہیں۔

بود زیں گونہ در آفاق کم شہر ‏ کہ ہم باغ است و ہم دریا و ہم شہر
ز خانہ تا بکشتی پا نہادی ‏ میان سبزہ و گل او فتادی
دو دریا دارد ایں شہر دل افروز ‏ دو عالم زیں دو باشد عشرت اندوز
ز آبش تازہ میگر دد روانہا ‏ بہشت جاری است نامش بر زبانہا
دگر یک دل کہ دل شد بیقرارش ‏ ز خوبی شہر دارد در کنارش

قاضی ابوالقاسم، قاضی زادہ کے نام سے مشہور تھے۔ احسن نے لکھا ہے کہ:
شاہ جہاں کے عہد میں کشمیر کی بخشی گری کا عہدہ ان کے سپرد تھا، اور پیر غلام حسن

کے بیان کے مطابق وہ کشمیر کی دیوانی پر مامور تھے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بارے میں حسن لکھتے ہیں۔

"درسائر علوم، خصوصاً در نظم و نثر سحر کاری می نمود۔"

ابوالقاسم کا انتقال کشمیر میں ہوا اور مزار شعرا میں دفن ہوئے۔ پیر غلام حسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ" سد قاضی زادہ " انہیں کا بنوایا ہوا ہے۔ ان کے کلام میں سے صرف ایک شعر دیا ہے، جو ذیل میں منقول ہے۔

سر موی بہ غلط در ہمہ اندامم نیست   خالی از ذکر تو عضوی چہ حکایت باشد

قاضی ابوالقاسم کے فرزند قاضی محمد عارف بھی شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے، اور شاہ جہاں کے دربار میں انہیں رتبہ حاصل تھا۔ وہ سفیر کی حیثیت سے ایران بھی بھیجے گئے تھے۔ ان کا کچھ کلام ذیل میں منقول ہے۔

نہ از آں دیر تربہ بخشد کام   کہ دہد جلوہ کبریائی را

زآں توقف کند کہ دریابی   ذوق دریوزہ گدائی را

ان کی ایک رباعی ہے۔

خواہم کہ ازیں تشبیب و پستی برہم   وز ننگ خودی و خود پرستی برہم

یک جرعہ زجام نیستی نوش کنم   از کشمکش خمار ہستی برہم

حکیم صدرا مسیح الزماں، ظفر خاں کی نظامت کے زمانے میں کشمیر آئے تھے اور یہاں دو سال تک ان کا قیام رہا تھا۔ ظفر خاں ان کی صلاحیتوں اور علمی اور ادبی ذوق سے بہت متاثر تھے اور ان کا تذکرہ دیوان کے دیباچے میں بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ حکیم مسیح الزماں شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

میرزا ابو طالب کلیم، ایران سے ہندوستان آنے کے بعد کچھ عرصہ تک دکن میں مقیم رہے، پھر دہلی آکر شاہ جہاں کے دربار میں باریاب ہوئے۔ شاہ جہاں کے دربار سے

انہیں ملک الشعرا کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔ آخری زمانے میں، جب ظفر خاں کشمیر کا ناظم تھا، شاہ جہاں نے "پادشاہ نامہ" نظم کرنے کے لئے قدسی کے ساتھ انہیں بھی متقرر کیا تھا۔ کلیم کا انتقال کشمیر میں ہوا اور مزار شعرا میں دفن ہوا۔ غنی کاشمیری نے وفات پر ایک قطعۂ تاریخ کہا تھا، جس کے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

حیف کز دیوار این گلشن پرید | طالبا، آن بلبل باغ نعیم
رفت و آخر خامہ را از دست داد | بی عصا طے کرد این رہ را کلیم
اشک حسرت چوں نمی ریزد قلم | شد سخن از مردن طالب یتیم
عمرہا در یاد او زیر زمین | خاک بر سر کرد قدسی و سلیم
عاقبت از اشتیاق یک دگر | گشتہ اند این ہر سہ در یکجا مقیم
گفت تاریخ وفات او غنی | طور معنی بود روشن از کلیم

کلیم کے انتقال کا سنہ ۱۰۶۱ہ ہے۔ اس سے پہلے قدسی اور سلیم وفات پا چکے تھے اور مزار شعرا میں دفن ہوئے تھے۔ غنی نے اسی کی طرف قطعہ میں اشارہ کیا ہے۔

کلیم کی تصانیف بہت سی ہیں۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی میں اسے مہارت تامہ حاصل تھی۔ اس کی غزل کے کچھ شعر ہیں۔

تا شد مژہ بی اشک فتاد از نظر من | اکنوں چکنم رشتہ کہ وقتی گہری داشت

میان غم گساراں سوزم از غم | چوں آں کشتی کہ در دریا بسوزد

وضعی بہم رساں کہ ببازی بعد ملی | با ہمتی کہ از سر عالم توان گذشت
بدنامی حیات دو روزہ نبود بیش | گو بیذترا کلیم کہ آہم چیاں گذشت

مولانا حیدر خصالی اپنے عہد کے قابل ذکر شعرا اور علماء میں سے تھے۔ ہرات کے قریب ایک قریہ، کارنہ ان کا وطن تھا۔ ان کے بھائی مولانا وجہی بھی پایہ کے عالم تھے، جن سے خصالی نے تعلیم حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ وہ صفوی شہزادہ میرزا اسمعیل کے اُستاد بھی رہے تھے۔ عنفوان ہی میں وہ ہندوستان آئے اور پہلے مہابت خاں کے متوسلین میں شامل رہے۔ پھر ظفر خاں سے وہ منسلک ہوئے اور کشمیر آئے۔ شعر و سخن میں ان کی دستگاہ کا اندازہ ان کی غزل کے ذیل کے اشعار سے ہو گا۔

دی نگاہم چو صبا بر گل آن نر و میگشت	دل چو سحر ازپی آں نرگس جادو میگشت
شب بسر گشتگی فکر توام چشم پُر آب	ہمچو گرداب بر آئینہ زانو میگشت

مولانا خصالی بھی کشمیر کی حسین فضاؤں کے دلدادہ تھے اور کشمیر کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی تھی جس کے کچھ شعر یہ ہیں:

سحر گہ بلبلی می کرد تفسیر	ز سنبل آیتی در شان کشمیر
کہ اے جنت بہ پیش قیمتت سہل	بیا کشمیر را دریاب، نااہل
کہ ازبس سبزہ صحنش جنتی شد	بود شگفتہ ہر کوہ او قصہ زرد
نہالش را رطوبت در کنار است	گلشن را خون بلبل آبیار است

میرزا محمد قلی سلیم، شاہ جہاں کے عہد میں ایران سے ہندوستان آئے اور عرصہ تک نواب اسلام خاں کی ملازمت میں بسر کی۔ اس کے بعد ظفر خاں کے زمانے میں کشمیر آئے تھے۔ اور یہیں انتقال کیا۔ ان کا شمار بھی فارسی کے سربرآوردہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ غزل اور قصیدہ کے علاوہ سلیم نے کئی مثنویاں بھی لکھی ہیں، جن میں سے ایک مثنوی قضا و قدر کے نام سے مشہور ہے۔ ایک مثنوی کشمیر کی تعریف میں بھی لکھی تھی، جس کا اقتباس ذیل میں مندرج ہے۔

تعالی اللہ دریں باغ خدائی	کہ گرد دست از خاکش خدائی

فضایش چوں بساط نیک بختاں   پر طوطی در و برگ درختاں
بپای گل ز موج سبزہ زنجیر   نگویم سبزہ خواب شال کشمیر
بصحرایش گل و لالہ ہم آغوش   بباغش سرو سبزہ دوش بر دوش

سلیم غزل بھی اچھی کہتے تھے اور صاحب دیوان تھے ۔ ان کی غزل کے چند شعر یہ ہیں ۔

دل چو شد گرم ز می جلوہ معشوق کند   ماہی موم بہ آتش چو رسد آب شود

تواں از دانہ ہائے سبحہ دانست   کہ دلہا را بہ دلہا راہ باشد

سلیم کا انتقال کشمیر میں ۱۰۵۷ھ میں ہوا اور مزار شعرا میں دفن ہوئے ۔

میرزا محمد مقیم جوہری کا تذکرہ بھی احسن نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے ۔ وہ اچھے عالم، سخن فہم اور سخن سنج تھے، اور اکثر احسن کی ادبی اور شعری مجلسوں میں شریک رہا کرتے تھے ۔ چنانچہ احسن کہتا ہے ۔

بشگفد دل ز صحبت معصوم   صائب احسن گواہ حال من است

میر معصوم کاشانی، مرزا رفیع الدین حیدر معمائی کے بیٹے تھے اور وہ بھی فکر شعر میں امتیاز رکھتے تھے ۔ شاہ جہاں کے زمانے میں وہ ہندوستان آئے اور کچھ عرصہ دکن میں بھی گزارا تھا ۔ غالباً احسن سے ان کا تعارف دکن ہی میں ہوا تھا ۔ احسن کے ساتھ وہ کشمیر آئے ۔ ان کا ایک شعر ہے ۔

نوا ز سنجاف داری طوق من از آہن ای قمری
ببیں سرو تو بیرحم است یا سرو من ای قمری

مرزا جلال الدین، جو جلالہ طباطبائی کے نام سے مشہور ہیں، جب کشمیر آئے تو احسن کے دربار سے منسلک رہے وہ بھی احسن کی ادبی اور شعری محفلوں میں شریک

رہتے تھے۔ جلالہ طباطبائی نے احسن کے دیوان پر ایک تقریظ بھی لکھی ہے جو ان کے مجموعے "رشحات طباطبائی" میں بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ششش فتح کانگڑہ بھی ان کی یادگار ہے۔

مولانا رونقی احمد ہمدانی، مولانا شیرازی کے شاگرد رشید تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد، خواجہ ابوالحسن کے متوسلین میں شامل ہوئے۔ شعر اور خاص طور پر غزل خوب کہتے تھے، طبیعت میں روانی ایسی تھی کہ ساڑھے تین ہزار اشعار کا مجموعہ فراہم کر لیا تھا۔ ان کے چند شعر ذیل میں درج ہیں۔

نیستم محتاج ذرستی چو میخواراں بہ ابر
من بچشم خویش دل خوش دارم و یاراں ز ابر

بغیر بوسہ نگیرم بدست ساقی جام
شراب بے مزہ چوں آب ناشتا باشد

ای ہر تغافلی ز تو پرسیدن دگر
پنہانی از نگہ بمنت دیدن دیگر
ازبس کہ جنگ جوئی بود بیشتر ز صلح
خواہی وسیلہ از پی رنجیدن دگر

احسن کے دوسرے دور نظامت میں، محمد جان قدسی کشمیر میں موجود تھے۔ قدسی کے علاوہ نسبتی، وحشی، انسی، میرزا محمد قزوینی، میر محمد باقر علوی، سید صوفی ملا رفیعی، ملا معنی کشمیری اور میرزا محمد حسین احسن کے ہم صحبت رہے۔

انسی ابلی کے بارے میں صاحب نتائج الافکار کا بیان ہے۔

"کلامش پر درد و سراپا سوز است"

اور یہ شعر اس کا نقل کیا ہے۔

من خفتہ و آہ گرم بیدار
چوں شمع کہ بر مزار سوزد

نسبتی تھانیسر کے رہنے والے تھے اور صوفی منش انسان تھے۔ کہتے ہیں کہ شہزادہ

دارا شکوہ نے انہیں اپنے یہاں بلوایا تھا، جس کے جواب میں انھوں نے یہ شعر لکھ بھیجا تھا۔

نمی پرم بہ پروبال عاریت چوں تیر
نشستہ ام چو کماں روز و شب بہ خانۂ خویش

سراج الدین علی خاں آرزو نے "مجمع النفائس" میں لکھا ہے کہ ان کا دیوان پندرہ ہزار ابیات پر مشتمل تھا۔ احسن کو ان سے عقیدت تھی اور سلوک سلوک کیا کرتا تھا مولانا کا انتقال سنہ ۱۰۵۱ھ میں ہوا۔

ملا معنی کشمیری، اور وحشی بھی اُن کے ہم صحبتوں میں سے تھے۔ میر معصوم کاشانی دکن میں کچھ عرصہ گذارنے کے بعد بنگال کے صوبہ دار اعظم خاں کے پاس چلے گئے۔ میرزا کلیم سے ان کے گہرے روابط تھے۔

میر محمد باقر علوی، سید صوفی اور میرزا محمد قزوینی کے بارے میں احسن نے لکھا ہے کہ بیس سال سے میرے ہم جلیس ہیں۔ میرزا محمد حسین، معقول اور منقول کے سر برآوردہ عالم تھے۔ ملا معنی کشمیری، قوت سامعہ سے محروم تھے لیکن شعر بہت اچھا کہتے تھے۔ "نتائج الافکار" کے مرتب نے ان کا ایک شعر نقل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے۔

صدای دل طپیدن از شکست رنگ می آید
زبان خامشی در پردہ رسوا می کند مارا

ملا طغرای مشہدی، فارسی کے صاحب طرز انشاپردازوں میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ احسن کے بعد شہزادہ مراد بخش جب کشمیر کا ناظم مقرر ہوا تھا تو یہ اس کی مصاحبت میں رہے۔ ان کے کشمیر آنے کا سبب قاضی ابو القاسم ہوئے تھے۔ احسن کے دوبارہ ناظم مقرر ہو کر کشمیر آنے کے بعد طغرا ان سے منسلک ہو گئے تھے۔ خواجہ محمد اعظم نے لکھا ہے طغرا رینہ واری میں رہتے تھے اور دیوانوں کی طرح ایک دوکان پر بیٹھے رہتے تھے۔ شاعری کے سوا کوئی شغل نہیں تھا۔ طغرا نے شہزادہ

مراد بخش کی مدح میں قصیدے بھی کہے تھے وہ غزل بھی کہتے تھے۔ لیکن ان کے رقعات جو رسائل ملا طغرا کے نام سے موسوم ہیں اور جو ان کے مخصوص مرصع اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ کلاسیکی فارسی کا اہم کارنامہ مانے جاتے ہیں۔

ملا طغرا ہندوستان میں کافی پریشانیاں اُٹھانے کے بعد کشمیر آئے تھے، چنانچہ ایک رباعی میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔

در تیرہ زمین ہند دلگیر شدم   وز غصہ ایں خاک بسہ پیر شدم
شاید بکفم گل جوانی آید   در فصل بہار سوی کشمیر شدم

ایک اور رباعی میں کشمیر کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد، کشمیر کی آٹھ منازل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ کہتے ہیں:

در منزل کہ راین تازہ سرشت   گشتہ گل و بادہ جانشین گل و خشت
با آنکہ رہش ہزار طولی دارد   ہستا ہشت منازلش چو باغات بہشت

اپنے منشآت میں بھی کشمیر کی طرف جگہ جگہ اشارے کئے ہیں۔ ذیل میں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"اول از ... ہوایش غنچہ دل از پژمردگی وارستہ و بنشاط پیمای فضائش غم بی برگی از میان بکنار نشستہ۔ نسیم کوہسارش پلنگ طبعاں را بفکر نرم خوئی انداختہ و شمیم اشجارش منقلب مزاجان را دارو شناس اعتدال ساختہ۔ تا پیر خرد اہل نیبر را با مردم ایں مکان نسنجیہ بمعنی لا یستوی اصحابُ النّار و اصحابُ الجنہ نرسید۔"

ملا طغرا ایک مخصوص انداز نثر کے ادیب تھے، اسی لئے انھوں نے کشمیر کی خزاں میں بھی حسن کا مشاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ ایک رباعی میں کہتے ہیں۔

کشمیر بود فصل خزاں عالم نور   بر طالب فیض دیدنش ہست ضرور

گوئی کہ دریں باغ چمن ساز قضا آوردہ نہال شعلہ از خرمن طور

ملا طغرا کا انتقال بھی کشمیر ہی میں ہوا اور مزارِ شعرا میں مدفون ہوئے۔

احسن کے بیٹے، عنایت اللہ خاں آشنا کو بھی باپ کے ذوقِ سخن سے بہرہ وافر عطا ہوا تھا۔ آشنا کا نام بعض تذکروں میں میرزا محمد طاہر لکھا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ آشنا کی والدہ بزرگ خانم شاہ جہاں کی ملکہ ممتاز محل کی بڑی بہن کی لڑکی تھیں۔ اس لئے شاہ جہاں کے دربار میں آشنا کا بڑا لحاظ تھا۔ آشنا کو شاعری کے علاوہ انشاپردازی میں بھی اچھی مہارت تھی، اسی لئے انہیں شاہ جہاں کے عہد کے تیس سالہ واقعات قلم بند کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ کام انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ محمد افضل سرخوش نے اس کارنامہ کو انشاپردازی کے لحاظ سے ملا عبدالحمید لاہوری کے "شاہ جہاں نامہ" سے بہتر بتایا ہے۔ آشنا کو شاہ جہاں نامہ کی بدولت کافی شہرت نصیب ہوئی۔

آشنا کی شاعری کا آغاز ۱۰۵۳ھ میں ہوا۔ اس کا ذکر احسن نے اپنے دیوان کے دیباچے میں کیا ہے۔ آشنا بھی باپ کی طرح پُرگو شاعر تھے، گو باپ کے معیاروں تک ان کا کلام نہیں پہنچتا۔ ان کا دیوان غزلیات، قصائد، رباعیات مراثی کے علاوہ ایک ساقی نامہ اور کشمیر کی تعریف میں ایک مثنوی پر مشتمل ہے ان کی غزل کے کچھ شعر ہیں۔

دولت بوقت تیرگی بخت نکبت است جاروب وقت شام پریشانی آورد

الفت میانہ دو ستمگر نمی شود دندان مار قبضہ خنجر نمی شود

عالمگیر کو سرمد مجذوب سے جو مخالفت تھی، وہ مشہور ہے ایک روایت ہے

کہ عالم گیر نے آشنا کو حقیقت حال کی دریافت کے لئے بھیجا تھا۔ انھوں نے دریافت حال کے بعد یہ شعر شہنشاہ کی خدمت میں لکھ بھیجا تھا، جس میں ان کی برہنگی کی طرف اشارہ ہے۔

برسرمد برہنہ کرامات تہمت است
کشفی کہ ظاہر است ازو کشف عورت است

ملا محسن فانی اس دور کے علما اور اساتذہ فارسی میں بہت شہرت رکھتے ہیں۔ شیخ یعقوب صرفی اور بابا داؤد خاکی کے بعد، یہ مرتبہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہو سکا۔ فانی عالم تھے، شاعر تھے اور فلسفے سے بھی ان کو لگاؤ تھا۔ شیخ یعقوب صرفی کی خدمت میں انھوں نے تحصیل کی تھی۔ کشمیر میں علم حاصل کرنے کے بعد صرفی تلاش علم میں کشمیر سے باہر گئے، مختلف ملکوں کا سفر کیا، اور وہاں کے علما سے استفادہ کیا، جب وہ بلخ پہنچے تو نذر محمد خان والی بلخ نے ان کے علم و فضل کا احترام کرتے ہوئے، انھیں اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ فانی نے نذر محمد خاں کی مدح میں کئی قصیدے لکھے ہیں۔ بلخ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ ہندوستان گئے، جہاں شاہ جہاں نے بھی ان کی سرپرستی کی اور الہ آباد کی صدارت کے عہدے پر ان کا تقرر کیا۔ شہزادہ دارا شکوہ نے بھی ان کی قدر دانی کی۔ الہ آباد میں قیام کے زمانے میں فانی، شاہ محب اللہ الہ آبادی کے ارادتمندوں میں داخل ہوئے۔ پیر کے بارے میں اپنی عقیدت مندی کا اظہار وہ ایک بیت میں اس طرح کرتے ہیں۔

ہفت گردوں خلوتی از خانقاہ پیر ماست
از گدا تا شہ مرید پیر عالم گیر ماست

دارا شکوہ سے انھیں جو لگاؤ تھا، اس کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

فانی کہ سجدہ در دارا شکوہ کرد
دیگر سرش فرود بہ ہر در نمی رود

شہزادہ مراد نے جب بلخ فتح کیا اور نذر محمد خاں کو شکست ہوئی تو فانی کے،

اس کی مدح میں لکھے ہوئے قصائد دستیاب ہوئے۔ یہ ان کی ملازمت سے علیحدگی کا سبب ثابت ہوئے۔ ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد فانی کشمیر لوٹ آئے اور یہاں بھی صدارت کے عہدے پر کچھ عرصہ تک رہے۔ کشمیر میں فانی نے ایک مدرسہ قائم کیا اور علم کی خدمت میں زندگی گذار دی۔

ظفر خاں احسن سے فانی کے ابتدا میں اچھے مراسم رہے۔ جب احسن ناظم کشمیر ہو کر آئے، تو فانی جو احسن کی سرپرستیوں کا حال سن چکے تھے، اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بہار گلشن کشمیر باز رنگیں شد
که ابر فیض ظفر خاں کامگار آمد

لیکن بعد میں ان دونوں میں رنجش ہو گئی تھی۔ اس کا سبب تنجی نام ایک دختر رقاصہ بتائی جاتی ہے، جس پر فانی عاشق تھے اور احسن بھی اسے چاہتا تھا دونوں کے آپس میں قیل و مقال بھی رہے تھے۔ آخر فانی کشمیر چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ دہلی میں قیام کے زمانے میں کشمیر کی یاد آتی تو کہہ اٹھتے۔

فانی از بجنت سیاہت شدہ در ہند وطن
ورنہ جای تو بجز گوشۂ کشمیر نبود

ڈاکٹر صوفی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں وہ خراسان بھی گئے تھے، اور جب کشمیر لوٹ کر آئے تو داراشکوہ کی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گئے۔ فانی کا انتقال ۱۶۷۱ء (م ۱۰۸۳ھ) میں ہوا۔ وہ صاحب دیوان تھے اور ایک خمسہ بھی ان کی تصنیفات سے ہے۔ لیکن ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے ان کی مثنویات کا مجموعہ جو "مثنویات فانی کشمیری" کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں حسب ذیل چار مثنویاں شامل ہیں۔

مثنوی ناز و نیاز۔ مثنوی میخانہ راز۔ مثنوی مصدر الآثار اور مثنوی ہفت اختر۔
فانی کو خمسہ کہنے کی تحریک نظامی سے ملی تھی، چنانچہ انھوں نے "مصدر الآثار"

کے دیباچے میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

"امابعد روشناس قلمرو، ہیچ مدانی، محمد محسن فانی معروض میدارد کہ چوں غواصان محیط معانی و شناوران دریای نکتہ دانی سفینہ طبیعت خودرا در بحر "مخزن الاسرار" کہ بصورت تنگ و در معنی بیکنار است رواں کردہ بدستیاری توفیق، جواہر بسیار ولآلی بے شمار بکف آوردہ اند، این ابجد خواں مکتب سادہ لوحی نیز بدآموز لشدہ و چنگ در دامن متابعت ایشاں زدہ فراخور استعداد خود خزف ریزہ چند بساحل انداخت وآں را فراہم آوردہ مسمیٰ بہ "مصدر الآثار ساخت"۔

یہ مثنوی شاہ جہاں کے نام سے معنون کی ہے۔

شہاب الدین محمد ابو المظفر — کہ بر سر دارد از اقبال افسر
شہی کز عدل چوں نوشیرواں است — امیر المومنین شاہ جہاں است

فانی کی مثنویوں کے نام کے لحاظ سے بھی جامی سے مناسبت ہے۔ مثنوی "ناز و نیاز" ایک عاشقانہ داستان ہے، جو اپنے عہد کے تاریخی چوکھٹے کے اندر بٹھائی گئی ہے مقامات اور واقعات کا تذکرہ ایسی قطعیت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ، اس داستان کے حقیقی ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ یہ واقعہ اکبر کے عہد میں بتایا گیا ہے۔ کالپی کے سید موسیٰ کی موہنی سے محبت کی داستان دلچسپ ہے۔ سید موسیٰ کے موہنی کو خواب میں دیکھنے کا حال، فانی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

شبی آمد بخوابش ماہ روئی — چو شب بر سر پریشاں کردہ موئی
بقصد صید دلہا کردہ شب گیر — بپایش گرچہ بود از زلف زنجیر
قد او چوں نہال شعلہ سرکش — میاں در پیچ و خم چوں مو بہ آتش

نوشتہ خامہ تقدیر از مو خطی خوش بر بیاض گردن او

مژہ بستہ نظر بد ابر و انش چو تیری کز کماں باشد نشانش

آگے موہنی کا سراپا بیان کیا ہے۔ مثنوی کا یہی انداز ہے اور سلاست اور روانی ہیں، اساتذہ ایران کی خوش گفتاری کا لطف اس کو پڑھنے سے آجاتا ہے۔

فانی غزل کے بھی اچھے استاد تھے۔ انھوں نے جو دیوان چھوڑا ہے، اس میں ابیات کی مجموعی تعداد پانچ اور سات ہزار کے درمیان ہے۔ دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصائد اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ دیوان کے ایک مخطوطے کی نشاندہی ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں کی ہے۔

فانی کی غزل کے کچھ اشعار حسب ذیل ہیں۔

دیدان بچشم دل، ہمہ عالم چہ مشکل است آئینہ کہ داشت سکندر ہمی دل است

در بہار گلشن کشمیر فانی ہر طرف جز شراب ناب شمع محفل احباب نیست

ہوای برشگال ہند خوش آمد مرا لیکن نسیم نو بہار کابل و کشمیر می آید

خود شناسی از نیست کس دانی نباشد خوش شناس آشنائی با خدا نبود ز خود بیگانہ را

فانی نے لابد بخشی کی ایک مثنوی کا منظوم دیباچہ بھی لکھا تھا، جو ذیل کے اشعار سے شروع ہوتا ہے۔

حامداً للذی ہو الموجود کہ جز او نیست حامد و محمود

ہو من لیس فی الوجود سواہ   اللہ، لا الہٰ الا اللہ

ڈاکٹر صوفی نے بڑی محنت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مشہور اور معرکۃ الآرا کارنامہ "دبستانِ مذاہب" فانی کی تصنیف ہے، اور یہ تصنیف انھوں نے دارا شکوہ کی اسی خانقاہ میں گوشہ نشین ہونے کے بعد لکھی تھی، جو پری محل کے نام سے موسوم ہے۔

محسن فانی کا انتقال ۱۶۷۱ء (م ۱۰۸۲ھ) میں ہوا۔

ملا محسن فانی کی تربیت اور ان کے مدرسہ کی تعلیم نے فارسی کو کشمیر کے تین عظیم شاعر عطا کئے۔ یہ ملا طاہر غنی، ملا محمد زماں نافع اور حاجی محمد اسلم سالم ہیں۔ حاجی محمد اسلم سالم کے بارے میں پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ وہ پہلے ہندو تھا، بعد میں ملا فانی کی تربیت اور صحبت کے اثر نے اسلام قبول کرنے پر مائل کیا، اور اپنے بھائی کے ساتھ اسلام لایا۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ حج کو بھی گیا تھا۔ کچھ عرصہ وہ شہزادہ اعظم کے پاس ملازم بھی رہا، لیکن معظم کے مقابلے میں اس کی شکست کے بعد وہ کشمیر آگیا، اور شعر و سخن کی دلچسپیوں میں محو رہا۔ وہ صاحبِ دیوان تھا، اور کچھ مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ شہزادہ اعظم کے "فیل جنگ" پر اس کی نظم بہت مشہور ہوئی۔ سالم کی ایک نعتیہ غزل کے چند شعر ہیں۔

براوج بردہ شرع تو دین قویم را   پیوند کردہ لعل خط مستقیم را
درشش جہت تبسم صبح سعادت است   روشن نمود معنی خلق عظیم را
از بکہ در ازل شرف بیعت تو یافت   بوسیدہ دست نور الٰہی کلیم را
سالم نجات سالم عاصی است روز حشر   باشد شفاعت تو شفا این سقیم را

فانی کے شاگردوں میں ملا محمد طاہر غنی کو جو مرتبہ حاصل ہوا، وہ نہ صرف

فانی کے دوسرے شاگردوں بلکہ کشمیر کے فارسی شعرا میں کسی کو کم حاصل ہو سکا۔ شاعری میں غنی کی شہرت نے، فانی کو بھی باوجود ان کے علم و فضل کے پس منظر میں ڈال دیا۔ یہ "قبول خاطر و لطف سخن" کی بات ہے۔ تاہم یہ بھی درست ہے کہ غنی کے مخصوص انداز فکر نے کشمیر میں فارسی شاعری کے معیار کو اتنا بلند کر دیا کہ کشمیر کا شمار بھی فارسی ادب اور شاعری کے اہم مرکزوں میں ہونے لگا۔ غنی غزل کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ انھوں نے اساتذہ ایران کے معیاروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، جن میں سے بعض اس وقت خود کشمیر میں موجود تھے، اپنے محسوسات اور تجربات کی جبلی گہرائیوں کے محرکات، اور فارسی کے ادبی اثاثوں اور ان کی نزاکتوں پر قابو کی مساعدت سے جو کلام سر انجام کیا، وہ ایران کے قدیم اساتذہ کے افکار کے دوش بدوش فارسی ادب میں زندہ رہے گا۔ پیر غلام حسن کی رائے ہے کہ "در خطہ کشمیر بلکہ در تمامی ہندوستان مثل او خوش خیال و نازک شمال ہیچ کسی نہ بر خاستہ"۔

غنی، کشمیر کے مشہور عشائی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ پیر غلام حسن کے بیان کے مطابق ان کا خاندان خراسان کے قریب کے ایک گاؤں اشاور سے کشمیر آیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صوفی کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔

غنی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر صوفی کا اندازہ یہ ہے کہ وہ سنہ ۱۶۲۰ء (م سنہ ۱۰۳۰ھ) کے قریب پیدا ہوئے۔ لیکن علی جواد زیدی اس سنہ کو صحیح نہیں سمجھتے۔ پہلے وہ طاہر تخلص کرتے تھے، لیکن بعد میں غنی تخلص اختیار کیا۔ ان کے شاعرانہ کمالات کی نشو و نما ظفر خاں احسن کے آخری عہد نظامت میں ہونے لگی تھی۔ اس لیے ان کا نام احسن کی محفلوں میں شریک ہونے والے شعرا میں نہیں آتا۔ لیکن احسن کے بیٹے عنایت اللہ خاں آشنا سے ان کا

ربط رہا، تمام ماہر کے بیان سے روشنی پڑتی ہے۔ اصلیں میں غنیؔ، دنیوی جاہ و مرتبہ کی کشمش سے مستغنی تھے۔ ان کا فن ان کی سلطنت تھی، جہاں انہیں وہ ساری مسرتیں اور آسودگیاں نصیب تھیں جن کے لئے انسان ساعی رہتا ہے۔ غالباً وہ کشمیر سے باہر بھی رہے تھے، جس کا اشارہ ان کے اس شعر میں ملتا ہے۔

اے بخت رساں بباغ کشمیر مرا کردا ست ہوای ہند دل گیر مرا

سری نگر میں وہ راجوری کدل کے قریب رہا کرتے تھے، اور روایت یہ ہے کہ جب گھر کے اندر ہوتے تو دروازہ بند رکھتے، اور باہر جاتے ہوئے اسے کھلا چھوڑ جاتے۔ کسی نے ان سے سبب پوچھا تو انھوں نے جو جواب دیا، اسے اقبال نے خوبی سے منظوم کیا ہے۔

فقیرو بہ اقلیم معنی امیر بپاسخ چہ خوش گفت مرد فقیر
دریں خانہ جز من متاعی کجا است زمین انچہ دیدند یاراں رواست
متاعی گرانی است درخانہ اش غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش

محمد علی ماہر جنھوں نے غنیؔ کے دیوان کو مرتب کیا تھا، ان کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی ظفر خاں احسن کے بیٹے عنایت اللہ آشنا سے ربط رکھتے تھے۔ چنانچہ آشنا کا یہ دعویٰ کہ جو شعر ایک مرتبہ پڑھتے ہی سمجھ میں نہ آئے اسے بے معنی سمجھتا ہوں جب غنی نے سنا تو کہا تھا "تا حال اعتمادی بر شعر فہمی عنایت خاں داشتم امروز آں اعتماد برخاست" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "بعد از آن ہیچ گاہ از خان مذکور ملاقات نکرد"

غنیؔ کا مختصر دیوان، جو محمد علی ماہر نے مرتب کیا تھا، ۱۸۴۵ء (م ۱۲۶۱ھ) میں مطبع مصطفائی لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ یہ غزل، قصیدہ اور رباعی پر مشتمل ہے۔ حال ہی میں کلچرل اکادمی جموں و کشمیر کی جانب سے، اس کا ایک

اچھا اڈیشن جناب علی جواد زیدی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے ۔ لیکن یہ مختصر دیوان ان کے سارے کلام پر مشتمل نہیں ہے ۔ کہتے ہیں کہ غنی نے کوئی بیس ہزار ابیات چھوڑی تھیں ۔ تاہم اس وقت یہی مختصر دیوان ، غالب کے مختصر اردو دیوان کی طرح ، غنی کی شہرت کا باعث ہے ۔

غنی غیر معمولی طباع واقع ہوئے تھے اور ان کا تخیل بلند تھا ۔ ڈاکٹر صوفی نے اشارہ کیا ہے کہ غنی کا عہد کشمیر میں فارسی شاعری کے عروج کا دور تھا ، اور اس میں شبہ نہیں کہ اس میں خود غنی کا بھی کم حصہ نہیں تھا ۔ غنی کے دیوان کی پہلی غزل معرکتہ الآرا مانی گئی ہے ، چنانچہ اس کے اکثر اشعار اور مصرعوں کی تضمین اساتذہ نے کی ہے ۔ اس غزل کا مطلع اور کچھ اشعار ذیل میں درج ہیں ۔

جنونی کو کہ از قید خودی بیروں کشم پارا ۔۔۔ کنم زنجیر پای خویشتن دامان صحرا را

اگر شہرت ہوس داری ، اسیر دام عزلت شو ۔۔۔ کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن ۔۔۔ کہ روشن کرد نور دیدہ اش چشم زلیخا را

در کمر بستن مضمون رنگیں لطف نیست ۔۔۔ کم دہد رنگ ار کسی بندد حنائی کبنہ را

فروغ شعلہ ادراک در پیر بیت کم پیدا ۔۔۔ بود ایں معنی پنہاں ز شمع صبحدم پیدا

غنی تار نفس چوں رشتہ گلدستہ میگردد ۔۔۔ زبانم گر بتقریر آورد اشعار رنگین را

غنی کا انتقال ۱۰۷۹ھ میں ہوا ۔

محمد زماں نافع ، شاعری میں اپنے بھائی غنی کے متبع تھے لیکن غنی کے معیار ان کے بس کی بات نہیں تھی ۔ ان کے دو شعر ہیں :

نی کشی و بازمی پرسی شہید کیستی	این غلط اندازی و بازی بجامی زیبدت
پیکرت رانار و پود جامہ مسطر کشید	از شمیم گل قبا ہی تہ نمانی زیبدت

نافع اچھے انشا پرداز بھی تھے اور صوفی نے لکھا ہے کہ وہ مورخ بھی تھے

غنی کے معاصرین میں میرزا داراب جویا اور مرزا کامران گویا، دونوں بھائی بھی شاعر تھے۔ غنی کے بعد جویا فن شعر میں سر آمد مانے جاتے تھے۔ میرزا صائب کے طرز کا ان پر بہت اثر تھا، اور اسی کا تتبع کرتے تھے۔ ایک دیوان انھوں نے یادگار چھوڑا ہے۔ جویا کے دو شعر ذیل میں منقول ہیں۔

می تواں یافتن از نالہ قمری کہ مدام	آتشی ہست نہاں در تہ خاکستر اد
دل جویا نخورد زین غزل آرائی آب	منقبت سنج بود خاطر مدحت گر اد

مقطع سے ظاہر ہے کہ، جویا کو منقبت سے بہت دلچسپی تھی۔ گویا کو بعض نقاد، جویا کا ہم پلہ مانتے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کے مباحثے، ان ایرانیوں سے اکثر ہوا کرتے تھے، جو کشمیر آتے تھے۔ ایک شاعر نے ان دونوں کے تخلص بشن کر کہا تھا "ان دونوں بھائیوں نے طالب کلیم کی بڑی خوبی سے تقسیم کر لی ہے"۔

اسی زمانے میں ملا وفائی بھی گزرے ہیں، جو ایک خوش فکر شاعر تھے۔ ان کا ایک شعر ملتا ہے، جو کوہ ماراں (ہاری پربت) کے بارے میں کہا گیا تھا شعر حسب ذیل ہے۔

ندانم کوہ ماراں بستہ چوں شد	کہ بی نسبت بود مار و زمرد

لیکن ڈاکٹر صوفی نے یہ بیت اخوند ملا شاہ سے منسوب کی ہے۔

فروغی اسی زمانے میں منظر عام پر آیا۔ وہ غزل اور مثنوی دونوں خوب کہتا تھا۔ اس کی دو مثنویاں مشہور ہیں۔ ایک مثنوی جو شاہ جہان آباد پر لکھی ہے اور دوسری جو باغ حیات بخش کی توصیف میں ہے۔ ان مثنویوں

کے صلے میں اسے شاہ جہاں کے دربار سے بارہ ہزار روپیہ کا انعام عطا ہوا تھا، اور بارہ روپے یومیہ بھی اس کا وظیفہ مقرر ہو گیا تھا۔ شاہ جہاں آباد کی تعریف میں وہ اس طرح رطب اللسان ہے۔

تعالی اللہ چہ شہر است ایں کہ از شاں گذشتہ ہر بنای او بہ کیوان
جہاں را بہ ز خود گر باد باشد ہمیں شاہ جہاں آباد باشد
ز خوبیہای او ہر گہ کند یاد رود صد دجلہ اشک از چشم بغداد
شکوہ آسماں دارد زمینش جہاں انگشتر آمد، او نگینش

باغِ حیات بخش کے بارے میں اس کے تاثرات شعر کا جامہ اس طرح پہنتے ہیں:

اے چشم بہار از تو روشن خاطر بہ تصور تو گلشن
راحت دہ روح فیض عامت زاں گشت حیات بخش نامت
نہریکہ میان تو روان است عالم ہمہ جسم و او روان است

فروغی کے "لمعات" بھی دل کشی رکھتے ہیں۔ کچھ اشعار درج ذیل ہیں

گر دولت آرزو کند آں گہر یگانہ را رقص کناں بہ آب دہ ہمچو حباب خانہ را

ای کہ ز رفتن شتاب تیر دارد عمر تو چوں کماں بہر کہ میسازی منقش خانہ را

ملا فصیحی کے بارے میں پیر غلام حسن لکھتے ہیں:

"از شعرای کشمیر است و در عہد شاہ جہاں چمن پیرای باغی سخندانی بود"

وہ صاحبِ دیوان تھا۔ اس کے کلام کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

حسن پیرایہ دکان ہوس نتواں کرد شعلہ طور چراغ دل خس نتواں کرد

طوطیاں گر لب دریوزہ بحسرت بستند | شکرستاں ہمہ در کام مگس نتواں کرد
بال و پر سوز کہ تا ثروت پروازی ہست | بمراد دل خود سیر قفس نتواں کرد
چہ طلسمی است فصیحی کہ ز میدان وفا | پیش نتواں شد و رو باز بہ پس نتواں کرد

از سوختن ما نشود ہیچ تسلی | خوش بر سر لطف آمدہ پیماں شکن ما

عبدالرسول استغنا، کشمیر کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے کشمیر سے باہر بھی شہرت حاصل کی۔ شاہ جہاں کے بیٹے مرزا شجاع نے ان کی قابلیت کی بنا پر انھیں اپنے یہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ کچھ عرصہ وہ داروغہ توپ خانہ بھی رہے۔ میرزا شجاع نے جب بغاوت کی، تو وہ، اودھ چلے گئے اور کچھ عرصہ وہاں بھی رہے۔ اودھ میں بھی امرا نے ان کی سرپرستی کی۔ بعد میں استغنا عالم گیر کی ملازمت میں بھی رہے۔ ان کا انتقال ۱۰۸۲ھ میں ہوا۔ استغنا کا ایک شعر درج ذیل ہے

فلک چرا کمر احتساب می بندد | سزای بادہ پرستاں خمار خواہد بود

اخوند ملا محمد شاہ بدخشانی جو ملا شاہ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں اور لسان اللہ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، بدخشاں کے قریب ایک گاؤں ارکسا کے رہنے والے تھے اور ۱۶۱۴ء (م ۱۰۲۳ھ) میں لاہور آئے تھے۔

لاہور میں اس زمانے میں، میر محمد بن سائیں دا تا اپنے زہد اور تقوی کی بدولت مرجع انام تھے۔ ملا محمد انھیں کے مرید ہوئے۔ میر محمد عام طور پر میاں میر یا میاں جیو کے لقب سے مشہور ہیں، ان کی وسیع مشربی کی وجہ سے، سکھوں کے گرو ہرگوبند بھی ان کا احترام کرتے تھے اور، امرتسر کے گردوارہ ہری دربار صاحب کا سنگ بنیاد انھیں کے ہاتھ سے رکھوایا تھا۔ انھوں نے جہاں گیر سے گرو ہرگوبند کی شفاعت کر کے قلعہ گوالیار سے انھیں رہائی بھی دلوائی تھی۔ شاہجہاں

بھی ان کا بڑا احترام ملحوظ رکھتا تھا، اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔

ملا شاہ سے دارا شکوہ کو بڑی عقیدت تھی، اس کی بہن جہاں آرا، اور بیگم، نادرہ بیگم جو پری بیگم بھی مشہور تھیں، ان کے مرید تھے۔ دارا شکوہ کا قیام جس زمانہ میں کشمیر میں تھا، اسی کے اصرار پر ملا شاہ، کشمیر آئے تھے، ان کے اور ان کے معتقدین کے صوفیانہ اعمال اور اوراد کی مصروفیت کے لئے، دارا شکوہ نے زبرون پہاڑ کے ڈھلوان پر ایک خانقاہ بنوائی تھی، جو کوہ نیلون کے نام سے موسوم تھی، لیکن اس کا نام بعد میں دارا شکوہ کی بیگم کے نام پر پری محل پڑ گیا۔ اپنے بہار کے زمانے میں یہ بڑا پُر فضا باغ تھا، جس کے چھ طبقے تھے اور پہاڑی چشمے سے سیراب ہوتے تھے۔ ملا شاہ یہاں اپنے مخصوص اوراد اور مشاغل تصوف میں مشغول رہتے تھے، جو "کسب ماہ" کے نام سے موسوم تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس طریقہ میں، ریاضت، زہد اور تقویٰ کے مشاغل چاندنی راتوں میں انجام دیئے جاتے تھے خیال یہ ہے کہ اس مخصوص طریقہ تصوف کو رواج دینے میں دارا شکوہ کا بھی حصہ تھا۔ دارا شکوہ اکبر کے مقابلے میں، جو سورج کا پرستار تھا، چاند کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔

ملا شاہ کثیر التصانیف مصنف ہیں، اور ان کی تصانیف میں سے اکثر تصوف سے متعلق ہیں۔ وہ اچھے سخن سنج بھی تھے۔ ان کے کچھ شعر نیچے درج کئے جا رہے ہیں:

ملاشاہ کی مثنویات تصوف اور عرفان کے رموز سے پُر ہیں۔ یہ مثنویاں داراشکوہ کی ہدایت کے لئے تصنیف کی گئی تھیں۔ پہلی مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

حمد ذاتی را کہ اصل ذات ماست ذات او در اصل اصل ذاتہا است

من عرف تا قد عرف دانستہ ام دیدہ و دانستہ بر خود بستہ ام

چوں مرا تحقیق شد ایں لفظ قد شد خلاصم جان و دل از قید کد

ایک اور مثنوی کا اقتباس حسب ذیل ہے:

ازیں نوع پیر و مرید اں گذر نوای شہ بجوزہی اگر مغز خر

مرا ایں سخن ہا مناسب نبود کہ گفتم در اطوار شیخ حسود

منم بلبل باغ توحید حق چہ لائق نوای من ازایں سبق

ملاشاہ کا ایک رسالہ "حقیبہ" بھی دستیاب ہوتا ہے جو نثر میں ہے ان کی مثنویات کے مجموعے کے آخر میں حضرت میاں میر کا کلام بھی نقل کیا ہے، جس سے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

از پردہ چو آں ساید بیباک بر آمد آہ از دل غمناک بر افلاک بر آمد

آنگہ کہ دل صادق بیچارہ ترا دید از قید دو عالم ہمگی پاک بر آمد

ملاشاہ کا انتقال لاہور میں ۱۶۶۱ء (م ۱۰۷۲ھ) میں ہوا۔

داراشکوہ اور اس کی بہن جہاں آرا کا قیام عرصے تک کشمیر میں رہا، اور داراشکوہ کی تصوف سے دلچسپیوں کی بدولت کچھ اچھے صوفی علما کا کشمیر میں اجتماع عمل میں آیا تھا۔ میاں میر کا کچھ ہندی کلام، جو داراشکوہ نے ملاشاہ کی زبان سے سُنا تھا، ایک رسالے کی صورت میں اپنے مقدمہ اور ہم مطلب فارسی اشعار اور قرآنی آیات کے ساتھ جمع کر دیا تھا، جسکو "ایمار المحققین"

کے نام سے موسوم کیا ہے۔

دارا شکوہ اور اس کی بہن جہاں آرا ملا شاہ کے عقیدتمندوں میں سے تھے۔ چنانچہ انہیں کے اصرار پر ملا شاہ کشمیر آئے تھے اور اپنے مخصوص دبستان تصوف کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ پری محل میں خانقاہ کے علاوہ تصوف کی کتابوں کا ایک کتب خانہ بھی تھا۔ پری محل ہمارے عصر کے بہت سے کشمیری شعرا کا محرک رہا ہے۔

ملا شاہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے فارسی کلام کا ایک دیوان بھی موجود ہے۔ ان کی مثنوی پر ملا محسن فانی نے جو منظوم مقدمہ لکھا تھا، اس کا ذکر گذر چکا ہے۔

شاہ جہاں کے عہد کی ایک اہم تصنیف "طبقات شاہجہانی" محمد صادق کشمیری نے ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء (م ۱۰۶۰ھ) کے قریب مرتب کی تھی۔ اُن کے بھائی محمد یوسف کشمیری ہمدانی کا حال گذر چکا ہے، جو اچھے انشا پرداز تھے۔ محمد صادق نے اپنی تصنیف میں آل تیمور کے عہد کے اولیا، فلاسفر اور شعرا کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی تجویز دورِ خلافت سے لے کر، اپنے زمانے تک کے بزرگوں کے حالات لکھنے کی تھی، لیکن اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے، یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا۔ "طبقات شاہ جہانی" دس "طبقات" پر منقسم ہے، جن میں تیمور، میرانشاہ اور شاہ رخ، مرزا سلطان محمد اور الغ بیگ، ابوسعید، عمر شیخ، بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد کے مشاہیر کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ ہر "طبقہ" کئی ابواب پر مشتمل ہے، اور ہر عہد کے بزرگانِ دین، علما، اطبا، فضلا اور شعرا کا حال ان میں مندرج ہے۔

اس کتاب کا ایک مخطوطہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹیؒ جن کا ذکر ملا کمال اور ملا جمال کے شاگردوں میں کیا گیا تھا، کشمیری نہیں تھے، لیکن جیسا کہ لکھا گیا تھا، کشمیر کے علما کے فیض یافتہ تھے۔ ان کے اساتذہ ملا کمال اور ملا جمال، شیعہ سنی فسادات میں، کشمیر سے باہر چلے گئے اور سیالکوٹ میں مقیم تھے۔ ملا عبدالحکیم نے ان سے استفادہ کیا تھا۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں، وہ ہند کے جید علما میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی شہرت ہندوستان سے باہر، بخارا، حجاز مصر، استنبول اور مراقش تک پہونچ گئی تھی۔ جہانگیر کے عہد میں وہ منظر عام پر آچکے تھے، لیکن شاہ جہاں کے زمانے میں، ان کی شہرت عروج پر پہنچی شاہ نے انہیں اکبر آباد میں شاہی مدرسہ کا صدر مقرر کیا تھا۔ حاجی محمد جان قدسی بھی، اس مدرسے کے اساتذہ میں شامل رہے تھے۔ نواب سعداللہ خاں علامی، ملا کمال اور ملا جمال کے مدرسہ میں ان کے ہم جماعت رہے ۔۔۔ سعداللہ خاں علامی جب دہلی میں وزیر ہوئے تو، ملا عبدالحکیم کے جاہ و مرتبہ میں بہت اضافہ ہوا۔

چندر بھان برہمن، کشمیری نژاد پنڈتوں میں اپنے علم و فضل اور شعری صلاحیتوں کی بدولت، امتیاز رکھتا ہے۔ برہمن کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا تھا، شاہ جہاں کے عہد میں اس کے بھائی اودے بھان نے اور خود برہمن نے بہت ترقی کی۔ اودے بھان عاقل خاں کی ملازمت میں تھا، اور عاقل خاں کے توسط سے برہمن بھی شاہ جہاں کے دربار میں باریاب ہوا تھا۔ برہمن کی انشا پردازی کی صلاحیتوں کو پہچان کر شاہجہاں نے اسے وقائع نویس حضور کے عہدہ پر مامور کیا تھا، اور اکثر وہ شاہجہاں کے ساتھ سفر و حضر میں رہا کرتا تھا۔ شاہ جہاں کے دربار سے برہمن کو "رائے" کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔ شاہ جہاں کے سفر کشمیر میں برہمن اس کے

ساتھ کشمیر آیا اور یہاں عرصہ تک مقیم رہا۔ برہمن کو انشا پردازی میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ اس کے رقعات، فارسی انشا پردازی کے عمدہ نمونے ہیں۔

فارسی شاعری میں برہمن اپنے عہد کے اچھے ایرانی شعرا سے کسی طرح کم نہیں تھا، اور علمی فضیلت میں وہ ان میں سے بہت سوں سے بڑھا ہوا تھا۔ صائب نے اس کے اشعار کو ایران کے عظیم فارسی شعرا کے کلام کے ساتھ اپنی بیاض میں جگہ دی تھی۔

برہمن داراشکوہ سے بھی متوسل رہا اور عالمگیر کی ملازمت بھی کی اس کا انتقال قریب ۱۶۶۴ء (م ۱۰۷۵ھ) کے ہوا۔ اس کے مشرب کی وسعت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کے خیالات میں وسیع اختلافات کے باوجود، دونوں برہمن کو چاہتے تھے۔

سعدالدین، ایک نغز گفتار شاعر تھے، اور سعید تخلص کرتے تھے۔ وہ صاحبِ دیوان تھے۔ ان کی زندگی کی تفصیلات کا علم نہیں ہوتا۔ ان کے کلام کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

کج کلاہ من کہ باما میکند ہر کار کج — وعدہ کج پیماں کج اقرار کج انکار کج
تاکہ او از خانہ دل رفت و شد آنخانہ را — بام کج بنیاد کج و در کج و دیوار کج

خلد اندر نظرم چیست سر کوی کسی است — مہر انور چہ بود عکس مہ روی کسی است
رنگ و بوی کہ بباغست نمیدانم چیست — رنگ از روی کسی بوی ز گیسوی کسی است
ترک من ترک جفا کردہ وفا پیشہ گرفت — گفت سید سجدا بندہ ہندوی کسی است

ملا عبدالغفور نامی، جن کے بارے میں پیر غلام حسن نے لکھا ہے "در فن

سخن وری نامی «مرد گرامی بود» خوش کلام شاعر تھے اور انہی "پنج گنج وحدت" کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ محمد اشرف یکتا صاحبِ دیوان شاعر ہوئے ہیں۔

یکتا کشمیری کا دیوان غلام حسن شوری بن خواجہ صدر الدین عالی کے ہاتھ کا لکھا ہوا، میرزا کمال الدین شیدا کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کے کلام سے کچھ شعر درج ہیں۔

لب شد زفیضِ کشتی می درفشاں مرا
دریا کشتی است مایہ طبع رواں مرا

فضلِ خزاں زہند بکشمیر آمدم
دل شد شگفتہ ہمچوں گلِ زعفراں مرا

کشمیر را بنفشہ خطی دیدم و نماند
فکر سوادِ اعظمِ ہندوستاں مرا

پروانہ نجات بجز خامشی نبود
یکتا چو شمع دادِ بُریدن زباں مرا

شاہ جہاں کے عہد کے علما ہیں، جن کا حصہ علوم دینی کے علاوہ، کشمیر میں عربی اور فارسی کی اشاعت میں بھی رہا۔ حضرت خواجہ خاوند محمود نقش بندی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ خواجہ صاحب نے حصولِ علوم کے بعد خواجہ اسحاق دہبیدی سے بیعت کی اور سلوک اور معرفت کے مقامات طے کیے۔ پھر اپنے اہل و عیال کے ہمراہ، کشمیر آئے، اور حسین شاہ چک کے باغ میں، مقیم ہوئے، یہ مقام اس وقت آپ ہی کے نام پر خواجہ بازار کہلاتا ہے۔ یہاں علوم کی اشاعت کے لئے آپ نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جو مدرسہ خواجگان نقشبند کے نام سے موسوم تھا۔ ملا حیدر چرخی اس مدرسہ کے صدر تھے۔ آپ نے حضرت محمد امین ولیسی کی خانقاہ بھی تعمیر کروائی تھی۔ ظفر خاں احسن کے عہد میں جو شیعہ سنی فساد برپا ہوا تھا، اس میں

آپ کو تہمت لگا کر، شاہ جہاں کے دربار میں بھیج دیا گیا تھا۔ خواجہ صاحب کا انتقال ۱۰۵۰ھ میں لاہور میں ہوا۔

خواجہ صاحب کے فرزند خواجہ معین الدین اپنے عہد کے علما میں بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کے اپنے معاصر علما، ملا محمد طاہر، ملا حیدر، ملا ابوالفتح کلو ملا یوسف مدرس، مفتی محمد طاہر، مولانا عبد الغنی اور مفتی شیخ احمد سے جو جید علما تسلیم کئے جاتے تھے، خواجہ معین الدین کے گہرے مراسم تھے۔ خواجہ کی تصانیف میں "فتاوای نقشبندیہ"، "کنز السعادۃ" اور "رسالہ رضوانی"، اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۶۷۴ء (م ۱۰۸۵ھ) میں ہوا۔

خواجہ محمد مومن جمیل، صاحبِ دل بزرگوں میں سے تھے۔ ان کے والد یوسف خاں کے مصاحب رہے تھے۔ خواجہ نے ملا جوہر ناتھ سے کسب علم کیا۔ بعد میں وہ حج کو گئے۔ وہاں انہیں بشارت ہوئی کہ ابو الفقرا بابا نصیب الدین غازی کی خدمت میں حاضر ہوں اور روحانی فیوض سے مستفید ہوں۔ اس کے بعد وہ، کشمیر آئے اور بابا نصیب الدین غازی کے ارادتمندوں میں داخل ہو گئے۔ مرشد کے انتقال کے بعد، بغداد گئے، اور وہیں ۱۰۵۳ھ میں انتقال کیا۔ خواجہ نے طبیعت موزوں پائی تھی، اور بلیغ شعر کہتے تھے۔ ان کی ایک رباعی ذیل میں درج ہے:

عمریست دریں رشتہ پریشاں گشتیم   گفتیم گراں شویم ارزاں گشتیم
در طالع ماکساد بازاری بود   آئینہ فروش شہر کوراں گشتیم

شاہ جہاں نے جن کشمیری علما کی قدر دانی کی، ان میں سے ایک ملا عبد الرزاق بانڈی بھی تھے، جنہیں اس نے، مدرسہ کابل کا صدر مقرر کیا تھا۔ ایک اور ملا عبد الرزاق، اپنے زمانے کے جید عالم تھے، اور انہوں نے "شرح تجرید"

پر حاشیہ بھی لکھا تھا۔ اس کے علاوہ "محاکمات" کا رد بھی ان کی تصنیف میں سے ہے۔ ملا یوسف کا دسہ شاہ جہاں کے دربار کے انشا پردازوں میں شامل تھے۔ کہتے ہیں کہ جب شاہ جہاں کشمیر سے لوٹ رہا تھا تو پیر پنجال کی چوٹیوں پر خیمے نصب کر کے ٹھیرا، وہیں، اسے روم کے بادشاہ کا مراسلہ ملا۔ اس وقت دربار کا کوئی اور کوئی منشی موجود نہیں تھا، ملا یوسف کو دربار میں پیش کیا گیا۔ جو جواب ملا نے لکھا تھا، وہ بلاغت، فصاحت اور اختصار کے ساتھ ساتھ ایہام کا بھی عمدہ نمونہ تھا، جس کی سیاسی مراسلت میں بڑی اہمیت ہے۔ شاہ جہاں خط کو پڑھ کر بہت خوش ہوا، اور یوسف کو دربار کے منشیوں میں شامل کر لیا۔

ملا حسن گو جو عالم قرآن تھے اور تفسیر بیضاوی پر انھوں نے ایک حاشیہ لکھا تھا۔ یہ حاشیہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک اور عالم ملا ابوالحسن بھی اسی زمانے میں تھے، جنھیں تفسیر بیضاوی حفظ تھی۔ انھوں نے ملا باقر نارہ بلو کے ساتھ مل کر ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے مناظرے اور مباحثے بھی کیے تھے اور اکثر کامیاب بھی رہے تھے۔ ملا باقر کا انتقال ۱۰۳۸ھ میں ہوا۔

مشہور خطاط، ملا مراد اور ملا محمد محسن، جو جہانگیر کے دربار سے منسلک تھے، شاہ جہاں کے دربار سے بھی متوسل رہے۔ یہ دونوں بھائی تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے علاوہ ملا باقر ایک اور کشمیری خطاط بھی شاہ جہاں کے دربار میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان کو نستعلیق، نسخ اور تعلیق میں بڑی مہارت تھی۔ اس کے علاوہ شکستہ نویسی میں بھی ان کی شہرت تھی۔ دوسرے خطاطوں میں، کمال، ابراہیم، احمد اور حیدر بھی اہمیت رکھتے تھے۔

۸

اورنگ زیب اور اس کے بعد

(۱۶۵۸ء تا ۱۷۵۲ء / ۱۰۶۸ھ تا ۱۱۱۹ھ)

اورنگ زیب کے عہد میں فارسی شعر و ادب اور علم و فن کی وہ ترقی جو شاہ جہاں کے زمانے سے شروع ہو چکی تھی جاری رہی۔ خاص طور پر ظفر خاں جن کی شعر و سخن سے دلچسپیوں اور شعرا اور علما کی سرپرستیوں کے باعث، کشمیر کو جو علمی اور ادبی مرکزیت حاصل ہو چکی تھی، وہ باقی رہی۔ چنانچہ اس زمانے میں، اگلے عہد کے کئی شاعر موجود تھے، جن کی سخن سنجیوں نے کشمیر کی فضا کو مسحور کر رکھا تھا، اور کچھ اور نئے شاعر اور ادیب، جن کی پرورش پچھلے دور میں ہوئی تھی، اورنگ زیب کے عہد میں منظر عام پر آئے۔ فروغی جس کی شعری صلاحیتیں، شاہجہاں کے دور میں نشو و نما پا رہی تھیں اورنگ زیب کے عہد جہانبانی میں موجود تھا؛ اور اورنگ زیب کے دربار سے اسے بار ہا صلے ملتے رہے۔ فروغی کا انتقال ۱۶۶۶ء (م ۱۰۷۷ھ) میں ہوا۔

RekhtaDownload.com

اس عہد کے دوسرے سربرآوردہ شعرا میں عبدالغنی بیگ قبول، لالہ ملک شہید، عنایت خاں آشنا، ملا بینش وغیرہ نے اپنی سخن سنجیوں کی بدولت کشمیر میں شعروشاعری کی محفلوں کو گرم رکھا۔ انشاپردازوں میں، محمد رفیع منشی نے بہت شہرت حاصل کی اور علما میں شیخ داود معروف بہ بتہ مالو اور بابا داود مشکواتی مرجع خلائق رہے۔

شیخ علی پام پوری ایک صاحب باطن بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے مریدوں میں خواجہ اسحاق ناد چو علم وفضل میں اونچا مقام اور شعروسخن میں مہارت رکھتے تھے۔ سماع اور رقص کا انھیں بہت شوق تھا۔ ان کی ایک تصنیف "درجات السادات" ہے۔ کلام سے ایک رباعی ذیل میں درج ہے یہ حضرت گیسو دراز کے "شکار نامہ" اور مہاراشٹرا کے کچھ صوفی سنتوں کی طرح کا عرفانی معمہ ہے۔

روبہ ہمہ سوزنی نہالی بنشاں تا شاخ کشد چتر زند گرد جہاں
بر ہر شاخی دو خیل رہو ار براں گر نشوانی زکوہی ما گیر گراں

حضرت داؤد بتہ مالو، صاحب باطن بزرگوں میں سے تھے۔ یہ خود پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن ان کے معتقدین اور مریدین میں کئی اچھے شاعر اور مصنف ہوئے ہیں۔ اکل حلال کے لئے وہ اپنے ہاتھ سے زراعت کرتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ چاول کی ایک دیگ ہر روز پکوا کر کھیت میں رکھتے اور جو مسافر یا مجھو کا ادھر سے گذرتا، اسے بتہ (چاول) ہاک (کشمیری ساگ) اور لسی سے سیر کر کے روانہ کرتے۔ اسی لئے آپ کا لقب تبہ مالو پڑ گیا تھا۔ شیخ کا انتقال ۱۰۷۱ھ میں ہوا۔ ملا محسن خوشنویس آپ کے معتقدین میں سے تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ کے انتقال کے بعد وہ فکر تاریخ میں تھا۔ اسی فکر میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ حضرت

بٹ مالو نے خواب میں اسے بتایا کہ میری تاریخ وفات "ع - غ" ہے۔ آپ کے ایک اور معتقد شیخ مومن نے جو تاریخ کہی تھی، حسب ذیل ہے:

شیخ مومن از رہ اخلاص گفت   بتہ مالو کرد ما وا در جناں

ملا زین الدین بال، ملا شمس الدین پال کے پوتے حضرت بتہ مالو کے مرید اور صاحب قال وحال بزرگ تھے۔ شعر و سخن سے بھی انہیں بہرہ ملا تھا، اور تصوف اور معرفت کے نکات بڑی خوبی سے شعر میں باندھتے تھے۔ انھوں نے ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ ان کے دو شعر یہ ہیں:

دمبدم دست و پاچہ می شوئی   آب جوئی و آب می جوئی
نقش اللہ از رخت پیدا است   تو چہ در بند فکر لاہوئی

حضرت مخدوم شیخ حمزہ رحمتہ کے معتقدین میں میر حیدر لاری اچھے عالم تھے اور سلطان العارفین کے حالات میں انھوں نے ایک کتاب "سلطانیہ" کے نام سے لکھی تھی۔ میر حیدر فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ سید علاء الدین جیوہ زادہ کی وفات پر انھوں نے جو تاریخ کہی تھی، محمد الدین فوق نے اپنی "تاریخ اقوام کشمیر" میں نقل کی ہے۔ تاریخ حسب ذیل ہے۔

بود تا بود سید السادات   درِ او قبلۂ ذوی الحاجات
بود ہفتاد و یک فزوں زہزار   کہ بعید رجناں گرفت قرار (۱۰۷۱ھ)

لالہ ملک شہید کو شعر گوئی اور تاریخ میں بہت ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کی منقبت میں اس نے ایک ہزار ایک تاریخیں کہی تھیں، ان میں ہر شعر سے آپ کی تاریخ ولادت اور سن اور تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ لوگ ان کے پاس تاریخ کہلوانے کے لیے آتے تھے شہید کا ایک اور کارنامہ "وہ مجلس فتنۂ ابراہیم خاں" کے نام سے موسوم

ہے۔ اس میں، ابراہیم خاں ناظم کشمیر کے دور کے حالات نظم کئے ہیں۔ شہید کے دو شعر ذیل میں منقول ہیں:

لام قدمن باالف قد تو لاشد — یعنی کہ وجودم بوصال تو فنا شد
در آتشم نشستہ خموش از فراق دوست — چوں غنچہ ہای لالہ مرا سرمہ در گلوست

"مراۃ طیبہ" بزرگان دین کے حالات میں ایک مبسوط رسالہ ہے، جس کے مصنف خواجہ معین الدین نقشبندی ہیں۔ خواجہ معین الدین نقشبندی، خواجہ خاوند محمود نقشبندی کے فرزند، عالم اور صاحب باطن بزرگ تھے، جن کا انتقال ۱۰۸۵ھ میں ہوا۔ ان کی ایک اور تصنیف "فتادی نقشبندی" ہے۔ مصنف کی محفلوں میں اس عہد کے مشہور علما، ملا ابوالفتح کلو، ملا محمد طاہر، شیخ احمد مفتی وغیرہ شریک رہتے تھے۔ "مراۃ طیبہ" عالمانہ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولف این صحیفہ عرفان محمود و مصنف این مجموعہ ایقان مسعود مشہود رای خورشید انجلای صبح لقای مہر ضمیر و مکشوف خرد بیضا ضیای مشرق طالعان آفتاب تنویر میگرداند کہ این خوشہ چین خرمن سخندانی ریزہ گزین خوان سواد خوانی کشت سوختہ برق عصیان و تخم ریختہ دشت خذلان سرگشتہ تیہ نادانی دور ماندہ بادیہ حیرانی گوشہ نشین خانقاہ پریشانی وزاویہ گزین صومعہ سرگرانی خاکسار آستان درگاہ یقین ابوضیا محمد معین الدین سربلند و سرافراز بفرزندی مقبل حضرت واجب الوجود خدمت خواجہ خاوند محمود العطاری النقشبندی العلوی الحسنی سقی اللہ مضجعہ و برد اللہ بحار رحمۃ مثواہ۔

"مراۃ طیبہ" کا جو مخطوطہ ریسرچ لائبریری سرینگر میں محفوظ ہے، اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"بہ اختتام انجامید این کتاب محمودیہ من تصنیف سلالۃ سادات الکرام ... ... حضرت خواجہ معین الدین نقش بندی"۔

پرمانند، جن کا اصلی نام نندرام تھا، کشمیر کے مشہور تارک دنیا اور سنیاسی تھے، انھیں تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کی ولادت ۱۷۹۱ء (۱۲۰۶ھ) میں بمقام مٹن ہوئی تھی اور انتقال ۱۸۷۹ء (م ۱۲۸۵ھ) میں ہوا۔ وہ مٹن کے پٹواری تھے [illegible] زمانے میں سچ دیا تھا اسکے باوجود گاؤں کے متعدد صالح کنانی نے انکی [illegible] جاری [illegible] کشمیری اور فارسی میں لکھتے تھے۔ للہ دید اور نور الدین ریشی سے وہ خاص طور پر متاثر تھے۔ ان کی تعلیم فارسی میں ہوئی تھی، اور "گلستان" اور "بوستاں" کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا۔ کشمیری شاعری میں وہ سنسکرت الفاظ کا زیادہ استعمال کرتے تھے، لیکن کہتے ہیں کہ جب ایک مسلمان صوفی وہاب صاحب نے ان کی توجہ اس طرف منعطف کرائی کہ نہ ہندو کشمیری میں، ہندوؤں کے لئے لکھتے ہیں، مسلمان دوستوں کے لئے کچھ نہیں لکھتے، تو انھوں نے ایسی زبان میں کلام سرانجام کیا، جس میں سنسکرت سے پرہیز کیا گیا ہے، ڈاکٹر صوفی نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ پرمانند نے داراشکوہ کی نگرانی میں "اپنیشد" کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو "اُپ نیکھت" کے نام سے موسوم ہے۔ فارسی میں انھوں نے غریب تخلص اختیار کیا تھا۔

پرمانند "سدراما چرتر" "رادھا سوئمور" اور "شیو الگن" کے علاوہ چند اور مذہبی اور فلسفیانہ نظموں کے مصنف ہیں۔ بعض لوگ انھیں تصوف میں للہ دید کے بعد سب سے بڑا درجہ دیتے ہیں۔ ان کی کچھ نظمیں چھپ گئی ہیں۔

ان کی سب سے اچھی نظم وہ سمجھی جاتی ہے جس میں سری کرشن کی لیلا کا حال لکھا ہے۔

پرمانند کے چیلوں میں ناگام کے پنڈت لچھمن اور وَنیوہ کے پنڈت کرشن داس نے شہرت حاصل کی۔ صوفی نے جہاں تک زبان کی صفائی کا تعلق ہے، پنڈت کرشن داس کو پرمانند پر ترجیح دی ہے۔

عالمگیری عہد کے کشمیری فضلا میں بابا داؤد مشکواتی کا بڑا درجہ ہے۔ وہ اپنے عہد کے سربرآوردہ عالم دین اور صاحب باطن بزرگ تھے۔ ان کی تعلیم خواجہ حیدر چرخی کے یہاں ہوئی تھی، اور علوم باطنی میں بابا نصیب الدین غازی سے فیضان پایا تھا۔ ان کا لقب "مشکواتی" اس لئے پڑ گیا تھا کہ انہیں "مصباح المصابیح" ازبر ہوگئی تھی۔ حدیث، فقہ، تفسیر اور تصوف کے وہ جید عالم مانے جاتے تھے۔ خواجہ خاوند محمود نقشبندی اور ملا شاہ بدخشی سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ ان کی دو تصانیف مشہور ہیں۔ "اسرار الابرار" جو کشمیر کے بزرگانِ دین کے حالات میں ہے اور "اسرار الاشجار" جو شیخ فریدالدین عطار کی "منطق الطیر" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔

بابا داؤد کا انتقال ۱۰۹۷ھ میں ہوا۔

"اسرار الابرار" بابا داؤد مشکواتی کی اہم تصنیف ہے، اس میں اپنے پیر کے حالات اور مکاشفات بیان کئے ہیں۔ اس کی تصنیف کے اسباب میں لکھا ہے کہ کشمیر کے بزرگوں کے حالات عام طور پر مدون نہیں ہوئے ہیں۔ جو کتابیں اس سے پہلے لکھی جاچکی تھیں ان کی تفصیل دی ہے، جو بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ان میں "دستور السالکین" جو حضرت شیخ حمزہ کی منقبت ہے، قصیدہ وردالمریدین کی شرح ہے، "ریشی نامہ" تصنیف بابا داؤد خاکی، "نور نامہ" تصنیف بابا

نصیب الدین غازی، کے علاوہ شیخ یعقوب صرفی، شیخ موسیٰ زہگیر، حبیب اللہ نوشہری کی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اما بعد می گوید بندہ حقیر فقیر بجناب علیم و قدیر دراجی بحضرت علیم و خبیر داود مشکاتی بن مسعود بن فیروز غوزی ثم کشمیری از کمترین مریدان و کہترین پابوس رسیدگان حضرت وحید العصر فرید الدہر کلیم العلوم مسیح النفس شیخ الشیوخ شیخ نصیر الدین ابوالفقرا نصیب مسکین قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ العزیز کہ چون امواج روایات مرغوب اولیا، و محبوب اتقیا و رموز ایشان کہ مقصود عارفان و بہبود سالکان بود ذلی برافواہ عوام و توثق نیافتہ است و رسوخ نہ پیوستہ است .. .. ازانچہ از السنہ مثل شیخ نصیر الدین ابوالفقرا نصیب مسکین و استاذنا و استاذ العلما مولانا خواجہ حیدر، ابوطبیب، و شیخ مجنون ابو محمد و شیخ علی محمد نیازی و مولانا شیخ علی بہنوری وغیرہم من الراسخین کہ این فقیر عمری در صحبت ایشان بسر بردہ است .. .. بالتماس بعضی احباب .. .. نوشتہ آمد۔"

مرزا عبد الغنی بیگ قبول کو شعر و سخن میں اُستادی کا مرتبہ حاصل ہو چکا تھا اور خاص طور پر ایہام گوئی میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ عالمگیر کے زمانے میں وہ دہلی گئے اور ہدایت اللہ کی مصاحبت میں نائب وزارت پر فائز رہے ان کے شاعرانہ کمالات کے بارے میں پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ "مجلس طرازی شعر و سخن و دقیقہ پردازی این فن را بدرجہ کمال رسانید، و مرجع ارباب معنی شد۔" ان کے کچھ شعر یہ ہیں:

گرہ زکار کسی وانمی تواند کرد　　　　کسیکہ در گرہ جامہ ہای فلکار لیست

تابرقص انداز نازای شوخ رعنا کردہٗ　　　　بستہ زنگولہ صد فتنہ برپا کردہٗ

آخری شعر ایک رقاصہ کے بارے میں کہا تھا۔ قبول کے فرزند، میرزا گرامی بھی شعر و سخن میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ ان کے بھی دو شعر ذیل میں درج ہیں۔

ہمیشہ حکم کسی در دیار ماجار لیست　　　　کہ خامہ اش چو رگ ابر در گہر بار لیست

ہزار داغ فلک خود زاختراں دارد　　　　ترا توقع مرہم ز چرخ زنگار لیست

میاں محمد امین کے مریدوں میں میر محمد معروف بھی اچھے شاعر ہوئے ہیں انہیں خوشنویسی میں بھی ملکہ تھا، میر غلام حسن نے لکھا ہے کہ ـــــ" صاحب اسرار بود ولسنحہ در احوال آنجناب و یاران ایشان گفتہ است"۔ ان کے کلام کا اقتباس حسب ذیل ہے:

چرخ از جگرم ربودہ داغی　　　　افروخت ببزم خود چراغی

وز دولت داغ عشق کافیست　　　　خاکستر من بطرح باغی

معروف دریں بہار تو بہ　　　　دیوانہ بہرزہ کرد لاغی

عبدالحکیم کا ساطع کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ وہ ملا غالب کے بیٹے تھے اور لالہ ملک شہید سے اصلاح لیتے تھے۔ لالہ ملک کے انتقال کے بعد میرزا داراب جویا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ انھوں نے کشمیر سے باہر کا بھی سفر کیا تھا اور پشاور میں قیام کے زمانے میں ان کی ملاقات ملا محمد سعید اشرف سے ہوئی تھی۔ شاہ عالم کے دربار سے بھی ان کا توسل رہا اور بلند مراتب حاصل کئے۔ شاہ عالم کے بعد فرخ سیر کے دربار سے بھی وہ منسلک رہے تھے۔ پھر جب

کشمیر لوٹے تو شعر و سخن کی دلچسپیوں میں زندگی گذار دی۔ ان کے چند شعر یہاں منقول ہیں:

درچنیں عہدی کہ اوضاع جہاں نادیدنی است
دیدۂ تصویر اگر باز است جای حیرتست

ترا غرور بصورت، مرا بمعنی خویش
کمال حسن ترا و مراست حسن کمال

ساطع کی ایک رباعی قابل مطالعہ ہے کہتے ہیں:

مقسم نہ زجام عشق تشنی دادند
کیں نیستیم بقید ہستی دادند
سرمایہ انچہ بود، دادم ازدست
ارزاں نہ متاع تنگدستی دادند

شرف الدین خاں فرحت، ساطع کے معارضین میں سے تھے۔ ذیل کے شعر میں وہ ساطع پر ایراد کرتے ہیں:

طبع فرحت کی اسیر دام ساطع می شود
این کبوتر ہر زماں مشتاق بام دیگر است

فرحت نے بڑی تیز طبیعت پائی تھی۔ شیر جنگ خاں کے زمانے میں صدارت کشمیر کا عہدہ ان کے تفویض تھا۔ شعر اچھا کہتے تھے۔ ان کا ایک اور شعر یہ ہے:

عشقت کمی از چارہ تدبیر ندارد
درماں تب شیر طباشیر ندارد

احسن کے بیٹے عنایت خاں آشنا، جن کا ذکر گذر چکا ہے، عالمگیر کے عہد تک زندہ رہے، اور ۱۰۷۷ھ میں انتقال کیا۔ آخری زمانے میں وہ کشمیر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

ملا بینش کے بارے میں، پیر غلام حسن نے لکھا ہے "دانشمند بے نظیر

وبلاعت تخمیر، درسخن سنجی لبیار دل پذیر بود" اور ڈاکٹر صوفی کا بیان ہے کہ وہ صاحب دیوان تھے۔ ان کا کلام کسی نے نہیں دیا ہے۔ ان کے حالات بھی دستیاب نہیں ہوتے۔ یہی حال ملا ثابت، قلندر بیگ اور آذری کا بھی ہے۔ یہ تینوں خوش فکر شاعر تھے۔ لیکن ان کے حالات اور کلام کا پتہ نہیں چلتا۔

انشاپردازی میں، محمد رفیع منشی اور میرزا کمال الدین رسوا بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ محمد رفیع شاعر بھی تھے، اور انشا، اور شاعری دونوں میں ان کا اونچا پایہ تھا۔ ان کی لبسر اوقات کا ذریعہ انشاپردازی تھی۔ امرا اور حکام وقت ان سے مراسلات لکھوایا کرتے تھے۔ محمد رفیع کے معاصرین میں تسلّی ایک ہجوگو گذرا ہے اس نے اہل کشمیر کی ہجو بحر طویل میں کہی تھی۔ یہ سیف خاں کی نظامت کا زمانہ تھا۔ جب تسلّی کی ہجو اس کی نظر سے گذری تو اس نے محمد رفیع منشی سے اس کا جواب لکھنے کو کہا۔ رفیع نے بحر طویل میں اس کا جواب لکھا تھا اور یہ نظم سیف خاں ناظم صوبہ (سنہ ۱۰۷۵ھ تا سنہ ۱۰۷۹ھ تا سنہ ۱۰۸۶ھ) کے پاس بیٹھے ہوئے، اس نے گھنٹہ بھر میں لکھ دی تھی۔ اس نظم کا اقتباس یہ ہے:

" لعنت اللہ برآں تسلّی کم اصل وبتہ کار وگنہ گار کہ خود را بزبان
دوسہ لک آدم موزوں وسخندان وسخن سنج ہمہ آراستہ از فضل وہنر
داد کہ ٹرپائے بہوش فشارند بغربا دبیا رند جہاں را
لیک حیف است کہ اوقات چنیں مردم پاکیزہ ودانا ونکوکاری
وخدا ترس وخوش اندیش کہ جز ذکر خدا فکر ندارند شود صرف لبازند تر
از خون سگی تیغ زبان را۔

آنچه در حق این طائفہ پاک زنادانی و بدبختی خود گفت ہمہ تہمت و بہتان نہ ہمہ کذب و پریشاں کہ جزائیش رسد از ایزد متعال دریں سال بہ تعجیل نہ تا خیر کہ فرصت نبود خوب با بن بی ادب خیرہ سر احمق و ناداں تا جزای بود این دو سہ حرفی کہ بر آید بہ زبان من آشفتہ حیران زرہ خشم و غضب زانکہ چہ لایق کہ کند تسلی قلتاق و قرمساق گدا خوی و سیہ روی و بد اندیش و عجیب ریش بہ بدگوئی ابنای زماں عادت و سرکین خورد گندہ کند کام و دہان را۔

کی رسد طعن تو بر مردم کشمیر کہ دارم خبر از حالی تو در وضع نوای بے خبر از خویش کہ در عہد جوانی بمیان بغل مردم بی گانہ کلاں گشتی و صد بار بگوش تو ز عشاق رسیدہ است کہ از کش مکش کم نتواں بود کہ دنبالہ گی در عقب اوست نا مداحی کہ بد بدار شد از طلعت نحست اثر ریش کہ نیشی نبود بیش باین طرز ز بدکاری و بدفعل گروہی ز عقب بود و تو در پیش خجل شو کہ ز بی عصمتی خویش سبک باختہ عمر گراں را۔ ۔ ۔

یہ ہجو طویل ہے۔ اساتذہ کشمیر کو بحر طویل میں بھی مہارت تھی اور بحرِ طویل میں بھی اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔

محمد رفیع کے کسی دوست کے گھر کو آگ لگی تھی، اس کی سوگواری میں اس نے ایک نظم لکھی تھی، جس کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:

از سوز خاطر تو وجودم بہ پیچ و تاب ۔۔۔ انجا فتاد آتش و این جا شدم کباب
وقتیکہ شعلہ از در و بام تو سر کشید ۔۔۔ کس آگہی نداد بہ این دیدہ پر آب

سرچشمہ زیر ہر مژہ من ذخیرہ بود از یک نگاہ خانہ آتش نندی خراب
تا این خبر رسید بگوشم ز سوز دل یکدم نگشت دیدۂ من آشنا بخواب
اما از سر نوشت کسی را گزیر نیست این حرف انتخاب نمودم ز صد کتاب

کشمیر کے ملحقات میں کشتوار کا علاقہ بھی ایک زمانہ میں فارسی علم و ادب کا مرکز رہا تھا۔ یہ علاقہ بھی کشمیر کی طرح سرسبز و شاداب ہے۔ یہ ایک سطح مرتفع ہے جو چناب کی تنگ اور سنگلاخ وادی میں سطح سمندر سے ۵۴۰۰ فیٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کا طول شمال سے جنوب کی طرف ۷۰۰۶ میل اور عرض ڈھائی میل کے قریب ہے۔ اس علاقے کا قدیم نام سمرتھہ گڈھ تھا۔ کشمیر کے اس علاقے کے بارے میں بھی یہ روایت مشہور ہے کہ یہ ایک جھیل تھی جو گوبرون سر کے نام سے موسوم تھی۔ زلزلہ سے پہاڑ پھٹ گئے اور پانی آہستہ آہستہ خارج ہو گیا۔ جب زمین برآمد ہوئی تو ایک زاہد شری پال نامی یہاں پہنچے۔ یہ جگہ انہیں قیام اور عبادت کے لئے پسند آئی۔ اس لئے وہ یہیں رہ گئے، اور ایک مندر تعمیر کیا، جو مہا کال جی مندر کہلاتا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کشیپ رشی بھی اپنے تین چیلوں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔

رشی کے قیام کے بعد، یہاں لوگ آنے اور بسنے لگے۔ بعد میں کشمیر کے لوگوں نے اس پر حملہ کر دیا، اور اسے فتح کر کے اپنی نو آبادی بنالی۔ یہ دو قبیلوں کے لوگ تھے (۱) روتھر (۲) گنائی۔ اس علاقہ کا نام کشتوار پڑ جانے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہاں، دوائیوں کی جڑی بوٹیاں اور درخت بہت ہیں۔ قدیم زمانے سے پنجاب کے ملحقہ علاقوں کے لوگ یہاں آتے اور جڑی بوٹیاں لے کر جاتے تھے۔ ہاڑی کے درخت یہاں بہت تھے، اس لئے اس کا نام چیبیر ہاڑ پڑ گیا تھا۔ اس کی پوست کو پنجابی میں

کشٹہ کہتے ہیں، اور "وار" احاطہ ہے۔ اس طرح پنجابیوں کی وجہ سے اس کا نام کشتواڑ پڑ گیا۔

کشتواڑ کی تاریخیں فارسی زبان میں لکھی گئیں ہیں۔ ان میں پنڈت شیبو کاک در کی "تاریخ کشتواڑ" اور پنڈت شیوجی در کی "تاریخ کشتواڑ" اہمیت رکھتی ہیں۔ روایات سے ہٹ کر تاریخی زمانے میں، کشتواڑ کی تاریخ کا سراغ مورخین نے راجا بکرماجیت (۳۷۵ء تا ۱۴۱۳ء) کے زمانے سے لگایا ہے مولوی حشمت اللہ نے راجاؤں کے سلسلے کے (۳۴) حکمرانوں کے نام اور کارنامے گنائے ہیں۔ ان حکمرانوں کے کشمیر کے ساتھ قدیم زمانے سے گہرے روابط رہے جب کبھی کشمیر میں بدامنی ہو جاتی یا بیرونی حملہ آور آتے تو کشمیر کے راجا، کشتواڑ بھاگ جایا کرتے تھے۔ اس کا اندازہ تاریخی پس منظر سے ہوتا ہے۔ کشتواڑ کے تیسویں راجا رائے بھان سنگھ (۱۵۴۰ء تا ۱۵۶۰ء) کے عہد میں میرزا حیدر کاشغری نے کشمیر سے فوج لے کر، کشتواڑ حملہ کیا تھا، پھر اکبر کے دور میں بھی ایک حملہ ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ کشتواڑ پر مغلوں کا قبضہ نہ ہو سکا، لیکن، نئے تہذیبی اثرات کشتواڑ بھی پہنچنے لگے تھے۔

چک سلطان یوسف شاہ کے عہد سے کشتواڑ کے راجاؤں کی حالت باجگذار راجاؤں کی سی ہو گئی تھی۔ چنانچہ راجہ بھیجے سنگھ کی بیٹی شنکر دیوی یعقوب شاہ چک کو بیاہی گئی تھی۔ بھیجے سنگھ کے بیٹے اور جانشین بہادر سنگھ کی بیٹی جس کا نام فتح خاتون لکھا ہے، علی شاہ چک سے بیاہی گئی تھی۔ راجا مہا سنگھ (۱۶۵۰ء تا ۱۶۵۶ء) کے زمانے میں، مغل ہندوستانی اور کشمیری تہذیب اور شائستگی کی چھاپ کشتواڑ پر اتنی گہری ہو چکی تھی کہ، اس راجا کے دربار کا کام فارسی میں ہونا تھا اور شعر و ادب کا ذوق پڑھے لکھے لوگوں میں

عام ہو گیا تھا۔ اسی اثر کے باعث کشتواڑ کے امرا اور راجاؤں میں بھی فارسی کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ راجہ مان سنگھ جس نے سنہ ۱۶۵۰ء سے ۱۶۵۶ء تک حکومت کی تھی، فارسی کا شاعر تھا۔ اس کی غزل کے اشعار ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ذوق بہت پاکیزہ تھا۔ ایک غزل کے کچھ شعر ہیں:

دلا از لب بلا کردی چہ کردی ۔۔۔ قدم چوں لازلا کردی چہ کردی
الا ای لالہ رخ زاں سرو بالا ۔۔۔ قیامت ہا بپا کردی، چہ کردی

مہا سنگھ کے جانشینوں میں کیرت سنگھ بھی فارسی کا ذوق رکھتا تھا۔ اس کے زمانے میں کشتواڑ بزرگانِ دین اور علماء کا بھی مرکز بنا ہوا تھا۔ قاضی ابراہیم جو کشتواڑ کے قاضی تھے، اچھے عالم تھے، انہیں بزرگوں کے اثر سے کیرت سنگھ کی توجہ اسلام کی طرف ہوئی اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام سعادت یار خاں رکھا گیا تھا۔ کیرت سنگھ فارسی کا اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کی ایک عمدہ غزل ذیل میں درج ہے:

ز قید این و آں رستن رہا ہیست ۔۔۔ ز خود بیگانہ گشتن آشنائی است
چو نخل اندر زمستاں باش عریاں ۔۔۔ لباس پارسائی خود نمائی است
مسی را کیمیا کردن ہنر نیست ۔۔۔ ذری را خاک کردن کیمیائی است
بہمت میجزم سوگند یاراں ۔۔۔ طلب گر از خدا باشد گدائی است

راجا نے سنہ ۱۶۶۴ء (م ۱۰۷۵ھ) میں ایک اقرار نامہ بھی لکھ کر عالمگیر کے دربار میں بھیجا تھا، جس کی نقل مولوی حشمت اللہ خاں نے اپنی تاریخ کشتواڑ میں دی ہے۔ اس اقرار نامے کا اقتباس درج ذیل ہے:

"بندہ درگاہ خلائق پناہ کیرت سنگھ زمیندار تیہ کشتواڑم متعہد

می شوم کہ از قبل نفس خود و متصدیان خود بجانب اولاد خواجہ زین الدین و سائر مسلمین مذکورین چہ از مردم سوداگر و چہ از مردم زمیندار از جمیع تکالیف نامشروعہ مرفوع القلم باشند۔ بدیں موجب یکی آنکہ احدی از عمال و متصدیان این جانب درمال آنہا نقصان نہ رسانند . . . "

اس زمانے میں حافظ عبد الغفور، شعر وسخن میں امتیاز رکھتے تھے۔ انھوں نے کشتوار کے ایک بزرگ حضرت سید فرید الدین کی منقبت کہی تھی، جس کے کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

درین خاک گنج نہانی است ایں — فرید است و فرد جہانی است ایں

بجاں گفت ایں نکتہ ہای شگرف — نہ چوں شاعراں شعر خوانی است ایں

بصورت چو مسکیں بمعنی غفور — بہ تحقیق فرد جہانی است ایں

خواجہ جواہر یکتا جو شاعری کے علاوہ فن تعمیر میں مہارت رکھتے تھے، اور خطاطی میں بھی ان کی شہرت تھی انہیں سے احسن نے اپنے باغات کی تعمیر کروائی تھی۔ مچھ بھون کا ہر کاری باغ بھی انہیں کی نگرانی میں تعمیر ہوا تھا۔ ان کے بیٹے، خواجہ شمس الدین فن تعمیر کے ماہر تھے۔ عالم گیر کے عہد میں اننت ناگ کا چشمہ، ان کی نگرانی میں بنوایا گیا تھا۔ پوتے خواجہ جہانگیر، کو بھی فن تعمیر میں مہارت تھی۔ چنانچہ حضرت مخدوم شیخ حمزہ کا مقبرہ انہیں نے تعمیر کرایا تھا۔

اندرابی خاندان کے ایک بزرگ شاہ محمد صادق اپنے عہد کے سربرآوردہ علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ حافظ قرآن اور قاری بھی اور قرات سبعہ کے ماہر تھے۔ علوم باطنی میں میر علی قاری سے استفادہ کیا تھا۔ وہ دہلی میں بھی مقیم رہے اور وہاں خواجہ خورد کے ہاتھ پر نقش بندیہ طریقہ میں بیعت کی

تھی۔ اکثر حالت جذب میں رہا کرتے اور قلندرانہ وضع سے زندگی بسر کرتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے اور صادق تخلص کرتے تھے۔ ان کے اشعار متصوفانہ نکات اور معرفت کے مسائل سے پُر ہیں کچھ شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

ہر کہ آمد گل زباغ زندگانی چید و رفت	آمد و بر سنگی ملک جہاں خندید و رفت
از ازل صادق بدنیا میل آمیزش نداشت	چند روزی آمد و یاراں خود را دید و رفت

ان کا ایک مستزاد ہے:

یکچندپیٔ زینت و زیور گشتیم	در عہد شباب
یکچندپیٔ دانش و دفتر گشتیم	کردیم حساب
چوں واقف ایں جہاں ابتر گشتیم	ایلک درباب

صادق کی ایک رباعی بھی یہاں نقل کی جاتی ہے:

یک چند سوارہ سیر دشتی کردیم	یک چند پیادہ پشت لشتی کردیم
دیدیم کہ ازیں کوچہ ندارد پایاں	گشتی کردیم و بازگشتی کردیم

شاہ صاحب کا انتقال ۱۰۹۳ھ میں ہوا۔

میاں محمد امین دار، بڑے عالم تھے اور علم و فن کی اشاعت میں ساری عمر گذاری تھی، تعلیم سے فارغ ہو کر وہ لاہور گئے تھے، جہاں شاہی ملازمت میں رہے۔ شیخ عثمان جالندھری سے جو میاں عبدالوہاب لاہوری کے خلیفہ تھے، ارادت تھی۔ اپنی ساری جائداد فروخت کر کے مساکین میں تقسیم کر دی تھی۔ انہیں اشاعت علم کا بے حد شوق تھا اور علما کی مدد کر کے انہیں عوام کو تعلیم دینے کی ترغیب دیتے تھے۔ انھوں نے دو تصانیف کیں تھیں جن میں ایک "کتاب قصرات" اور دوسری "رسالہ ضروریہ" کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۶۸۶ء (م ۱۰۹۹ھ) میں راہی ملک بقا ہوئے۔

Rekhta Download.com

حافظ عبد اللہ عالم تھے اور زہد و تقویٰ میں امتیاز رکھتے تھے؛ اکل حلال کا انہیں اتنا خیال تھا کہ قرآن مجید لکھ کر فروخت کرتے اور اس سے جو آمدنی ہوتی اسی پر گذارہ کرتے تھے۔ ملا طیب ان کے پیر طریقت تھے۔ حافظ صاحب فتح کدل کے قریب رہا کرتے تھے اور حافظ عبد اللہ فتح کدلی کے نام سے مشہور تھے۔ شعر و سخن کا بھی اچھا مذاق تھا۔ ان کی ایک رباعی یہاں نقل کی جاتی ہے

یک چند پی زمرد آوره شدیم
یک چند بیاقوت تر آلوده شدیم
آسودگی بود بهر کیف که بود
شستیم به آب توبه و آسوده شدیم

حافظ عبد اللہ کا انتقال ۱۱۰۵ھ میں ہوا۔

"مناقب غوثیہ" حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے حالات اور ان کی بزرگی کی تفصیلات کے بارے میں ایک رسالہ شاہ صدیق القادری نے تصنیف کیا تھا، جس کے ابتدائی حصہ کا اقتباس یہ ہے:

"میگوید بندہ ضعیف. میمقدار نہ مسار امیدوار بدرگاہ حضرت غفار القوی فقیر ولی ملوک شاہ الصدیق القادری یکی از بندگان درگاہ و کمینہ خاکروبان بارگاہ حضرت غوث ربانی شیخ عبد القادر جیلانی .. .."

شاہ صدیق القادری کے حالات دستیاب نہیں ہوتے۔

ملا احمد ابن عبد المصور کشمیری، حضرت خواجہ محمد ہاشم کشمیری کے مرید تھے۔ انھوں نے ۱۱۰۸ھ میں "خوارق السالکین"، کشمیر کے اولیا کے حالات میں لکھی تھی، جس کا متبادل نام "تاریخ ہادی" بھی ہے۔ ملا احمد نے لکھا ہے کہ کشمیر کے بزرگوں کے حالات میں بہت کم کتابیں ملتی ہیں، اس لئے انھوں نے یہ بیڑا اٹھایا۔ لکھتے ہیں:

"بنابر آں ایں ضعیف خاکسار نحیف بی مقدار سرگشتہ میدان نادانی وسگ درگاہ سلسلہ ہمہ دانی، غرق دریای عجز وقصور، احمد ابن الصبور کشمیری کہ خادم حضرت خواجہ محمد ہاشم کشمیری است قدس اللہ سرہ بعجز وانکسار امداد از بزرگان عالی مقدار استدعا نمودہ در بیان احوال مقربان الٰہی وبزرگان مورد فتوحات نامتناہی سعی بلیغ بکار بردہ مختصری مسمی بخوارق السالکین کہ تاریخ اتمام ایں نسخہ است تصنیف کرد۔"

آغاز حضرت سید شرف الدین بلبل شاہ کے حالات سے کیا ہے اور طوماں شاہ کے احوال پر اس کا اختتام ہوتا ہے، جن کی وفات کا قطعہ تاریخ حسبِ ذیل لکھا ہے:

رفت طوماں شاہ از دنیای فانی چوں بروں

زد قلم سال وصالش "شاہ مجذوباں" رقم

"شاہ مجذوباں" سے ۱۱۰۸ھ برآمد ہوتا ہے۔

اس عہد کے دوسرے علما میں مولوی محمد محسن کھشو، ملا محمد اشرف منٹو اور ملا عنایت اللہ شال بھی سر برآوردہ حیثیت رکھتے تھے۔ محمد محسن کھشو، محمد امین گنائی کے شاگرد تھے اور ملا نازک سے بیعت تھے۔ انھوں نے "ہدایہ" اور "مطول" پر حواشی لکھے تھے۔ ملا کا انتقال ۱۷۰۷ء (م ۱۱۱۹ھ) میں ہوا۔ ملا محمد اشرف نے فقہ اور حدیث کے درس ملا محمد محسن سے لئے تھے۔ یہ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں "علم قرات"، "رد شیعہ" اور "جواہر الحکم" مشہور ہیں اشرف کا انتقال کا سنہ ۱۷۱۳ء (م ۱۱۲۵ھ) ہے

کچھ عالم خواتین بھی اس عہد میں ہوئی ہیں جو درس وتدریس کے ذریعے

علم و ادب اور فارسی زبان کی خدمت میں مصروف رہیں۔ ان میں حافظہ مریم کا درجہ بلند ہے۔ وہ میرزا شکر اللہ کی بیوی تھیں۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے عالم گیر نے اپنی بیٹی زیب النسا کی تعلیم و تربیت کے لئے انہیں منتخب کیا تھا۔ حافظہ کے بیٹے عنایت اللہ خاں بھی علم و فضل سے بہرہ رکھتے تھے۔ کشمیر کی نظامت پر بھی وہ کچھ عرصہ تک فائز رہے تھے۔ حافظہ مریم کا انتقال ۱۶۸۷ء (م ۱۰۹۷ھ) میں ہوا۔ ان کی وفات پر کسی نامعلوم شاعر نے حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا تھا۔

از جہاں رفت مریم دوراں	بردہ با خویش حلیہ ایماں
دفن بعد از نماز جمعہ شدہ است	ہر کہ و مہ بہ تعزیت بنشست
عقل بہر وفات نیک سرشت	گفت تاریخ شد بسوی بہشت

عنایت اللہ خاں کے دور نظامت میں ایک مدرسہ "مدرسہ منصوریہ" کے نام سے سرینگر میں قائم ہوا تھا، جس کے صدر اخوند ملا سلیمان کلو تھے اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے زلگام کا گاؤں وقف کیا گیا تھا۔ اس مدرسے سے بھی کئی تشنگان علم سے سیراب ہو کر نکلے اور علم و ادب اور فارسی زبان کی خدمت کی۔

عالم گیر نے کشمیر کے جن علما کی سرپرستی کی ان میں سے ایک ملا عبدالرشید زرگر بھی تھے۔ زمانہ طالب علمی سے ان میں جودت کے آثار نمایاں تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں سیف خاں ناظم صوبہ نے باغ جہاں آرا میں علما کا ایک مباحثہ اور مناظرہ مقرر کیا تھا۔ عبدالرشید اس مناظرہ میں شریک ہوئے اور بحث میں حصہ لے کر علما پر اپنا سکہ بٹھا دیا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ عالم گیر کے دربار سے متوسل رہے۔ عالم گیر نے انہیں برہان پور کا قاضی مقرر کر کے بھیجا تھا۔

"تحفۃ الفقراء والاولیا" محمد مراد ابن محمد طاہر المفتی عرف ٹینگ کی تصنیف ہے، جو ۱۱۲۵ھ میں مکمل ہوئی۔ اس میں مصنف نے اپنے عہد کے زاہدوں اور صالحوں کے حالات جمع کئے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

"کلمہ چند در اجمال احوال اولیاء عامہ یعنی مشائخ و درویشاں وزہاد و صلحاء عصر خود کہ ہمہ آنہا در حیات میسر شدہ بقلم آوردہ شود چہ از وطن کہ بلدہ کشمیر است وچہ از ہندوستان کہ مسکن مرشد فقیر است و عنوان رسالہ مزین با سامی سامی حضرات عالیات سرہندی .. .. .. ایں رسالہ از نام نامی ایشاں زیبا نمود۔"

شیخ محمد چشتی رادھو مشہور اشائی قبیلے سے تھے، اور مولانا حیدر چرخی سے کسب فیض کیا تھا۔ ابتدا میں مدرسی کی، لیکن شیخ علی محمد چشتی سے بیعت ہونے کے بعد، روحانی مقامات کے حصول میں منہمک ہو گئے۔ پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ تصوف میں ایک لاکھ سے زیادہ اشعار ان کے طبع زاد ہیں، اور نثر میں بھی کئی تصانیف ہیں۔ ان میں "عدۃ اللقا" "سراج السالکین"، "گنج فقر" اور "کنز العشق" قابلِ ذکر ہیں۔

"عدۃ اللقا" منظوم رسالہ ہے، جس میں لا الٰہ الا اللہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا آغاز ہوتا ہے :

ہست بہر لقای پاک الہ — عدۃٌ لا الٰہ الا اللہ
ایں مراد بلند گر خواہی — ذکر کن لا الٰہ الا اللہ
شمع راہ ہدایتِ نبوی — نور دیں لا الٰہ الا اللہ

آخر میں اسی انداز میں اپنے لئے دعائے خیر اس طرح کرتے ہیں :

ختم کار ہمہ سعادت باد　　بہیں لا آلہ الا اللہ
ختم کار محمد چشتی　　باد بر لا الہ الا اللہ

اس رسالے کے کاتب بابا محمد یحییٰ چشتی، غالباً شیخ راد ھو کے معتقدین میں سے تھے۔ شیخ راد ھو کا ایک اور رسالہ جو "گنج فقر" کے نام سے موسوم ہے، منظوم ہے۔ رسالے میں فقر کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ "تعلیقات اور واردات" کے نام سے انھوں نے ایک رسالہ ۱۲۶۳ھ میں مرتب کیا تھا، جس کے موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مشتمل بر کشف دقایق رموز عروج نبوی و متضمن ابراز دقایق شہود قرب مصطفوی ...... "

"کنز العشق" شیخ راد ھو کی ایک طویل مثنوی ہے، جس میں تصوف کے مسائل اور نکات بیان کئے ہیں۔ اس مثنوی سے حمد باری تعالیٰ کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

ای دل و جانم فدا ای در گہت　　تو تیای چشم من خاک درت
خاک راہ تست آب روی ما　　درد عشق تست جاں داروی ما

شیخ راد ھو کا انتقال اسّی برس کی عمر میں ۱۲۰۱ھ میں ہوا۔

عالم گیر کے عہد میں اردبیل سے ایک مشہور عالم، ملا صفی الدین اردبیلی، ہندوستان آئے تھے۔ عالم گیر کی بیٹی زیب النساء نے، ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر، ان کے لئے وظیفہ مقرر کیا اور کشمیر روانہ کیا تھا تا کہ کشمیر کی پرسکون فضا میں مقیم رہ کر وہ "تفسیر کبیر" کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ یہ ترجمہ کشمیر ہی میں مکمل ہوا، اور "زیب التفاسیر" کے نام سے موسوم ہے۔

میرزا اکمل الدین بدخشی عہد عالم گیر کے سر بر آوردہ علما میں سے تھے۔ ان

کے خاندان کو شاہان دہلی سے تقرب حاصل تھا۔ میرزا کے دادا ملک محمد خاں تاشقند سے بدخشاں چلے گئے تھے، جہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد شہنشاہ اکبر کے عہد میں وہ ہندوستان آگئے۔ اکبر نے ان کے علم و فضل اور فوجی صلاحیتوں کا لحاظ کرتے ہوئے، انہیں محمد قلی خاں کا خطاب عطا کر کے ۱۵۹۰ء میں کشمیر کا گورنر مقرر کیا تھا۔ ان کا انتقال سرینگر ہی میں ہوا۔ محمد قلی خاں کے فرزند عادل بیگ خاں نے سرینگر ہی میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ انہیں کے چھوٹے فرزند میرزا اکمل الدین بدخشی اکملؔ تھے۔ عادل بیگ خاں کی شاہجہاں کے دربار میں قدر و منزلت تھی۔ جب میرزا اکملؔ تولد ہوئے (۱۶۴۳ء) شاہ جہاں کشمیر ہی میں تھا۔ اس نے نومولود کا نام کامل رکھا تھا۔ اس کا تذکرہ میرزا اکمل نے ذیل کے شعر میں کیا ہے۔

کاملم شاہ جہاں نام نہاد ست آں روز

کندریں دار فنا کرد خدا میلا دم

حضرت خواجہ حبیب اللہ عطار کے آپ ارادت مندوں میں تھے اور اکمل الدین کا لقب آپ کو مرشد ہی نے عطا کیا تھا۔ فرماتے ہیں:

اکمل الدین لقبم کرد ز احسای مرشد   چونکہ بسیار بہنجاک در او افتادم

میرزا اکمل کی تعلیم اور تربیت شہزادگان، داراشکوہ اور اورنگ زیب کے ساتھ ہوئی تھی۔ علامہ ابو الفتح کلو قلاش پوری، میرزا کے معلم رہے تعلیم کی تکمیل کے بعد، میرزا اکمل، خواجہ حبیب اللہ عطار کے ارادتمندوں میں داخل ہوئے، اور جیسا کہ اوپر کے شعر میں اشارہ کیا ہے، مرشد کی زندگی بھر انہیں کی خدمت میں رہے۔ "بحر العرفان" جو آپ کا یادگار کارنامہ ہے اس کے محرک مرشد ہی ہوئے تھے۔

میرزا اکمل، کشمیر کے سربرآوردہ اولیا اور پیشوایان دین میں سے ہیں۔ تصوف سے آپ کو گہرا لگاؤ تھا۔ اور تصوف اور عرفان کے رموز اور نکات اپنی مثنوی میں بڑی سلاست اور خوبی سے بیان کیے ہیں۔ یہ کشمیر میں فارسی ادب کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ مولانا جلال الدین رومی اور شیخ فریدالدین عطار کا آپ پر گہرا تھا، جس کا پرتو "بحر العرفان" میں جھلکتا ہے اس مثنوی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حکایتیں، تشبیہیں اور استعارے کشمیر کے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثنوی کے چار دفتر یا چار جلدیں ہیں اور کوئی اسّی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز ذیل کی ابیات سے ہوتا ہے، جو حضرت مرشد کے انتقال کے بعد، آپ کی طرف سے القا ہوئے تھے:

حمد للّٰلہ حامد و محمود — قوت و فعل خویش را معبود

از جمال و جلال خود مشحوں — کرد چوں را پدید از بے چوں

جلوہ گر دانش از صفات آمد — ایں صفت ہا دلیل ذات آمد

مثنوی کے دفتر اوّل کو میر حبیب اللہ کاملی نے مرتب کر کے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ ۱۳۸۱ھ میں سرینگر سے شائع کیا ہے۔

میرزا اکمل نے ایک طویل قصیدہ "مخبر الاسرار" کے عنوان سے لکھا تھا اس میں اپنے کچھ حالات نظم کئے ہیں۔ اس قصیدے سے دو شعر ابتدا میں نقل کیے جا چکے ہیں۔

میرزا اکمل کا قصیدہ "مخبر الاسرار" مختصر رسالہ ہے، جس میں وجود انسان اور وجود مطلق کا تذکرہ کرنے کے بعد، آنحضرت سے لے کر اپنے سلسلے کے بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

خواجہ یعقوب کہ ثانی سری ہست جنید — نائب حضرت قاسم بود ایں استادم

شیخ من مرشد دیں شیخ حبیب اللہ است | گفت او خرقہ دیں حضرت قاسم دادم
خرقہ پوشید از و حضرت قاسم شہ دیں | اوست استاد طریقت بَرہ ارشادم
اکمل الدین لقبم کرد ز احساں مرشد | چونکہ بسیار بخاک در او افتادم
کاملم شاہ جہاں نام نہادہ آں روز | کند ریں دار فنا کرد خدا میلادم

آخر میں مخبر الاسرار کے بارے میں یہ شعر کہا ہے :

ایں قصیدہ کہ بود مخبر الاسرار م | بہر ارشاد محبانست کہ شرحش دادم

میرزا اکمل کا انتقال ۱۷۱۸ء (م ۱۱۳۱ھ) میں ہوا - ملا عبد الرسول بینوا نے، جو خوش فکر شاعر اور آپ کے معتقدین میں تھے، قطعہ تاریخ کہا تھا، جس کے چند شعر ہیں :

ای دریغ از رفتن پیر طریقت ای دریغ | آنکہ اندر فقر عالیقدر بود و بی مثال
آں معارف دستگاہ و آں حقائق را پناہ | مرشد مخلص نواز و شاہ بی مال و منال
بہر تاریخ وصالش بے الف گفتا خرد | پیر کامل بحر عرفاں اکمل اہل کمال

مورخ خواجہ اعظم دیدہ مری بھی میرزا اکمل کے خلفا میں تھے اور اس موقع پر تاریخ کہی تھی - آپ کے خلفا میں شیخ عبد الوہاب نوری بڑے پایہ کے عالم ہوئے، انھوں نے آپ کے حالات میں ایک بسوط کتاب "فتحات کبرویہ" کے نام سے لکھی تھی، جس کا ذکر آگے آرہا ہے -

میرزا اکمل کا مسلک خدمت اور ہدایت خلق تھا - وہ بہت وسیع مشرب رکھتے تھے - وحدت ادیان کے قایل تھے - شاعرانہ صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی ممتاز تھے، ذیل کے اشعار سے آپ کی فکر کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے :

کفر و اسلام را بجنگ انداخت | خود بر آں جنگ شد تماشائی

خود شود مدعی کہ دین این است | خود دہد کفر را توانائی
اکمل الدین یقین ہمی دارد | مذہبش وحدت است و یکتائی

حضرت اکمل بدخشی کے مریدوں اور خلفا میں، اس عہد کے جید عالم، شاعر، اور مورخ شامل تھے۔ خواجہ اعظم اور شیخ عبدالوہاب نوری کا ذکر، حضرت اکمل کی وفات کی تاریخ کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ ان میں، شیخ عبدالوہاب نوری، شیخ نعمت اللہ کلو، میرزا فرہاد بیگ، اور حاجی عبدالسلام قلندر کو بڑا مرتبہ حاصل تھا۔ جناب حبیب اللہ کابلی مرتب "بحر العرفان" نے زہد و تقویٰ اور ریاضت کے لحاظ سے، شیخ نعمت اللہ کلو کو حضرت بدخشی کے خلفا میں سب سے پہلا درجہ دیا ہے۔ لیکن جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے، شیخ عبدالوہاب نوری، مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس کے علاوہ حاجی عبدالسلام کو بھی ان کی ایک تصنیف کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے۔

شیخ عبدالوہاب نوری، شیخ یعقوب صرفی کے اخلاف میں سے تھے۔ ان کا اصلی نام فخر الدین تھا۔ مرتب "بحر العرفان" نے انہیں "مخزن اسرار یزدانی، معدن انوار رحمانی" کے القاب سے ملقب کیا ہے۔ حضرت اکمل سے بیعت کے بعد، اپنی ریاضت شاقہ سے وہ جلد ہی نمایاں ہو گئے، اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ قاضی دولت شاہ پیسوی سے انھوں نے کسب فیض کیا تھا۔ خود ان کے خلفاء کی تعداد تین سو چالیس بتائی گئی ہے۔ عالم و فاضل تھے اور شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ نوری کے دو اہم کارنامے ہیں (۱) فتحات کبرویہ (۲) عین العرفان۔

"فتحات الکبرویہ" کبرویہ سلسلے کے بزرگوں کے حالات اور حضرت بدخشی کے کمالات باطنی، ملفوظات اور حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے دیباچے میں

لکھتے ہیں :-

" اما بعد ساکن زاویہ التہاب طالب گوہر نایاب گرفتار سلسلہ شیخ ابو الجناب حیران بوادی دوری و مہجوری بتلائے درد فراق معنوی وصوری عبد الوہاب ابن رشید الدین کشمیری المتخلص بہ نوری .. .. معروض اصحاب صدق وصفا و ارباب محبت و ولا میدارد چوں ایں ذرہ بیمقدار از صغرسن باستیفای انوار فیوض خورشید سپہر .. .. مخدومی وخداوندی وسیدی ومولای شیخ اکمل الدین محمد کامل بدخشی .. .. کہ جانشین سلسلہ حضرات علیہ عالیہ کبرویہ و ہمدانیہ مذہبہ است .. .. .. طریق اتباع می نمود و پیوستہ بذکر اذکار اینحضرات عالی درجات .. صفحہ خاطر بہشت آباد می نمود و پیوستہ این تمنا در دل وایں سودا در سر داشت کہ بعون الٰہی تعالیٰ شانہ، مجموعہ در ذکر ایں حضرات کہ تاحال منضبط نشد بقلم آرد .. .. "

مصنف نے ان کتابوں کا تذکرہ بھی کر دیا ہے ، جو اس تصنیف کی ترتیب میں ان کے پیش نظر تھیں۔ ان میں رسالہ مجددیہ تصنیف شیخ ابو الجناب رضی اللہ عنہ ، ومرصاد العباد ، ورسالہ اقبالیہ ونفحات الانس و معرفۃ المرشدین ، وخلاصۃ المناقب ، وجادۃ العاشقین شیخ یعقوب صرفی ومقامات میر محمد خلیفہ ونور نامہ واسرار الابرار وغیرہ اہم ہیں ۔ "فتحات الکبرویہ" اسم تاریخی ہے ، تصنیف ایک وسیع مقدمہ کے علاوہ کئی فصلوں پر منقسم ہے ۔

"عین العرفان" طویل مثنوی ہے جو اپنے مرشد حضرت اکمل الدین اکمل کی "بحر العرفان" کے اتباع میں لکھی گئی ہے - یہ بھی تصوف اور عرفان کے رموز پر مشتمل لکھی ہے - ان میں مرشد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

مرشد من کہ یافت فصل خطاب　　کرد تصنیف چار جلد کتاب
بحر عرفان نہاد آنرا نام　　فیض بخش جہاں چہ خاص و چہ عام

اپنی مثنوی کے نام کے بارے میں لکھا ہے :

ہاتفی داد این ندا ہر سو　　عین عرفان بحر عرفان گو (۱۱۴۲ھ)

عبدالوہاب نوری نے نوے سال سے زیادہ عمر پائی اور ۱۱۸۶ھ میں انتقال کیا -

"عین العرفان" کشمیر اور کشمیر سے باہر کے بزرگان دین کے حالات اور ملفوظات کی تصریحات خوبی سے کی ہے - حالات کے درمیان میں پند و نصیحت پر مشتمل حکایات اور اگلے بزرگوں کی منقبت میں قصائد بھی شامل کئے ہیں - میرزا اکمل الدین بدخشی کی منقبت میں لکھے ہوئے ایک قصیدے کے چند شعر ہیں -

شکر للہ کہ عقدہ ام شد وا　　تا شدہ رہبرم شہ بینا
شیخ اکمل غیاث ملت و دیں　　قطب حق ہادی فنا و بقا
معدن علم و منبع عرفاں　　مرشد مرشدان راہ صفا

حاجی عبدالسلام بن محمد امین بن شیخ محمد بن زاہد بن حضرت شیخ یعقوب دار الہمدانی الکشمیری "مخزن العرفان" کے مصنف ہیں جو طویل مثنوی تصوف اور معرفت کے مسائل سے متعلق ہے -

اپنے اور اپنے پیر کے بارے میں دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"کہترین مریدان قدوۃ المحققین .. .. .. شیخ اکمل الدین الکامل بدخشی است .. .. .. میگوید کہ آں رہنمای تحقیق وآں عقدہ کشای صاحب توفیق اوقات شریف خود بہ نصیحت قوم زماں صرف کردہ .. .. .."

مثنوی "بحر العرفان" کے ابتدائی اشعار "حمد للہ حامد و محمود" سے یہ مثنوی شروع ہوتی ہے۔ آگے "در بیان ایجاد قلم .. .." کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

کرد لوح و قلم چو حق ایجاد　　منظر آں بحکم حق الیستاد

شیخ علی محمد چشتی سلطان پور کے باشندے تھے۔ کشمیر کی کشش انہیں کھینچ لائی اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ علم کتابی کے بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ سماع سے گہرا شغف تھا اور خاص طور پر کشمیر کے صوفیانہ کلام سے انہیں عشق تھا۔ توحید پر ایک رسالہ رنگین عبارت میں تصنیف کیا تھا۔ "شیخ علی دین" سے ان کی تاریخ وفات نکالی گئی تھی۔

شیخ محمد مراد رفیقی، شیخ احمد زاہد کے پوتے تھے، جو کشمیر کے سربرآوردہ علما میں سے تھے۔ دادا کی طرح انہیں بھی علوم میں کمال حاصل تھا، خاص طور پر حدیث اور فقہ کے عالم مانے جاتے تھے۔ پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ یہ مصنف تھے اور علم کے ہر شعبے میں ان کی تصانیف تھیں۔ "انتباہ فی ذکر اولیا اللہ" مشہور کتاب ہے۔ شاعری کا بھی ذوق تھا۔ انکی ایک رباعی درج ذیل ہے۔

از غم ہجراں گرفتارم دریغ　　نالہ و زاری ازاں دارم دریغ
در فراق یار سوزانم چو شمع　　زاں ہمیشہ اشک می بارم دریغ

اورنگ زیب کے عہد کے انشاپردازوں میں میر کمال الدین اندرابی رسوا

نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ کشمیر کے شرفا میں شمار ہوتے تھے۔ شاعری اور انشاپردازی کا شوق انہیں عنفوان ہی سے تھا۔ کشمیر میں علوم کی تحصیل کے بعد وہ دہلی گئے تھے اور شہزادہ اکبر شاہ کی سرکار میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ شہزادہ کی بغاوت اور معظم کے ہاتھوں اس کی شکست کے بعد، جب اکبر شاہ ایران فرار ہو گیا، تو رسوا کشمیر لوٹ آئے، اور خواہش مندوں کو انشا کی تعلیم دیتے رہے۔ رسوا اچھے خوشنویس بھی تھے، اور انشا کے علاوہ خوشنویسی میں بھی لوگوں کی تربیت کرتے تھے۔ کشمیر میں اس زمانے میں فاضل خان ناظم تھا (۱۱۰۹ھ تا ۱۱۱۳ھ)۔ اس نے میر صاحب کی صلاحیتوں کی قدردانی کی اور انہیں ملازمت اور جاگیر بھی عطا کی تھی۔ انشاپردازی اور خطاطی میں رسوا کے بہت سے شاگرد ہوئے۔ ان کے لکھے ہوئے رقعات، ان کے ایک شاگرد لچھرام نے جمع کیے ہیں۔ اور انہیں اپنے دیباچے کے ساتھ "رقعات مرزا کمال" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس کے کئی مخطوطے، ریسرچ لائبریری، سرینگر میں محفوظ ہیں۔

لچھرام نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میر کمال نے جو رقعات خواتین بلند مکاں اور دیگر اخوان زماں کے لئے قلمبند کیے تھے، وہ ان کی بے توجہی کی وجہ سے منتشر رہے۔ کسی شاگرد کی توجہ انہیں جمع کرنے کی طرف مائل نہیں ہوئی تھی۔ مرتب نے ساری تحریروں کو حسب ذیل فصلوں میں ترتیب دیا ہے۔ فصل اوّل تہنیت نامہ جات۔ فصل دوئم رقعات جو طلب اشیا کیلئے لکھے گئے تھے، فصل سیوم دوستوں کے تحائف کی وصولی فصل چہارم سفارش نامے فصل پنجم دوستوں کے رقعات کے جوابات۔ فصل ششم دعوت نامے فصل ہفتم۔ دوستوں کے پاس بھیجی ہوئی اشیا کے ساتھ خطوط فصل ہشتم

متفرق۔ فصل نہم در ریختہ و کلام منظوم و قصائد و اشعار وغیرہ — پہلا رقعہ جو نواب عنایت اللہ خاں کی مکہ معظمہ سے واپسی پر لکھا ہے اس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

آنرا کہ گزید خالق از نوع بشر ۔۔۔ بر سر نہند از دولت دارین افسر
امروز بہ نقد حسن نیت ادرا ۔۔۔ دار عقبیٰ دہند و دنیا بر سر

"مصداق این مقال صورت حال فرخندہ فال مطلع انظار لطف و عنایت ابدی مطرح انوار فضل و کرامت سرمدی قافلہ سالاران رہ نوردان کعبہ رضای سبحانی بندار بندر دولت باقی و سعادت جاودانی ماخذ این سفائن رحمت الٰہی و معلم مراکب دانش و آگاہی است ۔۔ ۔۔ کہ بر ہنمونی خضر توفیق و سرادل نیت نیک کہ رفیقی است شفیق در اندک زمانی سود بسیار و نفع بیحد و شمار اندوختہ بعز اختر طالع یلوامع جبہ سائی عتبہ عرش مرتبہ حبیب رحمانی افروختہ در طریق تحصیل شرف دین و دنیا و کسب آبروی اولی و اُخروی دو اسبہ تاختند و ہمعنان حفظ الٰہی و دوش بدوش تائید نامتناہی بمقدم مکرم بہار شمیم ہندوستان را بہشت نشان ساختند۔ شکر این عطیہ کبری و سپاس این موہبت عظمیٰ بر سپاہ و رعیت این ملک عموماً و بر فرق کنندگان میان حق و باطل خصوصاً واجب است ۔۔ ۔۔"

عنایت اللہ خاں ۱۱۲۴ھ سے ۱۱۲۵ھ تک کشمیر کے گورنر رہے تھے۔

میر کمال الدین شعر و سخن کا بھی اچھا مذاق رکھتے تھے۔ فارسی کے

علاوہ اردو میں بھی ان کا کچھ کلام ملتا ہے۔ ذیل کا اقتباس ان کے ایک قصیدے سے لیا گیا ہے:

صباح عید کہ زد خرمی بعیش صلا — زخواب جستم خوشدل چو گنج دید گرا
کشادہ چشم تماشا بہر طرف دیدم — زجام عشرت سرخوش چہ پیر و چہ برنا
بہ بندگی سنجی آں کوکب نغمہ شادی — بپای کوبی آں ساز تہنیت بنوا
یکی بقصد مصافح گرفتہ دست ہوس — دگر بشوق معانق بغل گذاشتہ وا

رسوا کی غزل کے کچھ شعر ذیل میں درج ہیں:

بکام خیر خواہ خود دو روزی زندگانی کن — کہ خواہی بود آخر عمرہا یار بداندیشاں
در آغوشم بکن جا خون نگرید کو رقیب امشب — در آرایش بیفزا کوری چشم حسد کیشاں
سمند ناز چوں جولاں دہی در عرصہ خوبی — خدا را گوشہ چشمی بحال زار درویشاں

پنڈت نارائن کول عاجز کی "تاریخ کشمیر"، جو "منتخب التواریخ" کے نام سے مشہور ہے، عالمگیر کے آخری عہد کی مشہور تواریخ میں سے ہے یہ قدیم تواریخ پر مبنی ہے، لیکن مصنف نے حتی الامکان صحیح واقعات درج کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ عاجز کا اسلوب مرصع ہے، گو وہ مروجہ فارسی میں لکھنے کا دعوی کرتے ہیں۔ کتاب کی تصنیف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عارف خاں کی فرمائش پر جو جعفر خاں، ابراہیم خاں اور نوازش خاں کے عہد نظامت میں نائب اور دیوان رہا تھا، مختلف تاریخوں سے مستند واقعات جمع کر کے یہ تاریخ مرتب کی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"دریں ایام سعادت انجام کہ چہارم سال فرخندہ فال اعلحضرت ظل الہی مطابق ۱۱۲۲ سنہ ہزار و یکصد و بست و دو ہجریست خاں ذیشاں عارف خاں نائب و دیوان صوبہ کتب تواریخ

کشمیر مولف بزبان سمسکرت کہ مورخاں یاد کرد وجہ تسمیہ و احوال و آغاز عمارات و زراعت و مدت عدت سلاطین کشمیر پرداختند جمع کرد و بشنیدن واقعات حالات رغبت نمود بہ کتاب تواریخ قدیم مولف بزبان سمسکرت پرداخت ... در جستجوی ترجمہ ملک حیدر کہ بنا بر مبالغہ و طول کلام پسند طبائع خاص و عام نبود، افتاد ... ... ورعایت اختصار روا یجاز و بقلم عجز رقم آوردہ تا طبع مطالعہ کنندگان ملال نیارد۔

تاریخ کا آغاز ستی سر اور جل دیو کی روایت سے کیا ہے پھر لکھا ہے کہ برہما کے فرزند کشف رکھی صوامع و معابد کی زیارت کے لئے جارہے تھے کشمیر کے مقام پر پہنچ کر جب، اس مقام کی ویرانی اور جلدیو کی ایذا رسانیوں کی داستان سنی تو ہیرہ پور کے قریب، ایک ہزار سال ریاضت اور دعا میں مصروف رہے۔ مہادیو، لشن اور برہما ایک سو سال جل دیو کے آسیب کے سد باب میں سعی رہے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، آخر بارہمولہ کے قریب پہاڑ کو ہٹا کر ستی سر کا پانی خارج کیا۔ تاریخ معاصر عہد کے حالات پر ختم ہوتی ہے۔ آخر میں کشمیر کی آب و ہوا کی تعریف میں ایک نظم ہے، جس کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:

زآب خضر روشن تر سوادش — زفردوس است نیکو تر نہادش
بایں دعوی ذلیلی ہست روشن — نمایاں تر چو مہر پرتو افگن
بہشت دعوی شہرش آبشار است — سوادش سرمہ چشم بہار است
چہ کشمیر آبروی ہفت کشور — غلط گفتم زجنت تازہ و تر
عجب آب و ہوای دارد ایں خاک — کہ دل را از کدورت میکند پاک

ڈل کی تعریف میں رطب اللساں ہیں :

بزیبای مصفا چوں رخ حور | نہ تالاب است دریا است پر نور
شب مہتاب سیر روی دریا | کند آئینہ دل را مصفا
سکندر آب اگر زیں چشمہ میخورد | ز بہر چشمۂ حیواں نمی مرد

شیخ محمد مراد متو، مغلوں کے آخری زمانے کے علما میں قابل ذکر ہیں انہوں نے میر محمد رضا دہلوی سے روحانی استفادہ کیا تھا اور مریدوں میں شامل تھے۔ مرشد کی وفات کے بعد کشمیر آگئے اور لوگوں کی علم دین میں رہبری کرتے رہے۔ علوم ظاہری میں بھی اونچا درجہ رکھتے تھے اور پیر غلام حسین کے بیان کے مطابق سلوک کے مضامین شعر میں درد انگیز طریقہ پر ادا کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ لیکن کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ انتقال کا ۱۷۷۵ء (م ۱۱۳۲ھ) ہے۔

خواجہ اسحاق ناوچوسا اگ کا رسالہ " ہدیتہ القراء " ایک منظوم رسالہ ہے، جو ۱۱۵۹ھ میں مرتب ہوا۔ خواجہ اسحاق شیخ علی پانپوری کے مریدوں میں تھے۔ پیر غلام حسن نے ان کی ایک تصنیف " درجات السالکین " کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

" ہدیتہ القراء " کا آغاز حمد سے اس طرح کیا ہے :

حمد گویم مر خدای پاک را | کو مکرم ساخت مشت خاک را
کرد نازل بر حبیب خویشتن | تا نماید راہ دیں مرد و زن
آن کتابی کش نہ دارد ریب و در شک | قلب و جید است فارق چوں محک

اپنے اور کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

آنکہ نام اسحٰق ابن صالح است | راجی عفو است گرچہ طالع است

ہدیتہ القرا بنہادہ نام آں — جمع کردہ ناگزیر قاریاں

رسالے میں تجوید کے قاعدے مختصر طور پر بیان کئے ہیں۔ آخری اشعار میں شیخ عبدالخالق کی توصیف کی ہے۔ اتمام رسالہ کا سنہ منظوم کیا ہے:

روز اتمامش بسال دلکش است — یکہزار و یکصد و چہل و شش است

مولوی ہدایت اللہ ملا عبدالحکیم کے نواسے تھے، جو میرزا اکمل الدین بدخشی کے شاگردوں میں بڑا مقام رکھتے ہیں۔ ہدایت اللہ کے والد ملا کرم اللہ بھی عالم و فاضل تھے، جن سے ہدایت اللہ نے درس لئے تھے۔ ملا سلیمان کلو کے بھی وہ شاگرد رہے تھے۔ ہدایت اللہ سرینگر میں جامع مسجد کے قریب پاندان محلہ میں رہتے تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھی تھی، جن میں سے ایک "تکملہ تاریخ اعظمی" ہے اس کے علاوہ "رد شہاب حافظ کمال" اور "تحفتہ الاخوان" بھی ان کی تصانیف ہیں۔

اورنگ زیب کے بعد تخت و تاج کے لئے جو کش مکش شروع ہوئی، اس کا اثر کشمیر پر بھی پڑا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے، کشمیر کے صوبہ داروں پر بھی کچھ گرفت ڈھیلی سی ہوگئی اس بے اطمینانی سے کشمیر کی فضا بھی متاثر ہوئی تاہم علم و ادب کی دلچسپی کشمیر کے لئے ایک روایت بن گئی تھی، چنانچہ اس دور میں بھی کئی ممتاز شاعر، انشاء پرداز اور عالم پیدا ہوئے۔ اگلے دور کے شعرا میں سے کچھ اس زمانے میں بھی موجود تھے۔ ملا عنایت اللہ پال ۱۱۲۵ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ نئے شاعر جو معظم شاہ (شاہ عالم) اور فرخ سیر کے زمانے میں منظر عام پر آئے۔ ان میں میر نور الدین شارق، خواجہ نوراللہ، خواجہ علی اکبر، بابا حاجی مغنی اور خواجہ ضیاء الدین دیوانی کو اہمیت حاصل ہے۔

حاجی مغنی غزل اور مرثیہ میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کی نظم "واقعہ کربلا"

کا ایک اقتباس ذیل میں درج ہے :

دلی آتش زجوش گریہ دریا است　　زگوہر آب را در دل گرہ ہا است
ہوا از دود او شد آتشیں رنگ　　چمن از غنچہ لبریز دل تنگ
فغاں مانند دل درخوں طپیدہ　　بجای نالہ جاں برلب رسیدہ

خواجہ نور اللہ دیوانی عالم تھے، اور شعر گوئی میں انہیں دستگاہ تھی۔ یکتا کے ایک شاگرد محمد اکبر رفیق شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ وطن میں جب ان کی قدر نہ ہوئی تو وہ پنجاب چلے گئے تھے، جہاں ان کا انتقال ہوا۔ خواجہ اعظم دیدہ مری نے ایک اور شاعر خواجہ لطف اللہ کشمیری کا بھی ذکر کیا ہے جو شاہ عالم سے متوسل تھا اور اس کی تخت نشینی کے موقع پر تاریخ کہی جس کا آخری شعر ہے :

(۱۱۱۹ھ)
سال تاریخ ہمایون سعید　　جشن شاہنشہ عادل گفتند

محمد عاقل سرینگر میں عیدگاہ کے خطیب تھے، اور شعر و سخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ امیر الامرا شہید ان کے قدر دانوں میں سے تھے، جن کی مدح میں عاقل نے قصائد کہے ہیں۔ امیر الامرا کی شہادت کے بعد وہ صفدر جنگ سے متوسل رہے۔ صفدر جنگ، احمد شاہ بادشاہ دہلی کے وزیر تھے۔ امیر الامرا کی مدح میں کہی ہوئی ان کی ذیل کی رباعی ظاہر کرتی ہے کہ انہیں شعر و سخن کا شستہ مذاق تھا۔ رباعی ہے :

اقبال تو اقبال سکندر گردید　　دنیای تو ز دین تو بہتر گردید
تار گرہ عمر تو در روز ازل　　با رشتہ عمر خضر ہمسر گردید

عاقل کے معاصرین میں حکیم رحمت اللہ بانڈی بھی شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ ان کے دو شعر درج ذیل ہیں :

بجاناں جاں رسد آں دم کہ از تن جاں بروں آید
عزیزی میکند یوسف کہ از زنداں بروں آید

گلخن آں سینہ کہ از داغ غمش گل گل نیست
آخر آں باغ در و غنچہ شد و بلبل نیست

میر نورالدین شارقؔ، سادات ایران میں سے تھے۔ ان کے بھائی، میر رضی الدین کو جب کشمیر کی دیوانی عطا ہوئی، تو شارق بھی ان کے ساتھ کشمیر آئے۔ بعد میں وہ ہندوستان چلے گئے تھے۔ یہ فرخ سیر کا عہد تھا۔ شارق کے سپرد دفتر دیوانی کے داروغہ کا عہدہ کیا گیا تھا۔ میرزا صائب اور محمد سعید اشرف کے وہ ہم صحبت بھی رہے۔ شارقؔ اچھے شاعر تھے۔ اور دیوان مرتب کیا تھا۔ شارقؔ کا انتقال ۱۱۲۷ھ (م ۱۷۱۴ء) میں ہوا۔ ان کے کچھ شعر درج ذیل ہیں :۔

سختی جاں پشت ما را چوں کماں خم کردہ است
چرخ منت کش ز مشت استخوانم کردہ است

رتبہم در ملک معنی، طبع نظم شاہد است
دشمناں را عاجز ایں تیر بیانم کردہ است

کی دہد شرح دل و دیدہ گریاں کاغذ
کی شود بحر سیاہی و بیاباں کاغذ

نامہ از سوز دلم کاغذ آتش زدہ است
با شد از خوں دل و دیدہ ام افشاں کاغذ

قاصد آہ بہ امید رواں کن شارقؔ
کہ مگر آورد از نزد عزیزاں کاغذ

خواجہ علی اکبر، شاعر، انشا پرداز اور خوش نویس تھے اور تاریخ گوئی میں

بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اصل میں یہ خواف کے رہنے والے تھے، جو ہرات کے قریب واقع ہے۔ شاہ عباس صفوی کے عہد میں وہ ہندوستان آئے اور ملازم ہو گئے۔ بعد میں انہیں ملازمت کے سلسلے میں کشمیر آنا پڑا اور یہیں رہ گئے۔ ۱۱۳۱ھ میں انتقال کیا۔ ان کے رقعات اور منشآت اپنی رنگینی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

تا لب لعل تو گویا نشود　　دہن تنگ تو پیدا نشود
گر دم نزع نہ بینم رویت　　تلخی مرگ گوارا نشود

یاد آں روز کہ دل در خم گیسوئے تو بود
تو تبا ہی بھرم خاک رہ کوی تو بود
محو گر دیدن و بیخود شدہ افتادن من
اثری از نگہ چشم سخن گوی تو بود

رفیع الدین احمد غافل مورخ تھے، جنھوں نے اپنی تاریخ کشمیر جو "نوادر الاخبار" کے نام سے موسوم ۱۱۳۶ھ میں لکھی تھی۔ یہ تاریخ سارے ادوار پر مشتمل ہے لیکن اس میں راجاوں کا حال مختصر لکھا ہے۔ واقعات کے بیان میں غافل نے صحت کا زیادہ التزام نہیں کیا ہے۔

کشمیر کی ایک اور مشہور فارسی تاریخ اسی زمانے میں مدون ہوئی، جس کے مصنف خواجہ اعظم دیدہ مری، اپنی خاندانی وجاہت، علم و فضل اور کارناموں کی بدولت کشمیر کی علمی اور ادبی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے تھے۔ خواجہ اعظم کے والد خواجہ خیر الدین، عالمگیر کے دربار یاب تھے اور خیر الزماں کے خطاب سے سرفراز ہوئے تھے۔ خواجہ اعظم کی ولادت کا

۱۱۰۳ھ ہے۔ اخوند ملا عبید اللہ شہید اور ملا عبد الرزاق گوجواری کے مدرسوں میں تعلیم حاصل کی۔ شاعری میں وہ ملا عبد الحکیم ساطع اور محمد رضا مشتاق سے استفادہ کیا تھا اور علوم ظاہری کے علاوہ علوم روحانی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

خواجہ اعظم کثیر التعداد تصانیف کے مصنف ہیں۔ ان سب کی تفصیل ان کی تاریخ کے آخر میں درج ہے۔ تجرید الطالبین (۱۱۲۶ھ) رسالہ فوائد الرضا (۱۱۳۵ھ) قواعد المشائخ (۱۱۳۶ھ) اشجار الخلد (۱۱۴۳ھ) ثمرات الاشجار (۱۱۴۳ھ) رسایل الاعظم (۱۱۴۹ھ) مشہور تصانیف ہیں۔
۱۱۴۸ھ میں اعظم نے "واقعات کشمیر" لکھنی شروع کی تھی، لیکن علالت کی وجہ سے یہ کام تعویق میں پڑتا گیا۔ آخر کار ۱۱۵۸ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ یہ مختصر تاریخ، سارے ادوار پر حاوی ہے۔ اعظم کا انداز نگارش واضح اور سلیس ہے۔ "واقعات کشمیر" کے دیباچے میں کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"این مجموعہ ایست در بیان احوال اعجوبہ صنائع خالق قدیر زیباترین نقوش نگارستان تقدیر یعنی بلدہ کشمیر جنت نظیر کہ باتفاق عامہ ارباب سیاحت و کافہ اصحاب درایت در نزہت و صفا و امینت و لطافت ہوا از اکثر بلاد عالم ممتاز بلکہ بی انباز است۔"

"واقعات کشمیر" تاریخی نام ہے، جس سے تصنیف کے آغاز کا سنہ ملتا ہے، اس کا دوسرا نام "تاریخ اعظمی" بھی ہے۔ یہ تاریخ غلام محمد نور محمد نے مورخ کشمیر مفتی محمد شاہ سعادت کے اہتمام سے سرینگر سے شائع

کی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ منشی اشرف علی نے ۱۸۴۶ء میں دہلی سے شائع کیا تھا
خواجہ اعظم شعر بھی کہتے تھے، لیکن عموماً مقصدی۔ وہ میرزا الوز الدین شارق سے اصلاح لیتے تھے۔ غزل کے علاوہ متنوع اصناف میں وہ شعر کہتے تھے۔ ان کی کہی ہوئی تاریخیں مرثیے اور نظمیں ان کی تاریخ میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ فرخ سیر کے قتل کی تاریخ انھوں نے حسب ذیل کہی تھی۔

خواست اعظم زپیر صاف ضمیر | دیده در چشم زخم عالم گفت

ابوالبرکات خاں کے عہد میں کشمیر میں بڑا سخت قحط پڑا تھا، جو اعظم خاں کے عہد تک بھی کم نہیں ہوا تھا۔ اس مصیبت پر شعرا نے نظمیں لکھی تھیں خواجہ اعظم نے بھی ایک طویل مثنوی لکھی تھی، جس کے کچھ شعر یہ ہیں:

زبس در اضطرار بد اہل کشمیر | غم خود ہم نخورده ہیچ کس سیر
زسوز جوع از بس آتش افروخت | بیاد دانہ پختن اشتہا سوخت
نشان غلہ پیدا نیست یکسر | بغیر از حسن گندم گوں دلبر
تنور آں شکمہا گشتہ بریاں | بسوز آرزوی یک لب نال
نویسد کاتب از بہر تسلی | مکرر نسخہ ہای نان وحلوا
زفقر وفاقہ بلبل بس نوا کرد | دگر باریزه گل اکتفا کرد

"وسیلتہ الاصول الی دیار الرسول" شمایل نبوی اور تحیات پر مشتمل ایک رسالہ ہے، جو اپنے شوق حج کی عدم تکمیل پر اظہار عقیدت کے طور پر لکھا ہے۔

خواجہ محمد اعظم کے فرزند خواجہ محمد اسلم منعمی بھی شاعر اور مورخ تھے۔ ان کی تاریخ جو "گوہر عالم" کے نام سے موسوم ہے، کشمیر کی بسیط تاریخوں میں سے ہے۔ "واقعات" کے مقابلے میں، منعمی نے اس میں بہت کچھ اضافے

کئے ہیں۔ اس کی تصنیف کا سبب وہ یہ لکھتے ہیں کہ "واقعاتِ کشمیر" میں طول زیادہ ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے حکمرانوں کے حالات مفصل لکھے نہ جا سکے:

"در کتاب واقعات بسبب طول از کار احوال طبقات انام حال طبقہ کہ مطلوب ضمیر طالب بود، بسہولت نمیداد"۔

کشمیر کی فارسی تاریخوں میں "گوہرِ عالم" ایک اچھا اضافہ ہے۔ اس میں مصنف نے واقعات کے سلسلے کو اپنے زمانے تک پہنچا دیا ہے۔

محمد رضا مشتاق، اساتذہ کا مرتبہ رکھتے تھے۔ وہ صاحب دیوان تھے اور ایک مثنوی "قضا و قدر" ان کی یادگار رہے۔ مشتاق درویش صفت آدمی تھے اور جیسا کہ خواجہ اعظم دیدہ مری نے لکھا ہے، "تا آخر عمر بتفرید و قلندر منشی و آزردہ وصفی بسر بردہ"۔ ان کے خاندان میں خطاطی کے ماہر بھی گذرے ہیں۔ خود مشتاق بھی خوشنویس تھے اور مثنوی معنوی کے نسخے لکھ کر روزی کماتے تھے۔ نوشہرہ میں ان کا قیام تھا۔ گوشہ نشینی پسند تھی اور امیروں اور عہدہ داروں کی صحبت سے پرہیز کرتے تھے۔ شاعری میں ان کا پایہ بلند ہے۔ ان کی غزل میں سنجیدگی شوخی دونوں ہیں۔ کچھ شعر ذیل میں درج ہیں۔

کردیم سیر گلشن تا ما و یار ہر دو | گشتند بلبل و گل بی اعتبار ہر دو
چشم سیاہ مستش لعل قدح بدستش | از عاشقان ربودہ صبر و قرار ہر دو
آیا بود کہ روزی این آرزو برآید | خسپند مست باہم مشتاق و یار ہر دو

مشتاق نے امیر خسرو کی مشہور نعتیہ غزل کی زمین میں ایک غزل کہی تھی جس کے چند شعر ہیں:

ادب بہر لب دل بود شب جائی کہ من بودم
تمنا مرغ بسمل بود شب جائی کہ من بودم

طپیدن ہای شوق کشتن گرد سر نازی
نسیم غنچہ دل بود، شب جای کہ من بودم
چہ می پرسی ز بد ہوشاں نشان غمزہ ساقی
خبر بیروں محفل بود شب جای کہ من بودم

مشتاق کی مثنوی "قضا و قدر" طویل مثنوی ہے۔ شعری معیاروں کے اعتبار سے یہ مثنوی فارسی کی بلند پایہ مثنویوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ یہ ایک حسین برہمن زادہ کی داستان ہے، جیسا کہ آغاز داستان کے ان اشعار سے ظاہر ہے:

برہمن زادہ خورشید رو بود — کہ عنبر گیسوی او بود
گذشت از چہاردہ چوں سال عمرش — بدولت یار شد اقبال عمرش
فتادندش بفکر کد خدائی — کہ بخشندش بماہی آشنائی

اس کے لئے عروس کی تلاش ہوتی ہے۔ بڑی مشکل سے ایک شہر میں ایسی حسینہ کا پتہ چلتا ہے، جو برہمن زادہ کے موزوں ہو۔ شادی کی بات طے ہو جاتی ہے اور دلہا بیاہ کر جب لوٹتا ہے تو راستے میں ایک صحرا سے ان کا گذر ہوتا ہے۔ صحرا میں دم لینے کے لئے ٹھہرے۔ وہاں ایک درویش کا تکیہ تھا جس کا نام شاہ لدّا بتایا ہے۔ وہ دنیا سے دور اس صحرا میں رہا کرتا تھا۔ محافہ جب وہاں ٹھہرا تو ہوا کے جھونکے سے عروس کے محافے ...
... کا پردہ ہٹا۔ درویش کی نظر لڑکی پر پڑی۔ وہ اس پر ایسا فریفتہ ہوا کہ ہوش جاتے رہے۔ جب ہوش میں آیا تو محافہ جا چکا تھا وہ ایک درخت پر چڑھ کر دور دور تک نظر دوڑاتا رہا آخر مایوس ہو کر گرتا اور مر جاتا ہے۔ لڑکی کو جب اس کی خبر ملتی ہے کہ اس کے عشق میں شاہ کا انجام

بخیر ہو گیا تو وہ دیوانہ وار اسی مقام پر آتی اور قبر پر گر کر مر جاتی ہے۔

داستان حزنیہ ہے، اور مشتاق کے بیان نے اس میں شاعرانہ حسن بھی پیدا کر دیا ہے۔ یہ قصہ عالم گیر کے عہد کا بتایا گیا ہے۔

کہ در دوران عالم گیر عادل — شہنشاہ جہاں فیاض باذل

مشتاق کے انتقال کا سنہ ۱۱۷۳ھ ہے۔

اس قصہ کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مشہور اہل قلم میرزا علی لطف نے اردو مثنوی کا جامہ پہنایا تھا۔ یہ مثنوی نیرنگ عشق کے نام سے مشہور ہے، اور اسے عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن کی شعبہ اردو کی ایک استاد، ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مرتب کر کے مجلس تحقیقات اردو، حیدر آباد کی مطبوعات میں شائع کیا ہے۔

کشمیر کے ایک عالم، مولوی زین الدین کا تذکرہ "حدائق الحنفیہ" کے مصنف نے کیا ہے، جو شعر بھی کہتے تھے، لیکن ان کا کلام نہیں ملتا۔ ان کا انتقال ۱۱۵۵ھ میں ہوا۔

مغلیہ حکومت کشمیر کے آخری زمانے میں، جو کشمکش اور بے اطمینانی دہلی کی حکومت میں رہی اس کا اثر کشمیر پر بھی پڑا۔ اقتدار کی اس دوڑ میں، علم و ادب کے معیاروں کی بقا بلکہ خود ان کا وجود معرض خطر میں تھی۔ کشمیر جس کی گود میں علوم و فنون سالہا سال سے پرورش پاتے رہے تھے، اور ہر محلے اور ہر کوچے سے، عالم اور ادیب اٹھے تھے، ان برسوں میں اطراف کی بے اطمینانیوں سے متاثر رہا۔ تاہم اس دور میں بھی کچھ اہل بصیرت نے بیرونی تلاطم سے مصئون و محفوظ رہنے کے لئے علم و ادب کے حصار اپنے اطراف بنانے چاہے۔

اسد اللہ شگون اور میر عنایت اللہ نے اس زمانے میں شعر و سخن کی

روایات کو جاری رکھا۔ شگونؔ، ملا اشرف یکتاؔ کے شاگرد تھے، اور تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہزل سے انہیں دل چسپی تھی اور جس کی چاہتے ہجو کہہ دیتے۔ پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ خود اپنے والد کی ہجو بھی انھوں نے کہی تھی۔ ایک دفعہ ان کے اُستاد محمد اشرف یکتاؔ کے دو بیٹے جو شعر کہتے تھے، ان کے پاس آئے اور اپنے شعر سُنا کر تخلص کی درخواست کی۔ شگونؔ نے ایک کے لیے ٹکتا اور دوسرے کے لئے بھکتا تخلص تجویز کیا۔ حسن نے ان کے یہ شعر نقل کیے ہیں:

مرا غیرت بدل از زلف ہندوی تو می آید
کہ ایں کافر بقصد بوسہ برروئے تو می آید
تو در خواب ازل بودی چمن پیرائے آغوشم
ہنوز از بستر و بالیں من بوئے تو می آید

محمد اکبر رفیق کے دو شاگردوں کا ذکر پیر غلام حسن نے کیا ہے۔ ان میں سے ایک ملا محمود والا مدرس تھے اور شعر و سخن سے بھی دل چسپی رکھتے تھے ان کے اشعار میں معرفت کی جھلک ملتی ہے۔ دوسرے شاگرد مجوی ہجو اور ہزل گوئی میں ممتاز تھے۔ ان کی ایک نظم جو چائے کی تعریف میں ہے، بہت دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں:

چائے، یا اکسیر تن یا روح راح ماست ایں
یا دماغ آشفتگاں را فرحت دلہاست ایں
چائے مگو، غیرت فزائے بادہ خلدش بگو
یا رحیق سلسبیل جنت الماویٰ است ایں
چائے یا آبحیات مردگان خوابہاست
یا مگر سرمایہ بیداری شب ہاست ایں

ببلہ چائیست این یا غیرت طاس قمر
چشمۂ خورشید یا قندیل بزم چاست این

میر عنایت اللہ عنایت عربی اور فارسی کے عالم تھے اور شاعری کے علاوہ انشاپردازی کے علاوہ شہرت رکھتے تھے۔ حضرت سلطان العارفین رحمتہ سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔ آپ کی منقبت میں ایک قصیدہ کہا تھا، جس کا مطلع ہے:

صبا سوی جنابی آنکہ خاک اوست آفاقی
بروا ز بہر عرض حال دور افتادہ مشتاقی

غزل اچھی کہتے تھے۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر ہیں:

این زخم دل ز غمزہ چشم سیاہ کیست — وین نیم کشتہ بسمل تیغ نگاہ کیست
در بزم بادہ، بادہ نخوردن گناہ من — چون جام بادہ خوردن خونم گناہ کیست

ملا میرک فانی مفتی تھے۔ لیکن شعر اور انشاء سے بھی ان کا لگاؤ تھا۔ ان کا انتقال ۱۱۶۱ھ میں ہوا۔ فانی کے شعر ہیں:

گفتم ز خود خبر کن — گفتار ز خود حذر کن
بگذر ز فقیر کثرت — اندر مقام وحدت
وآنگہ بہ خود نظر کن — تا کیست در بر تو
آن شاہ تاج عزت — بہنند بر سر تو

خواجہ امان اللہ اور حکیم رحمت اللہ بھی شعر و سخن میں شہرت رکھتے تھے محمد فاروق اور محمد حیات ہادی کے نام بھی اس دور کے شعراء میں ملتے ہیں۔ ہادی کے ایک شعر میں تکرار صوت کا حسن ملاحظہ ہو:

نمی خواہم کہ گردی گرد آں گلبرگ برگردد — اگر گردد بگرد او نمی خواہم کہ برگردد

میرزا بیگ ایک اور صاحب ذوق سخن سنج بخارا کے رہنے والے تھے اور کسی خدمت کے سلسلے میں کشمیر آگئے تھے۔ شاعری کے علاوہ انشا پردازی میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ ایک اور انشا پرداز میر عنایت اللہ تھے، جو عربی اور فارسی کے عالم بھی تھے اور شعر و سخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

فارسی شاعری کا ذوق علما سے گزر کر تاجروں اور دوسرے اہل حرفت تک بھی پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ محمد حیات حاذق جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ہٹی فروش تھا۔ کبیر ہی دیہاتی تھا۔

محمد شاہ کے عہد میں ابوالبرکات خاں جو کشمیر کی نظامت پر کئی دفعہ فائز رہے (۱۱۳۴ھ و ۱۱۵۴ھ) صاحب تصنیف تھے اور شعر و سخن کا بھی اچھا مذاق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے ان کی تصنیف "مآثر" کا تذکرہ اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ پیر غلام حسن نے ان کے ذوق سخن اور انشا پردازی کے کمالات کی توصیف کی ہے۔ ان کی ایک رباعی ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

صوفی سخن تازہ و رنگیں دارم — سرمشق خطے زیار دیریں دارم
از طرز کلام من شکر می ریزد — فرہاد بیا کہ حرف شیریں دارم

مولانا امان اللہ شہید، کشمیر کے مشہور عالم ہوئے ہیں۔ اپنے علم و فضل کی بدولت، وہ محمد شاہ کے دربار میں عزت اور احترام کا مقام رکھتے تھے۔ محمد شاہ نے انھیں شیخ الاسلام کے عہدہ پر فائز کیا تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے متداولہ درسی کتب پر حاشیے بھی لکھے تھے، جو بڑے عالمانہ اور دقیق مانے جاتے ہیں۔ امان اللہ کو امیر الامرا صمصام الدولہ سے بڑا لگاؤ تھا اور انہیں کی رفاقت میں، نادر شاہ کے خلاف لڑتے ہوئے انھوں نے شہادت پائی۔

شیخ محمد عاصمی کشمیر کے باخدا بزرگوں اور علما میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے

تھے۔ ان کے پوتے شیخ عطاء اللہ ثانی عالم و فاضل تھے اور شعر و سخن کا بھی اچھا مذاق رکھتے تھے۔ میرزا اکمل الدین بدخشی کے مریدوں میں ان کا بلند مقام ہے۔ ان کی فکر سے دو شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

ای تو آنکہ بخواب غفلت ہمہ شب خمیدہ باشی
فردا ز صبح صادق اثری ندیدہ باشی
رہ وصل او نمایاں نشود بقطع منزل
چو ز خود رمیدہ باشی، بخدا رسیدہ باشی

عقیدت خاں ناظم صوبہ کے تغیر کے بعد آغر خاں ۱۱۴۷ھ میں کشمیر کی نظامت پر مامور ہوا تھا اُس نے جو ظلم و ستم عوام پر روا رکھا تھا، اس کے سبب ایک سال کے اندر تبدیل کر دیا گیا۔ اس کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ اس کی ایک غزل حسب ذیل ہے:

نجم ابروی نگار قسم	بدم تیغ آبدار قسم
خط تو آیت ہدایت شد	بسر مصحف غبار قسم
کار شمشیر می کند ابرو	بہ علی و بہ ذوالفقار قسم
دیدہ غیر از ترا نمی بیند	یک قسم، صد قسم، ہزار قسم

میرزا فرہاد بیگ علوم عقلی و نقلی دونوں میں مہارت رکھتے تھے، میر غلام حسن نے لکھا ہے کہ ان کی غزل اور قصیدہ کی شہرت تھی۔ ان کا انتقال ۱۱۵۶ھ میں ہوا۔

مغلوں کے آخری زمانے میں حافظہ خدیجہ، بڑی زاہد اور عالم خاتون گذری ہیں۔ وہ حضرت سید علی ہمدانی کے رفیق، میر سید حسین سمنانی کی اولاد میں سے تھیں۔ ان کے والد میر سید عبدالفتاح بھی علم دین کے عالم تھے۔ حافظہ خدیجہ

حافظ قرآن تھیں اور حدیث، فقہ کے علاوہ، "حصن حصین" "قدوری" اور "مشکواۃ" میں انہیں بڑا درک تھا۔ حافظہ کی شادی، ملا زین الدین مفتی سے ہوئی تھی۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ حافظہ کا انتقال ۱۷۳۹ء (م ۱۱۵۲ھ) میں ہوا۔

فرخ سیر کے عہد کے شعرا میں، ساطع کے شاگرد، مرزا لطف اللہ خاں صہبا نے نمایاں مقام پیدا کیا تھا۔ نغز گوئی میں صہبا کو بڑی شہرت حاصل تھی ساطع کے علاوہ انھوں نے مشتاق سے بھی اصلاح لی تھی۔

فرخ سیر کے عہد کے کشمیری انشا پردازوں میں محمد امین دانا بھی تھے، جو امیرالامرا کے منشیوں میں ملازم تھے۔ وہ شعر خوب کہتے تھے۔ ان کا ایک شعر پیر غلام حسن نے نقل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے۔

انتظار اندر سخن عیب است دانا چوں ہلال
مصرع برجستہ باید گو پس از ماہی بود

دانا کا بیٹا محمد یحییٰ حیا بھی شاعر تھا، جس کا انتقال ۱۱۸۲ھ میں ہوا اس کے دو شعر ذیل میں منقول ہیں

آئینہ خانہ ایست چراغاں زیک چراغ
عالم تمام پر ز خدا و خدا یکی است

گرفتم آستیں وا آستیں از ناز افشردہ
کشیدم دامنش، دامن ز استغنا کشید از من

اسی زمانے میں ملا عزیز اللہ قانع بھی گذرے ہیں، جن کے بارے میں مورخ پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ عربی اور فارسی علوم کے بہت بڑے عالم تھے اور شعر و سخن میں استاد مانے جاتے تھے۔ لیکن ان کے اشعار اب دستیاب نہیں ہوئے۔

ابوالقاسم خاں جو مغلوں کے عہد کا آخری ناظم کشمیر تھا، ابوالبرکات خاں

کا بیٹا تھا۔ جب افغان سردار عبداللہ خاں ایشک آقاصی نے کشمیر پر حملہ کیا تو
ابوالقاسم خاں کی فوج کے سپہ سالار، گل خاں خیبری، کشمیر کے چند امرا کے نفاق کی
بدولت عبداللہ خاں سے مل گیا، اور ابوالقاسم خاں کو ہزیمت ہوئی۔ وہ بھاگتا
ہوا گرفتار کر لیا گیا اور عبداللہ خاں اسے اپنے ساتھ کابل لے گیا۔ احمد شاہ درانی
نے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ آخر میں وہ ہندوستان گیا اور وہیں فوت ہوا۔
ابوالقاسم خاں فارسی کا شاعر تھا، اور صادق تخلص کرتا تھا۔ پیر غلام حسن نے
اس کے حسب ذیل شعر نقل کئے ہیں۔

بر برد و عارضت خط ریحاں نوشتہ اند — یا بوستاں بگرد گلستاں نوشتہ اند
ننوشت ہیچ کس ز اوصاف زلف تو — جمع نوشتہ، لیک پریشاں نوشتہ اند

مغلوں کے دورِ حکومت میں بھی کشمیر کے کئی اچھے خطاط ابھرے۔ ان میں
سے بعض کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ کئی خطاط ایسے بھی تھے، جو کتبات لکھنے میں بھی
مہارت رکھتے تھے۔ ان میں محمد مراد اور محمد محسن جن کا ذکر گزر چکا ہے، اچھے
کتبات بھی لکھتے تھے۔ کشمیر میں مغلوں کے تعمیر کردہ باغات اور عمارتوں کے
اکثر کتبے انہیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں بھائی مجسمہ سازی میں بھی مہارت
رکھتے تھے۔ محمد مراد کی مشق کے کچھ نمونے میرزا کمال الدین شیدا کے پاس محفوظ ہیں۔

استاد منصور، مصوری میں کمال رکھتا تھا۔ اس نے کشمیر کے پھولوں
کی تصویریں بنا کر جہانگیر کو پیش کی تھیں، جنہیں جہانگیر نے بہت پسند کیا اور
ان کا مرقع تیار کر کے اپنے پاس رکھا تھا۔

مغلیہ دور میں طب کو بھی فروغ ہوا۔ خواجہ عبداللہ غازی کی "موجز" "قانون"
اور اقصرائی کی شرحیں اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ حکیم عبدالقادر گنائی کی "شرح طب
نبوی" بھی قابل ذکر ہے۔ حکیم نامدار خاں جو مومن کے بھائی تھے، دہلی چلے گئے تھے۔

۹

افغان عہد

۱۷۵۲ء تا ۱۸۱۹ء
۱۱۶۶ھ تا ۱۲۳۴ھ

مغلیہ اقتدار کے خاتمے کے بعد، جب افغانوں کا تسلط کشمیر پر ہو گیا، تو عام طور پر تہذیبی امور کی طرف توجہ نہیں رہی۔ افغان اچھے سپاہی تھے لیکن تہذیب اور شائستگی کے امور سے انہیں اتنا ہی بُعد تھا، جتنا ابتدائی مغلوں اور تاتاریوں کو تھا۔ بامزئی نے لکھا ہے کہ مغل اقتدار کی زوال پذیری کے بعد، اہل کشمیر نے جب افغانوں کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی، تو انہیں اس کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ کشمیر اور اس کے حسن و خوبی کا ایسا صفایا ہو جائے گا کہ زندگی دو بھر ہو جائے گی۔ ایک شاعر نے بڑے اچھے انداز میں، اس عہد کی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ اپنے اس شعر میں کھینچا ہے:

پرسیدم از خرابیِ گلشن ز باغباں
افغاں کشید و گفت کہ افغاں خراب کرد

عبداللہ خاں ایشک آقاسی جس نے مغل ناظم کشمیر کو شکست دی تھی

۱۷۵۲ء میں کشمیر کا ناظم ہوا۔ اس نے کوئی چھ مہینے حکومت کی۔ اس عرصہ میں اس کے ہاتھوں اہل کشمیر کو سخت زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ بیرونی تاجر جو تجارت کی غرض سے کشمیر آتے تھے، وہ عبداللہ خاں کی سخت گیریوں کی وجہ سے کشمیر چھوڑ کر چلے گئے، اور اس طرح تجارت کو بہت نقصان پہنچا۔

اس ناظم کے عہد میں ٹیکا رام آخون منظر عام پر آئے۔ انھیں ناظم سے قربت بھی حاصل تھی، چنانچہ اس کی مدح سرائی بھی انھوں نے کی ہے۔

پنڈت ٹیکا رام آخون، ۱۷۷۳ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے تھے۔ جیہ کدل کے قریب محلہ شہیلی ٹینگ میں رہتے تھے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم اونچے درجے کی پائی تھی، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عربی اور فارسی تعلیم کے لئے ایک مکتب قائم کیا تھا۔ اس مکتب سے کشمیر کے بہت سے طالبان علم فیض یاب ہوئے۔ فارسی شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ان کی مثنوی جو "کبک نامہ" کے نام سے موسوم ہے، کافی مقبول ہوئی۔ یہ سردار عبداللہ خاں ایشک آقاسی ناظم کشمیر (۱۷۹۵ء تا ۱۸۰۰ء) کے عہد کا کارنامہ ہے، اور اسی کی بزم آرائی اور شوق سیروشکار کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ مثنوی میں آخون نے نئے نئے استعاروں اور کنایوں سے کام لیا ہے۔ مثلاً

چو کبک صبح نورانی بصد ناز | زکوہ چرخ کردہ خندہ آغاز
سیاہی بلبل آسا پر زد از باغ | حواصل سر کشید از بیضہ زاغ

صبح کی تشبیہ کبک سے، حواصل اور بیضہ زاغ کا کنایہ آفتاب سے پنڈت آخون کی جدت ہے۔ سردار عبداللہ خاں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

چناں ایشک آقاسی ماند برپا | سہی بر شاخ عرش از قد بالا
شد از روشن دلی سردار ہشیار | چو چشم بخت خود از خواب بیدار

بہر سو باز کرد آں چشمِ پُر تاب | ز مژگاں نیشتر زد بر رگِ خواب
دہن چوں غنچہ وا کرد از تبسّم | زباں چوں بلبل آمد در تکلّم

مہر دار کے خبر رسانوں نے گزشتہ دن کی کیفیت بیان کرنی شروع کی

یکی گفتا کہ شبانگہ شمعِ سرکش | فگندہ بر سرِ پروانہ آتش

یہ سنتے ہی مہر دار نے "برآمد از غضب" "برکشتنِ شمع"۔ آگے شمع کے رشتۂ جان کے قطع کیے جانے کا ذکر شاعرانہ انداز سے کیا ہے۔ پھر مہر دار کی مجلس آرائی اور سیر و شکار کا حال لکھا ہے۔

افغان عہد میں فارسی ادب اور خاص طور پر شاعری کی ترقی میں سکھ جیون کا بڑا حصہ رہا۔ وہ پنجاب کا کھتری تھا، لیکن اس کی ولادت کابل میں ہوئی تھی۔ دوسرے افغان ناظم عبداللہ خاں کابلی نے اسے اپنا دیوان مقرر کیا تھا۔

لیکن اقتدار کی ہوس میں اس نے ابوالحسن باندے کی مدد سے عبداللہ خاں کابلی کو قتل کر دیا اور عملاً کشمیر کا حکمران بن بیٹھا۔ عالمگیر ثانی کے عہد میں جب مرہٹوں کا دباؤ دہلی پر بڑھ رہا تھا، سکھ جیون نے بادشاہ سے اپنی وفاداری اور اطاعت کا اظہار کیا، جس کی بنا پر، عالمگیر ثانی کے دربار سے اسے راجہ کا خطاب عطا ہوا، اور کشمیر پر حکومت کا اسے پروانہ ہاتھ آگیا۔

سکھ جیون کو فارسی شعر و ادب کا اچھا ذوق تھا۔ وہ خود فارسی میں شعر کہتا تھا اور شعرا کا قدر دان تھا۔ پیر غلام حسن نے اپنی تاریخ میں اس کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔ حسن نے لکھا ہے کہ نورالدین خاں سے مقابلے میں شکست کے بعد، جب سکھ جیون گرفتار ہوا اور نورالدین خاں کشمیر پر قابض ہو گیا تو اس کے حکم سے سکھ جیون کی دونوں آنکھیں نکال لی گئیں۔ اس واقعے سے پہلے وہ یہ غزل پڑھ رہا تھا، جو اس کی طبع زاد ہے:

پیشم از وضع جہاں پوشیدہ ۔ سر بسر احوال آں نادیدہ
ہر کہ چو من داشت جا بر فرق گل عاقبت در خاک و خوں غلطیدہ
چند روزہ خود تماشا کردہ ام زیں چمن گل ہای عشرت چیدہ بہ
گرد ہی شیرش، دہد زہرت عوض زیں سیہ مار جہاں ترسیدہ بہ
باز اگر چشم جہاں بینم دہند چوں گدایاں در بدر گردیدہ

اندھا ہونے کے بعد وہ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتا تھا:

ہر چند گفتم نفس دنی را باید نہ کردن ناکردنی را
ایں نفس سرکش نشنید از من تا دید آخر نا دیدنی را

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے ایک "دیوان ناظم" کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس کے بارے میں لکھا ہے یہ سکھ جیون اور اس کی بیوی کے فارسی مکالمے پر مشتمل ہے۔

سکھ جیون مل کچھ فطری لگاؤ کی وجہ سے، اور کچھ اس سبب سے کہ اسے خود مختار راجہ کہلانے کی خواہش تھی، اپنے عہد کے سربرآوردہ شعرا کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر فارسی کے بہت سے شاعر، اس کے دربار کی طرف کھنچ کر چلے آئے تھے۔ ان میں ملا توفیق، ملا رفیع، محمد علی خاں متین، محمد جان بیگ سامی، رحمت اللہ بانڈی نوید، ملا راجح، عبدالوہاب شائق قابلِ ذکر ہیں۔ سکھ جیون مل ہفتہ میں ایک دن یکشنبہ کو مشاعرہ منعقد کیا کرتا تھا، جس میں منتخب شعرا حصہ لیتے تھے۔ محمد جان بیگ سامی کے اس کے دربار میں باریابی پانے کا ایک واقعہ پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ ایک اتوار کو جب دربار میں شاعر جمع تھے اور سکھ جیون مل کی فرمائش پر شعرا حافظ کے مصرع:

"ای فروغ ماہ حسن از روی رخشان شما

پر اپنی اپنی غزلیں سُنا رہے تھے، سامی جو ابھی تک درباری شاعروں میں شامل نہیں ہوئے تھے، پہنچ گئے اور باہر ہی سے یہ شعر پرچے پر لکھ کر سکھ جیون مل کے پاس بھجوایا:

سامی از راہ حیا بیروں در افتادہ است ۔۔۔ باز گردد یا در آید چیست فرمان شما

شعر پڑھ کر سکھ جیون مل نے سامی کو بلوا لیا اور اپنے درباری شعرا کے زمرہ میں داخل کر لیا۔ سامی نے سکھ جیون کی مدح میں کئی قصائد لکھے ہیں ایک قصیدہ میں اس کے وزیر مہانند کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

کارپرداز تو مہانند است ۔۔۔ آنکہ ہست از قبیلہ درہا

می نمائی بنام او تنخواہ ۔۔۔ نقد و جنس و براتِ چاکرہا

گفتہ در باب جستن روزی ۔۔۔ سعدی آں آگہہ مقدرہا

رزق ہر چند بے گماں برسد ۔۔۔ شرط عقل است جستن از درہا

سکھ جیون مل نے دربار کے سات شاعروں کو منتخب کر کے "تاریخ کشمیر یا شاہنامہ کشمیر" لکھنے پر مامور کیا تھا۔ ایک ایک عہد ان میں سے ہر ایک کے ذمہ کیا گیا تھا اور نظم کی ہر بیت کے لئے ایک ایک روپیہ مقرر تھا۔ لیکن سکھ جیون مل کی تباہی کے بعد، یہ تاریخ نامکمل رہ گئی۔ اس کے اجزا دستیاب ہوتے ہیں۔ سامی کی ایک مثنوی کے کچھ اجزا ریسرچ لائبریری سری نگر میں محفوظ ہیں، جو غالباً "شاہنامہ کشمیر" کا حصہ ہیں۔ مثنوی میں للیتہ دت کے برسرِ اقتدار آنے کا حال اس طرح نظم کیا ہے:

کہ وا ماند از مرگ تارانگیں ۔۔۔ بالتادت آں گوہر سومین

مشرف بہ تشریف شاہنشہی ۔۔۔ مزین بدیہیم ظل الٰہی[۱۳]

......

بعد ناز بر کرسی زر نشست ۔۔۔ برادر بجای برادر نشست
ز بعد برادر خرد کوفت کوس ۔۔۔ بنوبت بآئین جشن جلوس

سکھ جیون مل کی تباہی کے بعد سامی دہلی گئے اور ابو القاسم خاں کی ملازمت اختیار کرلی۔

سامی عبد الرشید بینوا کے شاگرد تھے۔ بینوا اپنے زمانے کے اچھے شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ سامی کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔ وہ غزل اچھی کہتے تھے۔ ان کی ایک غزل کے کچھ شعر ذیل میں درج ہیں:

کرا یارا کہ ہنگام غضب سوی تو می آید ۔۔۔ عرق بر خویشتن لرزد چو بر روی تو می آید
چہ روز است این کہ دیگر بر سرم آن سرو ناز آید ۔۔۔ قیامت شد مگر قائم کہ عمر رفتہ باز آید

عبد الوہاب شایق کو بہار کے موضع وچھنہ کی مسجد کے امام تھے۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ ان کی غزل میں اخلاق اور عرفان کی جھلک ملتی ہے۔ سکھ جیون مل کے مجوزہ شاہنامہ کشمیر کے لئے انھوں نے حضرت سلطان العارفین اور ریشیہ صوفی بزرگوں کے حالات میں مثنوی کا جو حصہ مکمل کیا تھا، وہ ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی انھیں بڑا ملکہ تھا۔ ان کی غزل کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

اعتماد ہستی موہوم کردن ابلہی است ۔۔۔ چوں گذارد کس قدم بالائے ظل پل در آب

راستاں را گر بر الفت نباشد بہتر است
چوں الف باز ر شود، پیوستہ نقش آزر است

شایق نے تاریخ کشمیر کے لئے جو حصہ منظوم کیا تھا، وہ بڑی تقطیع کے کوئی ہزار بارہ سو صفحات پر حاوی ہے۔ ہر سطر میں دو دو شعر لکھے گئے ہیں۔ ان

کا نام انھوں نے " ریاض الاسلام " تجویز کیا ہے ۔ سبب تالیف کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :

" سبب نظم کتاب مستطاب ریاض الاسلام و کیفیت مجلس شاعراں راجہ فلک اقتدار کوکب احتشام و امشخص شدن نظم شاہنامہ کشمیری و تعین شاعراں از روی تواریخ " رزہ ترنگ "

نظم میں شاعر نے اپنے زمانے کی بہت سی تفصیلات لکھی ہیں ۔ اس کے علاوہ کشمیر میں آغاز عہد اسلام اور خاص طور پر حضرت شرف الدین بلبل شاہ اور میر سید علی ہمدانی اور ان کے رفقاء اور دوسرے بزرگوں کا حال بھی تفصیل سے لکھا ہے ۔ ایسے بزرگوں کے حالات نظم کرتے ہوئے جن کا کلام بھی ملتا ہے شایق نے کسی واقعہ سے متعلق ان کا کلام بھی درج کر دیا ہے ، یہ تفصیل رکن اول سے متعلق ہے ۔

رکن دوم میں ریشیوں کے حالات لکھے ہیں ۔ نظم کے درمیان کچھ حکایتیں نثر میں بھی لکھی گئی ہیں ۔ ملک سیف الدین کے ایک قاتل کے جرم کا پتہ چلانے کی حکایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ملک بفراست دریافت او را طلبانید و با وگفت این مرد را چرا کشتہ ؟ او انکار نمود بفرمود تا کارد از کمرش کشیدند خون آلود بود ۔ آخر دگفت کہ برای مہمانی باین کارد مرغی کشتہ ام ۔ ملک کسانرا بخانہ اش فرستاد ، تحقیق کردند نہ مہمانی داشت نہ مرغی کشتہ بود . . . "

ریاض الاسلام ۱۱۷۰ھ میں مکمل ہوئی ۔

صفت کشمیر کے عنوان سے شایق نے مثنوی میں بہت کچھ لکھا ہے

ایک اقتباس درج ذیل ہے:

مرا باز بوی بہار آمدہ ‏ ‏ ‏ ‏ شمیم سرکوی یار آمدہ
دلم باز چون غنچہ گل شگفت ‏ ‏ ‏ ‏ دماغم زکیفیت مل شگفت
نسیمی زجنت وزیدہ دگر ‏ ‏ ‏ ‏ شمیمی مرا ہوش بردہ زسر
شنو وصف کشمیر جنت سرشت ‏ ‏ ‏ ‏ کہ در چار فصل است اروی بہشت
ہمہ سال باشد ہوا معتدل ‏ ‏ ‏ ‏ نوای عنادل بجوشد زدل
بہارش بہار و خزانش ہم بہار ‏ ‏ ‏ ‏ بہار بہار است و خرم بہار

آگے کشمیر کے پھولوں، اشجار، ثمر، آبشاروں، دریاؤں، جھیلوں اور دوسری اہم خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ کشمیر کے حسن و خوبی کا بیان کرتے ہوئے شائق نے فارسی کے اساتذہ کے وہ اشعار بھی لکھ دیئے ہیں، جو کشمیر کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔

رحمت اللہ بانڈی نوید تخلص کرتے تھے۔ بدیہہ گوئی میں انہیں سکھ جیون سے متوسل شعرا میں امتیاز حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے کلام کو مکمل دیوان کی صورت میں مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ سکھ جیون مل کی فرمائش پر کشمیر کی جو تاریخ منظوم کر رہے ہیں اس کا کچھ حصہ بھی انھوں نے مکمل کر لیا تھا۔

ملا رفیع ماٹنجی، عربی اور فارسی کے عالم تھے، اور علامہ شہید کے تلامذہ میں امتیاز رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ وہ امیر الامرا صمصام الدولہ سے بھی منسلک رہے۔ ایک دفعہ انہیں روپیہ کی ضرورت تھی۔ یہ شعر لکھ کر امیر الامرا کے پاس پیش کیا:

بہ این محیط کرم گرچہ آشنا شدہ ام ‏ ‏ ‏ ‏ کفم چو کاسہ گرداب از گہر خالی است

اس پر امیر الامرا نے ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ اس عطیہ کے شکریہ میں یہ بیت لکھ کر گذرانی۔

قدر دانی نہست ممدوحم کہ چوں استاد خط

می دہد بر حرف حرفے ہر دمی خلعت مرا

جس زمانے میں ملا سکھ جیون سے متوسل تھے، کسی شاعر نے "شکر نمک" کی ردیف کی طرح مقرر کی تھی، اس پر ملا رفیع نے ایک طویل قصیدہ اس ردیف میں لکھا تھا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر ہے:

اے کہ یک عالم آتیت از درگہش یابد دو وقت

دال، چاول، ماش و برنج و روغن و شکر نمک

رفیع صاحب دیوان تھے۔ ان کے کچھ شعر ہیں:

تن بہ آغوش سرو من ندہد — سرو آری بہ بر نمی آید

سامان شکایت دل بے حوصلہ دارد — چندانکہ زبان از سخن افتد گلہ دارد

در زلف تو دل را ز جہت شکوہ دور است — ہر چند کہ موی بمیان فاصلہ دارد

گفتی چہ شنیدی ز رفیع از طرف یار — گر راست بگویم دہن پر گلہ دارد

ملا راجح بھی شعر و شاعری میں امتیاز رکھتے تھے۔ پیر غلام حسن نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ: "از شعرای نامدار بود و در مجلس سوکھ جیون اقتدار کلی داشت"۔ ان کا اور ملا حسن کا جو سکھ جیون مل کے دربار کے ایک اور سخن سنج تھے، کوئی شعر … نے … یں دیا۔

محمد علی خاں متین، عبدالغنی قبول کے شاگرد تھے۔ بعد میں قاسم خاں سے بھی انھوں نے اصلاح لی تھی۔ کشمیر کے رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

سکھ جیون مل کے درباری شاعروں میں انہیں نمایاں مقام حاصل تھا۔ متین غزل اچھی کہتے تھے اور "شاہنامہ" کشمیر کے کچھ اجزا بھی انھوں نے مکمل کئے تھے۔ ان کی غزل کے کچھ شعر درج ذیل ہیں:

دی بسوی غیر من ای بیوفا دیدن چہ بود	در حضور من از و احوال پرسیدن چہ بود
دیدن و پرسیدن احوال ہم سہل است و سہل	باز از فریاد او از راہ گردیدن چہ بود
باز گردیدن ز فریادش، مسلّم داشتم	حرف پنہانی از و در گوش پرسیدن، چہ بود

یہ غزل مسلسل ہے، اور کچھ پس منظر رکھتی ہے۔ متین نے علمار کی سیرت پر ایک کتاب "تذکرہ علما" کے نام سے مرتب کی تھی۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے "خزانہ عامرہ" میں ان کی ایک اور اہم تصنیف "تذکرہ حیات الشعرا" کا بھی ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ دونوں کتابیں ایک ہی ہیں۔

متین کے بھائی میرزا قلندر بھی شاعر تھے اور برجستہ شعر کہتے تھے۔ لیکن حسن نے ان کا کوئی شعر نہیں دیا۔

ملا محمد توفیق، اس عہد کے سربر آوردہ شعرا میں سے ہیں۔ انھوں نے پہلے ملا ساطع سے اصلاح لی، بعد میں وہ محمد رضا مشتاق کے شاگرد ہوئے اور جیسا کہ پیر غلام حسن نے لکھا ہے ملک الشعرائے وقت ہوئے۔ غنی کے بعد وہ کشمیر کے سب سے بڑے فارسی شاعر مانے جاتے ہیں۔ وہ صاحب دیوان ہیں۔ اور سکھ جیون مل کی فرمائش پر جو "شاہنامہ کشمیر" منظوم کیا جا رہا تھا، اس کے لئے توفیق نے دو ہزار اشعار کہے تھے، جو ان کی تصانیف میں "تاریخ کشمیر" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ حصہ یوسف شاہ چک کے عہد سے لے کر، عالم گیر کے عہد تک کے واقعات پر حاوی ہے۔

توفیق کی شاعری میں خیالات کی گہرائی ہے، اور اسالیب عموماً سادہ ہیں،

کہیں کہیں خیالات کی پیچیدگی کی وجہ سے، اسلوب میں بھی گنجلک پیدا ہوجاتا ہے
توفیق نے ایک سراپا بھی کہا تھا۔ اس کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

زلفت امروز در جور بہا نگشود داشت — مار از روز ل دشمن آدم بود است
بینی و چشم و دو ابروی تو ای گل اندام — شاخ بادام و دو بادام و دو برگ بادام
تا بروز آورم ارہ آتش در چنگ — ہمہ زم سخت چو چقماق سر خود بر سنگ

بہار آمد کہ دل تنگی ز عالم رخت بربندد — نسیم روح پرور خاطری را غنچہ بکشاید
رسد صہبا برآید ابر و گیتی بشگفد گل گل — بحال توبہ کاران آسماں گرید زمین خندد

توفیق کا انتقال ۱۱۹۷ھ میں ہوا۔ کسی نے "آبرو بودہ لبگزار سخن" سے تاریخ نکالی تھی۔

محمد الدین فوق نے اس دور کے ایک اور شاعر، حافظ عبدالرحمٰن خاں کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ وہ پونچھ کے قبیلے اخوان سے تعلق رکھتے تھے، دینی علوم میں انہیں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ ایک اور شاعر مصنف مولانا دلشاد پسرور کی مثنوی کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے جو ۱۲۲۲ھ میں لکھی گئی تھی، یہ کشمیر کی تاریخ سے متعلق ہے۔ اس کے دو شعر حسب ذیل نقل کئے ہیں۔ یہ شیر خاں کے کھکروں کے تعاقب کے بارے میں ہیں۔

سلاطین نژادان کے گوہری — گرفتند از او شہرت کھکری
تعاقب کناں تا حد گکھراں — بعقب ہمایوں دواں شیر خاں

میر سعد اللہ شاہ آبادی کے والد بدخشاں سے کشمیر آئے تھے، اور شاہ آباد میں قیام کیا تھا۔ وہیں سعد اللہ پیدا ہوئے۔ خواجہ حبیب اللہ نوشہری سے انہیں عقیدت تھی۔ محمد حسین آفاقی اور پیر محمد کامل سے اکتساب علم کیا تھا،

جس کا ذکر اپنی مثنوی میں کیا ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "باغ سلیمان" ہے۔ جس کی تصنیف کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ شہر حاکموں اور عہدہ داروں کے جور و ستم سے ویران ہو گیا ہے۔

کہ ظلم شاہاں وجود سلطاناں ‏ ‏ یک قلم کرد ملک را ویراں
نیست در شہر ہیچ پیشہ وری ‏ ‏ کہ نہ در قہر اوست بہر زری

اس کس مپرسی کی حالت میں ...ود کو مشغول رکھنے کے لئے انھوں نے اس نظم کی تجویز بنائی، جس میں کشمیر کی تاریخی روایات اور تواریخ لکھی ہیں۔ اس کی بنیاد اس سے پہلے لکھی ہوئی تاریخیں ہیں۔ کشمیر کی عام تاریخوں کے اتباع میں تاریخی حالات کے ساتھ اولیائے کرام کا تذکرہ کرتے گئے ہیں۔ اپنے پیر ملا ابو البقا کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنے حالات بھی بیان کئے ہیں۔ کہتے ہیں۔

والدم بود خود بدخشانی ‏ ‏ شاہ مجنوں بنام نشکانی
مادر از کابل آنکہ زد محبوب ‏ ‏ باشد از خواجہ ہاے دہ یعقوب
لیک ہست از علاقہ تقدیر ‏ ‏ زاد و بوم بخطۂ کشمیر

اپنے والد کا حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کا انتقال ۱۱۵۱ھ میں ہوا اور آرہ گام میں مدفون ہیں۔ میں اس وقت گیارہ برس کا تھا۔ میرے خالو حافظ مراد نے میری پرورش کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملا ابو البقا کے مرید ہوئے اور سلوک و معرفت کے منازل طے کئے۔

خواجہ حبیب اللہ نوشہری کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہم بہ مشہور رہبری دہری ‏ ‏ بود خواجہ حبیب نوشہری
صاحب حال بود ذوق سماع ‏ ‏ در طریق ہدیٰ مطیع و مطاع
والد ماجدش بجاہ و جلال ‏ ‏ بود مسمی گنائی بقال

"منظوم السعد" سیرت نبوی پر میر سعد اللہ شاہ آبادی کی ایک طویل مثنوی ہے۔ اس کے آغاز میں زمانے کی حالت پر اس طرح اظہار افسوس کرتے ہیں:

عجب روزگاریست این عہد ما | کہ تاثیر زہر است در شیر ما
گل مہر از باغ دلہا فسرد | بجائش نہال حسد پا فشرد
دغل منصب خود صدارت گرفت | نصافہ نکری خواجہ غارت گرفت
زن و زر پرستی شعار ہمہ | سخاو کرم خوار و عار ہمہ

ملا اشرف ویری، بلبل اس عہد کے صاحب دل اور صاحب نظر شعرا میں سے ہیں۔ وہ مترگام کے قصبہ اشمندر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ملا داؤد اپنے عہد کے عالم تھے۔ بلبل کی ولادت کا سنہ ۱۰۶۸ھ ہے اور ان کی وفات کا سنہ ۵۶، ۱۷۶۱ (م ۱۱۷۵ھ) ہے۔ افغانوں کے دور میں ان کی شاعری کی شہرت ہوئی اور ان کا خمسہ ان کی شہرت کی بنیاد ہے، جو حسب ذیل مثنویوں پر مشتمل ہے:

(۱) ہیمال ناگ رائے (۲) ہشت اسرار (۳) مہر و ماہ۔
(۴) ہشت بہشت (۵) رضا نامہ۔ "رضا نامہ" کوئی دس ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔

بلبل کے خمسہ کا محرک بابائے خمسہ نظام گنجوی کا خمسہ ہوا تھا جس کا تذکرہ شاعر نے "رضا نامہ" کی تمہید میں کیا ہے۔ کہتا ہے:

اگرچہ نظامی بسی رنج برد | ز گنجینہ معنوی گنج برد
من از روح او یاری خواستم | سخن را بمعنی بیاراستم
دو چیز است اندر جہاں پایدار | سخاو سخن نکتہ آبدار

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے انہیں "نظامی کشمیر" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ افغان ناظم کشمیر آزاد خاں کے عہد (۱۱۹۶ھ تا ۱۱۹۹ھ) میں کشتوار کا راجہ، عنایت اللہ سنگھ فارسی ادب اور شاعری سے دلچسپی رکھتا تھا۔ ایک دفعہ آزاد خاں لیسر کو سیاحت کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ اس موقع پر کشتوار کے راجا کے حاضر نہ ہونے پر اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے پیغام بھجوایا کہ اس قصور پر کشتوار کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دونگا۔ راجا یہ پیغام پا کر اپنے وکیل حفیظ اللہ کے ساتھ، آزاد خاں کے پاس پہنچا اور، آزاد خاں کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے بعد خوشی خوشی اپنے وطن لوٹ کر، محل میں بیٹھا ہوا تھا۔ نورالدین شاہ پیر زادہ مجاور آستانہ بالا شاہ تھے۔ محل کے روبرو نورالدین شاہ کا مکان تھا، کھڑکی سے نورالدین کی اہلیہ پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے فی البدیہہ کچھ ریختہ اور کچھ فارسی اشعار موزوں کر کے پڑھے تھے۔ اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

چشم ستمگری کہ بخوں در کمیں نشست   تیغی کشیدہ بر سر مردان دیں نشست
باروی آتشی چو گذشتی بہ بوستاں   گل را ز انفعال عرق بر جبیں نشست

پنڈت شیوجی در مصنف "تاریخ کشتوار" نے اس راجہ کا ایک اور فارسی شعر نقل کیا ہے، جو حسبِ ذیل ہے:

بہار زعفراں اندر چمن بہ   نشاط عیش داں اندر وطن بہ

ملا عطاء اللہ افغان نقشبندی نے ۱۱۹۸ھ میں علم حساب پر ایک رسالہ "نزہۃ الاعداد" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ نہایت خوش خط جلی قلم میں لکھا ہوا، ریسرچ لائبریری، سری نگر میں محفوظ ہے۔ مختصر حمد کے بعد مرتب کتاب کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

"اما بعد میگوید، ایں رسالہ و مدون ایں مقالہ المحتاج الی عطاء اللہ

فقیر حقیر کثیر التقصیر لا عطاء اللہ الخانقاہی ... چنیں گوید کہ در سنہ ۱۱۷۸ھ ہزار و یکصد و ہفتاد و ہشت ہجری جمعی از دوستاں سعادت مند و فرقہ از تلامذہ ارشد ارجمند کہ بحلیہ آداب علوم آراستہ بر غبتی صادق و عزیمتی واثق باین سراسر گرد راسیہ بسر گردانی و پریشانی و بادیہ پیمائی بادیہ ہیچدانی و نادانی بدینگونہ افتراح و التجا آورد ...."

آگے تفصیل دی ہے کہ ان شائقین نے التجا کی کہ علم ریاضی اور حساب میں جو کتب دستیاب ہیں ان کا سمجھنا مبتدیوں کے لئے مشکل ہے۔ یہی اصرار اس تصنیف کا باعث ہوا۔ مصنف کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ہوتیں لیکن ان کی تفہیم کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اچھے ماہر ریاضی تھے۔

اعزاز اللہ شہید کی اولاد میں مفتی قوام الدین بلند پایہ فقیہ اور محدث ہوئے ہیں۔ ان کی تعلیم ملا مقیم توپکیرو کے یہاں ہوئی تھی، ختم تعلیم کے بعد عہدہ قضاءت پر مامور ہوئے تھے۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے شیخ الاسلام کے مرتبہ پر پہنچ گئے ۔۔۔ ان کی تصنیف "صحائف سلطانی" کا تذکرہ ملتا ہے۔ مفتی کا انتقال ۱۸۰۴ء (م ۱۲۱۹ھ) میں ہوا۔

پنڈت دیارام کاچرو خوشدل، افغان عہد کے ان پنڈتوں میں سے ہیں، جنہیں فارسی زبان، ادب اور شاعری سے عشق تھا، اپنے علم و فضل کے لحاظ سے وہ اقران میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ اچھے شاعر تھے، اور انشاء پردازی کا بھی شستہ مذاق رکھتے تھے۔ افغان عہد کے پنڈت شعراء میں، وہ سب سے زیادہ درخشاں ہیں۔ ان کی ولادت سرینگر کے محلہ رینہ واری میں ۱۷۴۷ء میں ہوئی تھی۔ فارسی علم و ادب کا شغف کا پتہ خاندانی ماحول

رہا تھا، چنانچہ منشی بھوانی داس کاچرو، اور پنڈت دامودر کاچرو اسی خاندان سے اُٹھے تھے۔ خوشدل تعلیم ختم کرنے کے بعد، تیمور شاہ درانی کے میر منشی کے عہدہ پر مامور ہوئے تھے، بعد میں زماں شاہ درانی کے امیرالامراء وفادار خاں کے بھی میر منشی رہے۔ اس طرح کشمیر سے باہر کابل میں ان کا زیادہ وقت گذرا۔ وفادار خاں خوشدل کی ادبی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے، اور ان کی فرمائش پر خوشدل نے بہت سی غزلیں بھی کہی تھیں۔ کابل کے سفر کے دوران کا حال انھوں نے اپنی ایک طویل مثنوی میں بیان کیا ہے۔ مثنوی سے اقتباس حسب ذیل ہے۔

زخطہ چوں قدم بیروں کشیدم — تماشاہی جہاں بسیار دیدم
کشیدم رخت چوں در شہر لاہور — مرا دریای راوی گشت منظور
بدیدم مرقد خاص جہانگیر — سراپا سنگ و خاکش تازہ اکسیر
ازانجا بس رسیدم در پشاور — عجب حالی بدیدم در پشاور
رسیدم چوں بشہر خوب کابل — بود کابل بہ گل جنت آتابل

کابل میں قیام کے زمانے میں کشمیر کی یاد جب ستاتی تھی، تو ان کے جذبات شعر کا جامہ اس طرح پہن لیتے تھے:

مرا صبح وطن آشفتہ تر کرد — نمی دانم چرا قسمت بدر کرد
زجوش گریہ چشمم اچھہ دل شد — بہت شد مار شد تالاب ڈل شد

پھر کشمیر کی مخصوص دلچسپیاں یکے بعد دیگرے یاد آتی ہیں:

کجا آں سیر کشتی و کجا من — کجا آں شالمار و کوہ و دامن
کجا آں جوشش فوارہ اللہ — کہ دریادش بگر دوں میرود آہ

غزلوں اور مثنویوں میں بھی خوشدل نے کشمیر کے حسن اور رعنائیوں کے گیت

گائے ہیں۔ اس عاشق کشمیر کے یہ اشعار بھی دوسرے شعرا کے افکار کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہیں۔

خوشا کشمیر دخاک پاک کشمیر — مس ہر عاجزی را ہست اکسیر
بہ سیر ڈل بہر دل انبساط است — بسیم و عیش آباد نشاط است
چو بنشیند در باغ فرح بخش — براد عیش می رانند چوں رخش

خوشدل کی غزل میں زندگی کی لطافتوں کے تاثرات کے ساتھ تصوف اور اخلاق کے تصورات ادل بدل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے شعر ہیں:

بہار آمد بہار آمد طرب کن — بدہ مے ساقیا تا کی تغافل
بر آمد در گلستاں دستۂ گل — بگلشن خیمہ زد با صد تجمل

مقطع میں پھر کشمیر کی یاد آجاتی ہے:

بیا خوشدل رواں شو سوی کشمیر — غریبی تا کجا در شہر کابل

کاچرو کے متصوفانہ خیالات کا عکس ان اشعار میں نظر آتا ہے:

ذات بیرنگ خدا و نہ جہاں پنہاں است — خوشدلا خوب ببیں در ہمہ پنہاں است جدا

زشت و زیبا ئی جہاں در دیدہ بینا یکیست
رتبہ دُر و خزف در مشرب دریا یکیست

خوشدل اچھے انشا پرداز اور خوشنویس بھی تھے۔ اپنے فرزند کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"شرائط انشا پردازی بسیار است"

آگے خوشنویسی اور اس کے لوازم کے سلسلے میں کچھ مفید باتیں لکھی ہیں۔

خوشدل نے کشمیر کی ایک منظوم تاریخ بھی لکھی ہے، جو کشمیر کے قدیم راجاؤں کے عہد حکومت سے شروع ہو کر ان کے اپنے عہد تک پہنچتی ہے۔ انھوں نے ایک بیاض بھی لکھنی شروع کی تھی جو نہایت ضخیم ہے اور ان کے ذوق اور علمی و ادبی دلچسپیوں کی رنگا رنگی کی بڑی عمدہ یادگار ہے۔ اس میں ان کے قصائد، غزلیں، مثنویاں اور تاریخی قطعات درج ہیں۔ قصاید میں مرزا رضا کی مدح میں ایک اچھا قصیدہ ملتا ہے۔ بیاض میں فارسی کے علاوہ کچھ ریختہ اور اردو کے اشعار اور تحریریں بھی لکھی گئی ہیں۔

خوشدل کا انتقال ۱۸۱۲ء میں ہوا۔ انھوں نے دو بیٹے چھوڑے تھے۔ ایک دھرم راج دوسرے پنڈت بیربل کاچرو۔ بیربل کاچرو نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں شہرت حاصل کی۔ کشمیر سے پٹھانوں کے تسلط کو ختم کرنے اور رنجیت سنگھ کو کشمیر پر قبضہ کرنے کی دعوت دینے میں بیربل یا بیربل در کے ساتھ یہ بھی شامل تھے۔ اسی لئے رنجیت سنگھ نے بیربل در کے ساتھ انہیں بھی نوازا تھا۔

پنڈت بیربل بھی باپ کی طرح اچھے خوشنویس تھے۔ ان کے خط ناخن کا ۱۲۴۶ھ میں لکھا ہوا ایک نفیس نمونہ اکادمی میں محفوظ ہے۔

اس عہد کے مشائخین میں، شیخ محمد عثمان بن شیخ محمد فاروق بن شیخ المشائخ وقت، شیخ محمد چشتی کشمیری "زبدۃ الآثار" نامی فارسی ترجمہ کی بدولت شہرت رکھتے تھے۔ یہ کتاب صوفیائے کرام کے حالات اور ملفوظات پر مشتمل ہے۔ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی "بہجۃ الاسرار" کا منتخب ترجمہ ہے، ترجمہ افغان ناظم کشمیر بلند خاں بامزی (۱۷۶۳ء م ۱۱۷۶ھ تا ۱۷۷۵ء م ۱۱۸۸ھ) کے عہد نظامت میں تکمیل پایا تھا۔ مصنف نے اس کی تفصیل دی ہے۔ ملتی ہے ...

"درسنہ ہزار و یکصد و ہفتاد و شش ہجری، خطۂ کشمیر بورود مسعود گلشن آباد ساختہ اند و خاکسار را بعنایت بسیار نواختہ، فرمودند کہ رسالہ "زبدۃ الآثار" "منتخب الاسرار" را ترجمہ بعبارت روزمرہ فارسی باید نوشت تا کافہ مردم از استماع کلمات طیبہ اولیا و مناقب امثل عرفا قطب خافقین و غوث ثقلین بہرہ مند شوند"

"ورود مسعود" کا اشارہ بلند خاں بامزئی کے کشمیر کا ناظم مقرر ہو کر آنے کی طرف ہے، جس کے تقرر کا سنہ ۱۱۷۶ھ ہے۔ افغان ناظموں کی علم و ادب سے دل چسپی کے آثار کم دستیاب ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ترجمہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ افغان ناظموں میں سے بعض علم و ادب سے دل چسپی رکھتے تھے اور عوام کی ہدایت اور تعلیم کا بھی انہیں خیال تھا۔

مرزا محتشم خاں فدا، جن کا شمار کشمیر کے امرا میں تھا، میرزا ثابت خاں کے بیٹے اور فارسی کے سربرآوردہ شاعر تھے۔ کشمیر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ہندوستان گئے۔ لاہور کے ناظم معین الملک قمر الدین خاں نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر، اپنے ماتحت ملازم رکھ لیا۔ قمر الدین خاں کے انتقال کے بعد وہ کشمیر لوٹ آئے اور افغان ناظم کشمیر، حاجی کریم داد خاں کی ملازمت اختیار کی۔ فدا کا انتقال ۱۷۸۲ء (۱۱۹۷ھ) میں ہوا۔ انہیں میاں گل محمد کنگال سے عقیدت تھی۔ غزل وہ اساتذہ کے انداز میں بہت خوب کہتے تھے۔ ان کے کچھ شعر درج ذیل ہیں۔

صنما براہ مسجد مگذر پئے تماشا — شکنند شیخ و صوفی، ہمہ توبہ نصوحی

آں را کہ دل و جانش باہمچو توی باشد — در خانہ توی ہمدم، در رہ توی ہمراہی

فدا کا ایک مستزاد ہے:

از بزم حیات پادشاہاں رفتند — در چشم زدن
نرگس چشماں و خوش نگاہاں رفتند — چوں گل ز چمن

فدا کے فرزند میرزا نورالدین نور بھی فارسی کے شاعر تھے، اور بدیہہ گوئی میں بہت شہرت رکھتے تھے، لیکن ان کی شاعری پورے قد و قامت کو نہ پہنچ سکی کیونکہ نوعمری میں ان کا انتقال ہو گیا۔

افغان عہد میں کچھ علما سکون کے ساتھ اپنے علمی مشاغل کو جاری رکھنے کے خیال سے ہندوستان چلے گئے تھے۔ ایسے علماء میں علامہ تفضل حسین خاں کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ بہت اونچے پائے کے عالم تھے اور ان کی علمی دلچسپیاں وسیع تھیں۔ علامہ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ، انگریزی اور لاطینی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ریاضی اور ہندسہ سے ان کی دلچسپی مخصوص تھی۔ ریاضی میں وہ میرزا محمد علی ابن میرزا خیر اللہ مہندس کے شاگرد تھے۔ شرح مواقف اور دوسری متداولہ درسی کتابیں انھوں نے ملا حسن فرنگی محل سے پڑھی تھیں۔ حکمت کے مطالعہ کا بھی انھیں شوق تھا۔ ان وسیع علمی فضائل کے ساتھ جب وہ لکھنو پہنچے، تو انھوں ہاتھ لئے گئے اور نواب آصف الدولہ نے انھیں اپنا نائب مقرر کر لیا۔ نواب سعادت علی کی تعلیم اور تربیت بھی ان کے سپرد تھی۔ سر سید احمد خاں کے نانا، فرید الدولہ جو شاہ عالم کے وزیر تھے، علامہ سے ریاضی سیکھنے کے لئے، دہلی سے لکھنو گئے تھے۔ اپنے ملنے جلنے والوں میں تفضل حسین خاں "خان علامہ" کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کی تصانیف میں شرح علی مخروطات ایلونیوس، شرح علی مخروطات دیوبال، شرح علی مخروطات سمنی، اور ایک

جبر و مقابلہ اہم علمی کارنامے ہیں ۔ ان کا انتقال ۱۸۰۱ء (م ۱۲۱۵ھ) میں ہوا
پنڈت بھوانی داس کاچرو نیکو، ایک اور سر برآوردہ پنڈت شاعر
اور عالم تھے۔ زبان اور شعری روایات پر انہیں بڑی دست رس حاصل تھی
اور ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کی غزل کے کچھ شعر حسب ذیل
ہیں:

نی آشنای ماشدہ گلچیں نہ باغباں زیر باغ ہمچو سبزہ بیگانہ سوختیم

یک ناز و صد آشوب یک انداز و صد آفت یک عشوہ و صد فتنہ بلای دل و جانی
شد بر یمن لعل بتش خال مسلط تقدیر چہ بنشاند بگینی بہ مکانی
نیکو چہ دہد ہدیہ شمشیر نگاہش لخت جگری قاش دلی پارۂ جانی

عاشق صادق اگر دلبر پر جفا طلب ریش دل و خراش جاں درد سر و بلا طلب
گر ہوست بود نکو عمر دوبارہ در جہاں آب بقا چہ می کنی آن لب جاں فزا طلب

اساتذہ کی ایک مشہور زمین میں نیکو نے بڑی مرصع غزل کہی ہے۔ اس
غزل کے دو شعر ہیں:

خاطر مبتلای کی طرہ مشک فام دو ہست کشاکشم بسی صید یکی و دام دو
دیں بر دم بہ جانبی، کفر بجانب دگر دل بکہ اقتدا کند، قبلہ یکی و دام دو

نیکو نے شہر آشوب کے انداز پر ایک ترجیع بند بھی لکھا تھا، جو نو بند پر
مشتمل ہے۔ اس ترجیع بند میں آسمان زمین و زماں اور ابنائے زماں کا
شکوہ کیا ہے۔ آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زمانہ سے لڑ کر کون عہدہ برآ

ہو سکا ہے، طریق رضا ہی شیوہ عبودیت ہے، سب کام خدا کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

نیکو کنند نشرند تا چند | نیکو تو گذر ازیں زمانہ
بارے چہ کند خدا بہ بینم | بر خاک رہ رضا نشینم

بحر طویل میں طبع آزمائی کرنا کشمیر کے شعرا کا محبوب مشغلہ رہا ہے، نیکو نے بھی بحر طویل میں آٹھ مصرعے موزوں کئے تھے، جو ان کے خلاق ذہن اور روانی طبع کے شایستہ آثار ہیں۔

پنڈت نیکو کی بیوی ارنی مال کشمیری کی مشہور شاعرہ ہوئی ہیں۔

بارہویں صدی ہجری کے ربع آخر کے کشمیری علما میں شیخ محمد اشرف فتح کدلی کا بڑا مرتبہ ہے۔ انہیں پیر غلام حسن نے "پرہیزگاروں کے سرتاج" اور "علم و عمل، ریاضت و مجاہدہ میں بے نظیر" جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد وہ خواجہ عبدالنبی کے مرید ہوئے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں اطوار سبعہ اور اسیار اربعہ کی منزلیں قادری اور کبروی طریقے سے طے کر لیں اور ارشاد کی اجازت مرشد سے حاصل کی۔ اس کے باوجود ریاضت جاری رکھی۔ ان کے تبحر کے بارے میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ احباب نے انہیں مثنوی معنوی کا درس دینے پر مجبور کیا۔ جب مثنوی شروع کی تو پہلی ہی بیت کی شرح کرتے ہوئے تین دن لگ گئے، پھر بھی تفہیم تشنہ رہ گئی۔ تصوف سے بھی انہیں حظ تھا، اور شاعری کا شستہ مذاق رکھتے تھے۔ تصوف اور عرفان کے مسائل ان کی شاعری کا موضوع ہیں۔ چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

یک تار سر زلف تو در دیر مغاں است | یک لمعہ ز رخسار تو در خانہ کعبہ

زاں اوست گر انجا ہمہ لبیک و نفیر است
زآں موست کہ این جا ہمہ فریاد و فغان است

ان کی ایک رباعی ہے:

دردیدہ عیاں تو بودہ من غافل ۔ درسینہ نہاں تو بودہ من غافل
عمریست کہ در جہاں ترا می جستم ۔ خود ہر دو جہاں تو بودہ من غافل

شیخ کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔

مولانا حسام الدین ایک اور عالم اور شاعر علامہ امان اللہ شہید کے بھتیجے تھے اور انہیں سے استفادہ بھی کیا تھا۔ تعلیم کشمیر سے باہر حاصل کی اور کشمیر آکر لوگوں کو درس دیتے رہے۔ اس کے بعد دہلی گئے اور شاہ کلیم اللہ کے ارادت مندوں میں داخل ہو گئے۔ دہلی میں داروغہ عدالت کی خدمت ان کے تفویض تھی۔ اکبر یار خاں کے انتقال کے بعد عدالت کشمیر کے داروغہ بھی رہے۔ ذوق شعر پسندیدہ رکھتے تھے۔ ۱۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ ان کے دو شعر درج ہیں:

جہاں ہر چند ہر سو پر بلیات و محن باشد
چو وا بینی حوادث بیش در شہر وطن باشد
بشہر غربت آبادی زتشویشش اماں باشد
بکام ایام و آرام و فراغ جان و تن باشد

شیخ محمد رفیقی کا رسالہ "تحفۃ الاحباب فی النصح المغرورین بالاسباب" پند و نصائح پر مشتمل ہے، رفیقی خواجہ طاہر کے پوتے تھے اور خواجہ رفیق کے روحانی فیوضات سے مستفید تھے۔ ان کا انتقال ۱۱۸۵ھ میں ہوا "تحفۃ الاحباب" کی تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

"این فقیر حقیر تر آب اقدام سادات حقانی و خاکپای اولیای ربانی المستعین باللہ الذی امات واحی الحافظ محمد یحیٰ بن الشیخ الحافظ محمد حبیب اللہ الرفیقی، السہروردی النقشبندی القادری علیہ رحمۃ اللہ الملک الباری بموجب رعایت قرابت نبوی و بباعث حدیث مصطفوی کہ الدین النصیحۃ واردات است خواست کہ زبان انداز و نصیحت تقریراً وانماید و دست پند و موعظت بدلایل قرآنیہ واحادیث نورانیہ تحریر می کشاید"۔

ابتدا میں لکھا ہے کہ نصیحت طعن و تشنیع کے انداز میں نہیں بلکہ اصلاح کی غرض سے ہے لیکن ان کا لہجہ اکثر جگہ تلخ ہو گیا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ

سازد از آل مصطفےٰ خود را | دارد از نسل مرتضیٰ خود را
دی پدر بودش از رذل فرد ملی | دی شد امروز سید علوی

اس پر سب و شتم کرتے ہوئے، ایک طویل نظم لکھ دی ہے، جس کے آخر میں کہتے ہیں:

ہر کہ دعوای رفاقت زرفیقی سازد | عاقبت سگ دہن و گرگ بسر می بینم

"مصباح الرحمن" "سیرت نبوی" اور معیشت و اخلاق میں ہے "احوال مولف" میں لکھتے ہیں:

بعد حمد و نعت سلطان بشر | شرح حال خود نمایم سر بسر
در نسب ہستم زعالی خاندان | شکر این نعمت چساں سازم بیاں
جد اعلیم ولایت را حقیق | شیخ طاہر حضرت خواجہ رفیق
مدفن او خطہ کشمیر شد | شیخ دیں عبدالشکور ش پیر شد

سارے سلسلے کا تذکرہ کرنے کے بعد اپنے بارے میں لکھا ہے۔

بو محمد کنیتش زاہل ادب | نام او یحییٰ صبیح الدین لقب

چوں رفیقی بود از روی لسب　　شد رفیقش ہم تخلص زاں سبب

آگے سبب تالیف میں لکھا ہے کہ:

میرے والد چھ سات سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ جب سولہ برس کا ہوا تو گھر سے باہر گیا۔ حفظ قرآن کی توفیق ہوئی۔ سترہ سال کی عمر میں شعر و سخن کا شوق ہوا۔ میں نے "ناسخ البدعہ" لکھی۔ اس کے بعد "چشمہ کوثر شرح بردالامالی" جس کا نام "نظم لآلی" رکھا۔ "تحفۃ العقیدہ" انکی ایک اور تصنیف ہے۔ آگے لکھا ہے۔

لیک از روی جہالت یار سال　　نظم کردم قصہ بہتاں مآل
گفتم از سلطان کابل قصہ　　بردم از عصیاں و بدعت حصہ

پھر شاہ ولی اللہ کی سیرت پر آخری عمر میں نظر پڑی اسے منظوم کیا۔ ہر روز ایک بیت لکھتا تھا۔ قاضی عیاض کی "شفائی" صغانی کی "مشارق" عنایت احمد کی کتاب معجزات نظم کی "تطہیر القلوب" رفیقی کی دوسری نظم ۱۲۹۸ھ میں لکھی گئی۔ اس میں حدیث کی اہمیت، صبر اور صدق پر مواعظ لکھے ہیں۔ سبب تالیف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "مصابیح الدجیٰ" کی تصنیف کے بعد مجھ پر کچھ ایسی سستی طاری ہوئی کہ:

شوق تصنیفم ز دل یکبار شد　　ذوق نظمم بر طبیعت بار شد

پھر ۱۲۹۸ھ میں میری طبیعت آمادہ ہوئی تو میں نے دنیا کو بدعت میں مبتلا دیکھا۔

آن یکی گوید کہ تہذیبم خوش است　　لیک تہذیب نصاریٰ دلکش است
آں یکی در شرک دیدم پائمال　　طاعت او بدعت و رسم و ضلال
پس بہ دل گفتم پی نفع عوام　　ترجمہ سازم کتابی را تمام

اس طرح یہ رسالہ وجود میں آیا۔

سید غلام الدین آزاد قادری، جن کا انتقال ۱۷۸۹ء (م ۱۲۰۳ھ) میں ہوا، خاندان ارشاد و ہدایت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پردادا شاہ محمد فاضل اپنے اہل خاندان اور معتقدین کے ساتھ کشمیر آئے تھے۔ ان کے والد شاہ محمود قادری عالم تھے، انہیں سے آزاد نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے نانا شاہ محمد غوث لاہوری، روحانی پیشوا تھے۔ آزاد نے انہیں کے یہاں تربیت پائی تھی اس کے بعد وہ کشمیر آئے اور ارشاد و ہدایت میں مصروف رہے، ان کا انتقال ۱۷۸۹ء (م ۱۲۰۳ھ) میں ہوا۔

آزاد اونچے درجے کے خوش فکر شاعر تھے، جنہیں زبان اور بیان پر قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے ایک دیوان چھوڑا ہے جس میں تصوف اور عرفان سے پُر اشعار ہیں۔ کلام کا اقتباس درج ذیل ہے:

عرصہ تنگ جہاں خانہ زنجیر من است   دوستان کنج قفس گلشن تعبیر من است

نیست زاد سفرم غیر محبت ہمراہ   رہنما دررہ تو نالہ شب گیر من است

معنی صورت من گرچہ دقیق است ولی   نسخہ خلقت عالم ہمہ تفسیر من است

قادری ہستم و غوث الثقلین پیر من است   سگ آں شاہم و ایں سلسلہ زنجیر من است

کشمیر کی تعریف میں ان کی ایک غزل مشہور ہے۔ یہ کشمیر کے سخنوروں کی لکھی ہوئی غزلوں میں اچھی غزل ہے۔ اس کے چند شعر ذیل میں درج ہیں۔

ہزار داغ بدل لالہ زار کشمیر است   پس از وفات مرا یادگار کشمیر است

دریں حدیقہ خزاں بہتر از بہار بود   بہ از شگوفہ او پنبہ زار کشمیر است

اگرچہ گرم شد آتش زگرمی دل ما   خنک بدیدہ ما جوئبار کشمیر است

زبرف برگ چنارش بود ید بیضا   عصای پیر خزاں از چنار کشمیر است

کسی نگشت و نگردد زدام او آزاد   چو سبز خط بتاں سبزہ زار کشمیر است

شیخ شرف الدین محمد زہگیر، خواجہ محمد ابراہیم کشمیری کے فرزند، حضرت آخون بابا عبدالسلام وکیل کے اچھے ارادت مندوں میں اچھے عالم ہوئے ہیں۔ بعد میں وہ خواجہ عبدالرحیم شیخ کمان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ شیخ کما اور حضرت آخون کے مکاشفات، کشف وکرامات اور مقامات کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تجربات ایک کتاب کی صورت میں مدون کئے ہیں جو "روضۃ السلام" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں حضرت اخون کے پیر، حافظ عبدالغفور پشاوری کے ملفوظات بھی شامل کئے ہیں۔ کتاب اپنے برادران طریق، ملا محمد جمال اور ملا محمد عاصم کی تحریک پر مرتب کی تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"قبل ازیں در رسالہ حجت الشرف اجمالاً تحریر یافتہ بود، اما بہ سبب تحریک وتحریص پیر برادران فضائل نشان ملا محمد جمال و ملا محمد عاصم خواست کہ بطریق تفصیلی ہم برائے بعضی متنر شدان و دانش مندان طریق اذکار، وافکار رونق بانہ ولایات وحقایق ومعارف ترقیم نماید تا درمیان طالبان وسالکان ایں طریق حالی یادگار بماند... ..."

نظم ؎

ایں ترا یادگار از شرف است — نام او در جہاں بہر طرف است
بعد ازیں ہر چہ ہست آداب است — یادگیرش کہ نسخہ کمیاب است

اس کتاب کا جو نسخہ کلچرل اکادمی میں محفوظ ہے، وہ ناقص الآخر ہے، اس لئے تاریخ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔

زہگیر کی ایک اور تصنیف "حجت الشرف" ہے جو "روضۃ السلام"

سے پہلے کی تصنیف ہے، اور جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے واضح ہے، یہ مختصر رسالہ تھا، اسی کے مطالب کو بعد میں پھیلا کر "روضۃ السلام" کے نام سے لکھا۔ زیرکا انتقال ۱۲۰۵ھ میں ہوا۔

کشمیر کے قابل فرزندوں میں، جنھوں نے، ملک سے باہر بھی بڑا نام پیدا کیا تھا۔ خواجہ عبدالکریم بہت اہمیت رکھتے تھے۔ انھوں نے دور دراز ملکوں کا سفر کیا تھا اور اپنے مشاہدات اور تجربات ایک کتاب کی صورت میں مدون کیے ہیں۔ یہ کتاب "بیان واقع" کے نام سے موسوم ہے۔ عبدالکریم بڑے عالم تھے۔ حج کے مقصد سے وہ ۱۷۳۸ء میں کشمیر سے روانہ ہوئے ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ اسی زمانے میں ہوا تھا، اور دہلی میں دار وگیر کا بازار گرم تھا۔ لیکن عبدالکریم کا شوق فریضہ حج انھیں روک نہ سکا نادر مطلق العنان کے دربار میں وہ باریاب ہوئے۔ وہ عبدالکریم کے علم وفضل اور دانائی سے بہت متاثر ہوا۔ اور انھیں اپنی ملازمت میں رکھ لیا۔ بعد میں عبدالکریم نادر شاہ کے وزیر خارجہ بھی ہوگئے تھے۔ جب وہ حج کو گئے تو فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد انھوں نے بغداد، دمشق، حلب اور دوسرے اہم شہروں کا دورہ کیا اور علما سے ملے۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد کلکتہ میں ان کا قیام رہا۔ کلکتہ میں قیام کے زمانے میں انھوں نے وہاں کے مقیم انگریزوں کے طور طریق اور عادات اور اطوار کا مطالعہ گہری نظر سے کیا۔ اور مشاہدات کی تفصیلات انھوں نے اپنی کتاب میں درج کی ہیں۔ اس اعتبار سے اپنی نوعیت کا یہ واحد کارنامہ اور اہم دستاویز ہے۔ یہ کتاب "نادر نامہ" یا تاریخ نادری" کے نام سے بھی موسوم ہے۔ کیونکہ نادر شاہ کے بارے میں بھی اس میں بہت سی دلچسپ معلومات درج ہیں۔ کتاب

عبدالکریم کے کشمیر لوٹنے، کے بعد مکمل ہوئی۔ اس کے واقعات کا سلسلہ ۱۷۸۳ء (م ۱۱۹۸ھ) تک پہنچتا ہے۔

عبدالکریم ایک اور تصنیف "عبرت مقال" کے بھی مصنف ہیں۔ جو ۱۸۱۶ء میں لکھی گئی اور شاہ عالم کے عہد کے حالات سے متعلق ہے۔ یہی سال ان کے انتقال کا ہے۔ عبدالکریم کے حالات حیدرآباد کے نواب سید محمد علی خاں نے ۱۳۳۰ھ میں لکھ کر شائع کیے ہیں۔

افغان عہد کے شائستہ مذاق سخن سنجوں میں ایک میر احسن اللہ خاں راضی بھی تھے، جو فصاحت خاں کے خطاب سے مخاطب تھے۔ وہ قاضی عبدالکریم حداد کے بھائی اور عبدالغنی بیگ قبول کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ غزل میں ان کا انداز پختہ تھا۔ محتوی خاں کے فسادات پر انھوں نے ایک مثنوی بھی لکھی تھی، جسے خواجہ اعظم دیدہ مری نے شہر آشوب سے موسوم کیا ہے۔ خواجہ ان کے زمانہ بھی موجود تھے، اور فسادات کے شاہد عینی تھے۔ انھوں نے فسادات کی تفصیل خوب لکھی ہے۔ محتوی خاں، ملا عبدالنبی کشمیری کا خطاب تھا۔ جنھیں خافی خاں نے محبوب خاں عرف عبدالنبی کشمیری لکھا ہے۔ دیدہ مری نے لکھا ہی کہ

"در ہنگام نظامت شاہ عالم بہادر شاہ بممالک کابل و پیشاور در فوج شاہ رفتہ رفتہ خود را بصحبت شاہ رسانیدہ، در مذکورات علمی ہم رتبہ خطاب سوال و جواب بہم رسانیدہ"

شاہ عالم نے انھیں کشمیر میں جاگیر اور منصب عطا کی تھی، جو فرخ سیر کے عہد میں چھین لی گئی اور پھر:

"در اوایل سال ۱۱۳۲ھ جلوس پادشاہی ... خان مسطور در کشمیر بنا بر بعضی تقریبات روزگار اظہار مسائل و احکام

شرعیہ کہ درباره ہنود واہل وار دست نمودہ بہ امیر محمد خاں التماس اجرای کرد ... غلبہ ہنود کہ در حضور و کشمیر داشتند، میر احمد خاں صورت پیش رفت آں ندانستہ و متصدیان کشمیر بلکہ اکثر اعیان لاسیما ارباب محکمہ متصدیان شرعی مخالف رای محتوی خاں ماندہ مجوز اجرای ایں مسائل واحکام نشدند"۔

اس پر محتوی خاں نے فتنہ کھڑا کر دیا۔ اس کے سد باب کے لئے جو صلاح مشورے ہوئے تھے، خواجہ اعظم اس میں شریک تھے۔ راضی کے شہر آشوب کے جستہ جستہ اشعار حسب ذیل ہیں۔

ندارد خلد با کشمیر نسبت عیان است ایں بہ ارباب بصیرت
دریں گلشن زرندان قدح نوش کہ چوں بحر ندائم بر سر جوش
زشور انگیز حیدری بی نمک شد زلوح سینہ نقش عیش حک شد
عجب ہنگامہ گردید ظاہر زجنگ شیعہ و سنی و کافر
بمرداں صف شکن در عرصہ کیں ندیدہ کس بد بینان فوج سنگیں

راضی کی مثنوی طویل ہے، اور سارے فسادات کی اس میں تفصیل ملتی ہے۔ راضی کی غزل کا طرز اساتذہ جیسا ہے۔ ذیل کے اشعار سے، اس کا اندازہ ہو سکتا ہے:

با عندلیب صلح کنم یا بہ باغباں ای گل ترا بخاطر عاطر چہ می رسد

ہمیشہ برلب فوارہ ایں سخن جاریست کہ اوج منصب دنیائے دوں نگوں ساریست
دریں محیط نہ فوارہ ایم و نہ گرداب بہر نشیب و فراز از چہ حکم ما جاریست

کمال فقر و غنا خصم جاں بود راضی — کہ نخل را خطر از برتری و بی باریست

راضی حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی کے معتقدین میں سے تھے۔ ان کے دیوان میں خواجہ کی مدح میں کچھ شعر ملتے ہیں۔ انھوں نے ایک دیوان چھوڑا ہے، جس میں غزل، رباعیات اور مثنویاں شامل ہیں۔ مثنوی خاں کے فتنہ کے علاوہ راضی نے ایک مثنوی نواب اکبر علی کی مدح میں کہی تھی۔ جس کے کچھ شعر ہیں:

منظہر لطف خدا در دوراں — ہست نواب علی اکبر خاں

وہ چہ نواب وَلیِ نعمت خلق — مطنجش قبلہ گہہ لذت خلق

دیوان کے آغاز میں ایک نثری دیباچہ بھی شامل ہے۔ شاعر اپنے بارے میں کہتا ہے:

فقیہہ عصر و سپاہی و شاعرم راضی — بصرف و نطق بود دست در اصول مرا

کشمیر میں برف و باراں کی زیادتی کے بارے میں، راضی کا استخراج دل چسپ ہے کہتے ہیں:

بکوہستاں زصحرا برف باراں بیش می بارد

اسد راضی فزوں ترفیض گردوں سر فرازاں را

ملا نور محمد اور شیخ محمد رفیقی اس دور کے علما میں تصنیف و تالیف کا بھی شغف رکھتے تھے۔ ملا نور محمد نور بابا بتلو کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کی تعلیم ملا عبدالستار کشمیری کے یہاں ہوئی تھی، بعد میں دہلی جاکر، مولوی حسام الدین، قاضی مستعد خاں اور قاضی مبارک کے آگے زانوے شاگردی طے کیا تھا۔ کشمیر لوٹنے کے بعد ملا نے درس و تدریس اور اشاعت علم میں ساری عمر گذار دی۔ ان کا انتقال ۱۷۸۱ء (م ۱۱۹۵ھ) میں ہوا۔ انھوں نے "مطول"

پر حاشیہ لکھا تھا، جو عالمانہ کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

شیخ محمد رفیقی ابوالرضا، فقہ، حدیث اور تفسیر کے عالم کی حیثیت سے اونچا مقام رکھتے تھے۔ ان کے ماموں علامہ نورالہدیٰ بھی جید عالم تھے، اور شیخ رفیقی نے انہیں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ صوفی مشرب انسان تھے اور پیر غلام حسن نے لکھا ہے کہ تصوف میں کئی رسالے تصنیف کئے تھے۔ ان کے انتقال کا سنہ ۱۸۱۳ء (م ۱۲۲۹ھ) ہے۔

عبداللہ خاں حاکم کشمیر (۱۷۹۵ء م ۱۲۱۰ھ) کے عہد میں گوپال پنڈت در فقیر بڑے خوش فکر سخن ور گزرے ہیں۔ وہ سرینگر میں صفاکدل کے قریب رہا کرتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۷۹۸ء میں ہوا۔ ان کی فارسی غزل کے چند شعر درج ذیل ہیں:

اے گوش بجرم نگذاری چہ تواں گفت — نے عجز شنیدی و نہ زاری چہ تواں گفت

با غیر ہزار مہر و با ما صد کیں — دیدیم کہ داری و نداری، چہ تواں گفت

فقیر رباعی اور مستزاد بھی کہتے تھے۔ ان کی ایک رباعی ہے۔

فانی شدن جہاں کہ آں در نظر است — اندیشہ آخرت ازاں خوب تر است

امروز بکن کہ ہست پا بر سر خاک — فردا چہ کنی چارہ کہ خاکت بسر است

فقیر نے فقیر اور غنی کے تضاد سے فائدہ اٹھا کر ایک شعر میں غنی کی طرف اس طرح اشارہ کیا تھا۔

این زمان شاعر اگر ہست فقیر است اکنوں

پیش ازیں وقت شنیدم کہ غنی ہم بودہ

ملا حبیبی کشمیری نے، ارضیات اور جغرافیہ کے موضوع پر ایک کتاب "عجائب البلدان" کے نام سے ۱۲۱۸ھ میں لکھی تھی۔ یہ اس عہد کے اہم علمی

رسالوں میں سے ہے ۔ مصنف نے کتاب کے موضوع اور اس کے مسائل کے بارے میں لکھا ہے کہ :

" دریں ایام خجستہ فرجام مختصری مشتمل بر مساحت سطوح اجسام و مقادیر اعلام واجرام و تحقیق مبادی اقالیم و نہایات آں و تبیین مواضع و اعجوبات ہریک ازاں در قید تقریر و سلک تحریر مرتبط و منخرط ساخت "۔

رسالہ خواجہ حبیب اللہ کے نام سے معنون کیا ہے ۔

شاہ صادق نے "ترجیع بند" کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا تھا، جس میں دو ترجیع بند شامل ہیں ایک کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ۔

چشمی کہ خیال تست دروی   کونین ندید جز بہ لاشئ

اس کا ٹیپ کا شعر ہے ۔

از زہد ریا کنوں گذشتم   تا رفتہ بپای خم بیفتم

دوسرے ترجیع بند کا پہلا شعر ہے :

با یار دلم وصال دارد   از ہر دو جہاں ملال دارد

ٹیپ کا شعر ہے :

از مادر طبع خویش زادم   بر کون و مکان قدم نہادم

آخر میں ۱۲۴۲ھ ہجری سنہ درج ہے ۔

"پنج گنج" عبدالغفور شوپیانی کی تصنیف معرفت باری تعالیٰ کے رموز میں ہے ۔ کہتے ہیں :

کس نداند قدر این اسرارہا   کس نیابد لذت انوارہا
دو ہزار و چار صد ابیات شد   جملہ قصص و پند و اخبار شد
از حقیقت در حقایق ہا پر است   ہر حقایق اندریں چوں گوہر است

یکہزار و دو صد دو دہ و پنج — وقت دیگر ختم شد این پنج گنج

خواجہ نیاز احمد، جو خواجہ شاہ نیاز کے نام سے مشہور ہیں، الغز گفتار سخنور تھے۔ ان کا رسالہ "عرضِ نیاز" نظم اور نثر پر مشتمل ۱۲۲۸ھ میں لکھا گیا تھا۔ نام اور سنہ کا تذکرہ آخری اشعار میں اس طرح کرتے ہیں۔

رسید این نامہ دل کش بانجام — سزد عرضِ نیازش گر نہم نام

چوں پرسد کس ز تاریخ و حسابش — بود عرضِ نیاز من جوابش

چائے کی مدح سرائی میں جن شعرا اور مصنفین نے نظمیں اور رسالے لکھے ہیں، ان میں طبیعت کی اپج کے لئے جہاں ایک دل چسپ موضوع فراہم کر لیتے ہیں، غلوِ خیال کیلئے تمثیلی انداز اظہار کا بھی اسے ایک ذریعہ بنا لیتے ہیں چائے، کشمیر کی سرد آب و ہوا کے ساتھ ایک خصوصیت رکھتی ہے، اور یہی بات چائے کی مدح سرائی کے لئے ان کی محرک ہوتی ہے۔ نیاز حمد و نعت کے بعد، اپنے موضوع کی معنویت کا ذکر کرتے ہیں۔

"تمہید مقدمہ تعریف محبوب مرغوب شیریں ادای چای و توصیف آں غمزدای مسرت افزای بعنوان مجاز و فی الحقیقت از نعت بمنعم پی بردن و از مجاز بہ حقیقت راہ طی کردن است۔"

چائے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"الحق چائی محبوبی است مرغوب قلوب خاص و عام نادرہ ایست مطبوعہ طبایع عالی و ادنی بنی آدم:

چو او زیبا نگاری در جہاں نیست — بہ عالم مثل او آرام جاں نیست

بود پیر و جواں مشتاق رویش — گدا و پادشہ در آرزویش

نہالی قد او در آب و گلہا — بر عنائی شدہ مقبول دلہا

بہار مرغزار آرزوہا ست — درخت برگ وسار آبروہا ست

مدام شیرخام در پختن ہوس مواصلتش چوں گرمی شوق عاشقاں در جوشش پیوستہ مسکہ از حرارت اشتیاق معانقش گدازاں و مدہوش و آرزوی او مشتاقان بساں دہاں دیگ بخمیازہ آرد و نمک حسن و جمال او عشاق را از خم جگر تازہ دارد....."

چائے کے متعلقات کی ساری رعایتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، خالق کی اس نعمت عظمیٰ کے بیان سے نیاز ذہن کو خالق کی حمد و ثنا کی طرف رجوع کرلیتے ہیں۔

خضر بابا بہاری نے جو ایک خدا رسیدہ بزرگ اور عالم تھے، ۱۲۳۴ھ میں ایک مثنوی "زبدۃ الافکار" کے نام سے سیرت نبوی پر لکھی تھی۔ ذیل کی بیت سے اس کی تصنیف کی تاریخ برآمد ہوتی ہے:

چشمہ فیضش اگر خواہی نکوست — زانکہ عین فیض جاری سال اوست

"اذکار العرفا" کشمیر کے بزرگوں کے حالات پر ایک رسالہ ہے، جو سات ابواب پر منقسم ہے۔

خواجہ اسد اللہ شگون اچھے شاعر تھے۔ خواجہ جلال الدین المشہور بہ خواجہ سنگین کی وفات پر ان کی لکھی ہوئی تاریخ حسب ذیل ہے:

خواجہ سنگیں جلالش بود نام — صاحب اقبال و جاہ و احترام

جانب کشمیر با پورا امیر — از بخارا آمدہ با احتشام

"تحفہ محمدی" ایک مذہبی رسالہ ہے جو حاجی محمد جان کے لئے منظوم کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ احکام دیں اور مطالب اخلاق پر مشتمل ہے۔ خاتمہ کتاب پر لکھتے ہیں:

این سخنهای اولیای کرام | حسب درخواستش گرفت اتمام
زد عطارد ز بہر سال رقم | تحفہ ثانی آمدہ بقلم

ملا حیدر لنشلو اسی عہد کے سر برآوردہ علما میں تھے، ان کے والد ملا جمال الدین لنشلو بھی عالم تھے۔ ملا حیدر قرآنی علوم اور تجوید میں کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی تھیں، جن میں "نور السراج" "سراجی" "مفتاح الرحمۃ" "مصباح الظلمہ" "مرقع الغزلان" "رسم خط قرآن" "در یتیم" "غرائب الغرائب" فقہ اور اس کے مسائل پر اور "مناہج" تصوف میں، "خیر الحسنات" تجوید میں اور "شرح چہل و چار" حدیث میں ہیں۔

"مرقع الغزلان" ۱۲۱۲ھ میں نظم کی گئی تھی۔ جس میں کاتب قرآن کے لئے ہدایات درج کی ہیں نظم کہتے ہیں:

نیز بر لوح ماہ سیم سرشت | نظم حیدر بآب زر بنوشت

نام کے بارے میں لکھتے ہیں:

بوستانی پر از گل و ریحان | ہر کہ گفتہ بمرقع الغزلان

افغان عہد میں کئی اچھے خوشنویس بھی ہوئے۔ ان میں سے اکثروں کے حالات اور خط کے نمونے اب دستیاب نہیں ہوتے۔ ایک خوشنویس محمد رسول کی مشق کا نمونہ ملتا ہے۔ اس کے ۱۱۷۱ھ کے لکھے ہوئے خط کا نمونہ جناب میرزا کمال الدین شیدا کے پاس محفوظ ہے۔

۱۰
سکھوں کا دور

۱۸۱۹ء تا ۱۸۴۶ء
۱۲۳۴ھ تا ۱۲۶۲ھ

سکھوں کے تسلط کشمیر کے آغاز ہی سے، عوام کے ساتھ ناانصافی اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رہا۔ سکھ حکمران یکایک اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، انہیں جہانبانی کے اوصاف سے آگاہی نہیں تھی۔ کشمیر میں مسلمان آبادی سکھوں کے مظالم کا نشانہ رہی، جس کی تفصیل بامزئی نے اپنی تاریخ کشمیر میں دی ہے سکھوں کے مذہبی جنون نے اسلامی معابد کی بے حرمتی کو روا رکھا۔ حتیٰ کہ مسجدوں میں اذان کہنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ اور جامع مسجد کو عرصہ تک تالا لگا دیا گیا۔ حمید اللہ شاہ آبادی نے اس عہد میں حاکموں کی بدعنوانیوں کی تفصیل طنزیہ انداز میں "بہوج نامہ" میں لکھی ہے۔

نظم ونسق کے اعتبار سے سکھ دور کی ابتری کے مقابلے میں فارسی ادب اور شاعری کی ترقی قابل اعتنا رہی۔ اسی لئے اس عہد کو "ثانی عہد مغل" بھی کہا گیا ہے۔ حمید اللہ شاہ آبادی، بہاء الدین متو اور مرزا مہدی مجرم کے علاوہ پنڈت شعرا میں بیربل کاچرو، پنڈت بھوانی داس کاچرو، بکو پنڈت، مکند رام ہندو، پنڈت تابہ رام ترکی، شنکر جیو آغون گرامی، نارائن داس خبیر اور لچھمن رام بہرو، نے شہرت حاصل کی۔ راجا تیغ سنگھ جس کے عہد میں مہاراجہ گلاب سنگھ بانی سلطنت جموں و کشمیر

نے کشتوار پر قبضہ کیا تھا۔ راجا عنایت اللہ سنگھ کا بیٹا تھا۔ باپ کی طرح اسے بھی شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ اس کے فارسی اشعار ملتے ہیں۔

شاہ شجاع الملک، فرزند تیمور، باپ کی انتقال کے بعد بھائیوں کے ساتھ کشش و کشمکش کے زمانے میں لاہور سے بھاگ کر کشتوار آگیا تھا، اور دو سال یہاں اس کا قیام رہا، راجا تیغ سنگھ نے اس کی آؤ بھگت کی۔ ایک دفعہ جب دونوں چوگان کے مرغزار کی سیر میں مصروف تھے۔ شعر و شاعری کی سوجھی۔ چنانچہ شاہ شجاع نے ایک مصرعہ کہا، تیغ سنگھ نے فوراً اس پر مصرعہ لگاکر بیت مکمل کردی۔ یہ ابیات ذیل میں درج ہیں۔

شاہ شجاع الملک	راجا تیغ سنگھ
لب میگون یار را عشق است	بادہ خوشگوار را عشق است
ابر بد مست دتار در فریاد	سنبل مشکبار را عشق است
آہ من جاگرفت در دل ماہ	جگر داغدار را عشق است

ایک اور موقع پر بھی ان دونوں میں بیت بازی ہوئی تھی۔ شاہ شجاع نے مصرعہ موزوں کیا تھا:

برسرِ ماہ تاباں دیدم نہ دیدہ بودم

راجا تیغ سنگھ نے اس پر مصرعہ چست کیا:

شمشاد در اخرامان دیدم نہ دیدہ بودم

کشمیر میں کشمیری لوک کہانیوں کو بھی فارسی شعرا نے اپنا موضوع بنایا تھا "ہیمہ مال ناگرائی" کشمیر کی سب سے مشہور لوک داستان ہے۔ اس کو مفتی صدرالدین وفائی نے فارسی نظم میں منتقل کیا تھا۔ وفائی اپنے شہر کے اچھے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی فارسی نظم "تحفۃ العشاق" کے نام سے موسوم ہے۔ وفائی کا انتقال ۱۸۰۸ء (م ۱۲۲۳ھ) میں ہوا۔

پنڈت شنکر جیون آخون گرامی، سرینگر کے محلہ رینہ واری میں ۱۷۶۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۲۵ء (۱۲۴۱ھ) میں وفات پائی وہ فارسی کے بڑے سنجیدہ اور خوش مزاق شاعر تھے۔ غزل کے علاوہ رباعی مثنوی اور دوسری اصناف میں شعر کہتے تھے ایک مثنوی "در نیت شاہ" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس میں مولانائے روم کی انداز پر ایک پادشاہ کی حکایت بیان کی ہے۔ جو ایک ہرن کے تعاقب میں ناکام ہو کر شدت تشنگی کی وجہ سے پانی کی تلاش میں ایک باغ میں پہنچا جہاں ایک بوڑھے نے درخت سے انار توڑ کر اس کا شربت پلایا۔ شربت نوش کرنے کے بعد پادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ یہ باغ اس قدر تر و تازہ ہے، اگر میں زراعت پیشہ لوگوں سے کچھ زیادہ لوں تو بڑی دولت فراہم ہو جائے گی اور اس سے ان کا نقصان بھی نہ ہوگا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور گلاس شربت کی خواہش بوڑھے سے کی اس دفعہ بوڑھے نے دس انار توڑے لیکن تھوڑا سا بھی شربت نہیں نکلا، چند قطرہ بھر پیالہ لاکر پادشاہ کے سامنے رکھا تو پادشاہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے، شربت میں کمی کیوں ہے۔ اس پر بوڑھے نے اس سے کہا:

بگفتا اے جوان نیک محضر — یقیں دائم کہ شاہ عدل پرور

بدل اندیشہ بیداد کرد است — دل و دولت ز خود ناشاد کرد است

جب بادشاہ نے بوڑھے سے یہ بات سنی:

چو بشنید ایں سخن زاں پیر درویش — پشیماں گشت از اندیشہ خویش

اس کے بعد پھر بوڑھے سے درخواست کی:

سبک برخیز داز جا پا برہ نہ — گراں گر نایدت جام گراں دہ

بوڑھا اس دفعہ گیا تو پہلے کی طرح پھر ایک انار کے رس سے پورا پیالہ بھر ہو گیا پادشاہ نے اس کا راز بوڑھے سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا:

بگفتش اے جوان معرفت جو — نیکورائی و نیکوروئی و نیکو خو

مگر نشنیدی از پیر سخن سنج | تو این پند گرامی بر ز صد گنج
چو نیت نیک باشد پادشاہ را | گہر خیزد، بجائے گل گیاہ را

خواجہ شاہ نیاز نقشبندی، خواجہ عبدالرحیم کمان کے صاحبزادے تھے۔ گھر سے مرفہ حال تھے، تاہم والد کی تربیت سے تصوف سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا۔ میاں محمد امین دار کے پوتے میاں ضیاء الدین کی صحبت میں معرفت اور حقیقت کے رموز سے روشناس ہوئے تھے، ترکستان کے سفر میں انہوں نے کرنل ولیم مور کرافٹ کی مدد کی تھی۔ جسے جاسوس کے شبہ میں گرفتار کر لیا گیا تھا، مور کرافٹ نے رہا کرانے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ سے سفارش کر کے انہیں بریں میں چھ ہزار سالانہ کی جاگیر دلوائی تھی، وہ فارسی میں صاحب دیوان تھے۔ ایک "چائے نامہ" دلچسپ انداز میں لکھا ہے، شاہ نیاز کا انتقال ۱۸۲۹ء میں ہوا۔ ان کے غزل کے کچھ شعر ہیں:

تیزی خنجر مژگان تو بی چیزی نیست | شوخی نرگس فتان تو بی چیزی نیست
غمزہ خونریز دلبت جان دہ زلفت ہیچ | شوخ من این سر و سامان تو بی چیزی نیست
میل دل بردن خوبان گلستان داری | جلوہ سرو خرامان تو بی چیزی نیست
شوخ چشمی نگاہ ز دست تو دل بردن | آہ این گریہ پنہان تو بی چیزی نیست

اسی زمانے کے جید علماء میں میر محی الدین مہدی اکمل (ولادت ۱۲۴۵ھ) تھے جو مرزا اکمل الدین بدخشانی کے خلیفہ اول عبدالوہاب نوری کے ارادت مندوں میں سے تھے، فارسی اور عربی کے وہ بے مثل عالم تھے۔ چنانچہ ان دونوں زبانوں میں انہوں نے تصانیف چھوڑی ہیں۔ عربی میں ان کی تصانیف "سبع اطوار" "دوائر ششش سلسلہ" اور "میزان المقادیر" اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک مکمل دیوان بھی موجود ہے۔ جو اخلاق اور تصوف کے مضامین سے پر ہے۔ ان کا کتب خانہ بھی علوم اور فنون کا خزانہ تھا جس میں قرآن، حدیث، تصوف، اخلاق، ریاضی اور ادب پر تصانیف

کے نادر مخطوطات جمع کئے گئے تھے۔

اکمل خوشنویس بھی تھے اور یہ فن عرصہ تک ان کی اولاد میں باقی رہا۔ ۱۲۴۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

بہاءالدین متو علماء کے ایک سربرآوردہ خاندان سے تھے۔ یہ خاندان "متو" کے اسم نسبتی سے مشہور تھا اور اس خاندان میں ملا مقصود، ملا نصر اللہ، اخوند ملا عبد الحق، مفتی ہدایت اللہ جیسے علماء ہوئے ہیں۔ بہاءالدین روحانی مرتبہ کے علاوہ شعر و سخن میں بھی پایہ رکھتے تھے۔ شاعری میں وہ بہا تخلص کرتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۱۶۶ھ (م ۱۲۰۸ھ) میں ہوئی۔ طبیعت کو تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ غزل کے علاوہ انہوں نے ایک خمسہ بھی لکھا تھا۔ جس کی وجہ سے کشمیر کے خمسہ نگاروں میں ان کا مقام پیدا ہو گیا ہے۔

بہا کا خمسہ حسب ذیل مثنویات پر مشتمل ہے۔

(۱) ریشی نامہ، حضرت شیخ نورالدین ریشی کے حالات میں۔

(۲) سلطانیہ، حضرت مخدوم شیخ حمزہ کے بارے میں۔

(۳) غوثیہ، حضرت عبدالقادر جیلانی غوث الاعظم کی زندگی اور تعلیمات پر مشتمل ہے۔ جس کے اختتام کا سنہ "ستون دین فنا" سے برآمد ہوتا ہے۔

(۴) نقشبندیہ، نقشبندی سلسلے کے بزرگوں کے احوال میں مثنوی حضرت خواجہ یوسف ہمدانی کے حال سے شروع ہوتی ہے اور کشمیر کے حضرت خواجہ عنایت اللہ نقشبندی پر ختم ہوتی ہے۔ اس کی تکمیل کا سنہ "ختم نامہ" سے برآمد ہوتا ہے۔

(۵) چشتیہ، چشتی سلسلے کے بزرگوں کے حالات میں جس کا آغاز حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہوتا ہے اور حضرت میاں ہاشم کشمیری پر ختم ہوتی ہے۔

اس نظم میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد بزرگان قادریہ کا شجرہ بیان کیا ہے اور

شجرہ ختم کرنے کے بعد مرشد حضرت شاہ عنایت اللہ کی مدح کی ہے۔ "ریشی نامہ" کے موضوع اور مطالب کی تفصیل کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ابتدائی ریشی نامہ عنبر شمامہ در ذکر وصاف وشرح حالات منزدیان خلوتخانہ تجرید وبادہ نوشان پیمانہ توحید وتفرید حضرت ریشیان کشمیر رحمت اللہ علیہم کہ ہر ایک دردانہ عشق ودریائی توحید اند . . . . .

ریشان نور مطلق اند ہمہ خاصہ حضرت حق اند ہمہ
نام شاں شہرہ جہاں گیری ہر طرف ریشیاں کشمیری
ہمہ سلطان ملک تجرید ند ہمہ مستان جام توحید اند

حضرت نورالدین ولیشی کے حالات سے تذکرہ کا آغاز ہوتا ہے۔

سال تاریخ ہے بہ:

سال تاریخ عقل فطرت سای گفت شد ریشنامہ روح فزائی

"سلطانیہ" میں حضرت مخدوم شیخ حمزہ کے مکتب میں بٹھائے جانے کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:-

حضرت شیخ چوں بکوہ دبدشت از سر حال روز و شب میگشت
میرد روز و شب بکوہ و درہ نیست کارش بکار ہائی سرہ
پس بسوی معلمش بردند خویش وبیگانگاں غمش خوردند

بہاءالدین متو کی وفات ۱۲۴۸ھ میں ہوئی۔

پنڈت مکندرام ہندو تخلص کرتے تھے۔ ان کا خاندان سرینگر میں حبہ کدل کے قریب محلہ ورانی یار میں رہتا تھا۔ ہندو تلاش معاش میں حیدر آباد دکن چلے گئے تھے اس کا تذکرہ ایک شعر میں اس طرح کیا ہے:-

مقسوم آب ودانہ بگردوں برون رزد ہندو وطن کجا وزمین دکن کجا!

میر نواز جنگ اور راجہ راجیشر راو اصغر نے ان کی سرپرستی کی ۱۲۶۳ھ تک وہ بقید حیات تھے۔ فارسی میں بہت سا کلام چھوڑا تھا۔ لیکن وہ تلف ہوگیا۔ کلام سے زبان کی خوبیوں کے شعور اور بالغ نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزل کے کچھ شعر ہیں:

جنوں بے اختیارم میکشد سوئے بیاباں ہا ۔۔۔ ز انساں تلخ عیشم انس می گیرم بہ حیواں ہا

شمیم گیسوی مرغولہ مویت ۔۔۔ دماغ من سراپا مشک چیں کرد

بلند و ناز بد نسبت قدت بہ صنوبر ۔۔۔ کہ استادہ چو سرہنگ یک آزادہ غلام است

پنڈت بیربل کاچرو وارستہ، پنڈت دیارام کاچرو خوشدل کے بیٹے، صاحب ذوق سخن سنج اور اچھے انشا پرداز تھے، سکھ عہد کے فارسی سخنوروں میں وہ ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ستر برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ وارستہ کو فارسی زبان پر اچھی قدرت حاصل تھی۔ بظاہر وہ قدیم روایات شاعری کے پابند تھے۔ لیکن اکثر جگہ اضافی قیود کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی وہ روایت سے تجاوز کرتے ہیں۔ غزل میں وہ حقائق اور اخلاق کے مضامین باندھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ادیان کی وحدت کی طرف بھی اشارے کرتے ہیں۔ مثلاً:

اں خدای کہ نور بیکتا ی ۔۔۔ خالق مومن است و ترسا ی
چہ بمسجد، چہ خانقاہ و چہ دیر ۔۔۔ نور پاکش بہ جلوہ آرائی

ایک غزل میں جسے دراصل نظم کہنا چاہیے، بت پرست، ترسا، مسلمان، شیعان علی، سب کا ذکر کیا ہے اور انہیں "از اسرار حقیقت جملہ غافل" بتایا ہے۔ ان کا مسلک تھا:

یکے دانست بے تشبیہ و بے یار ۔۔۔ کہ نور اوست در ہر شے پدیدار

اخلاقی نکتے بیان کرنے کا ان کا طریقہ سعدی سے ملتا جلتا ہے۔ جمع مال کے بارے میں کہتے ہیں۔

چہ خوش فرمود استاد خردمند	زبہر زر پرستان نکتہ چند
ببیں تا ردں چہ برد از گنج دنیا	بیر زد گنج دنیا، رنج دنیا

وارستہ کو حیات اور کائنات کی حقیقتوں کا عرفان ہے۔ انہیں زندگی کی پستیوں سے ہمدردی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ صاحب دولت کا یہ فرض ہے کہ

گر آید سائلے بر در گہ او	کشاید دل نیارد چیں برابرو

ان کے تغزل میں قدسی کا سا انداز اور جامی کی سی گھلاوٹ ملتی ہے چند شعر ہیں:

سرفگندم در رہت یعنی کہ خاک پاست ایں	میرد ی خارخ زمن یعنی چہ استغناست ایں
آہوئے مست است چشمت یا غزال دشت چیں	یا سیہ مست شراب ناز یا شہلاست ایں

غزل میں وہ ماہرانہ ندرتوں سے بھی کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک غزل منقوط لکھی ہے۔ جس کا ایک شعر ہے:۔

چیں جبیں بت چینی ببیں	زیب ذقن بیش زینی ببیں

اسی طرح انہوں نے ایک غیر منقوط غزل بھی لکھی ہے۔ جس کے دو شعر یہ ہیں:

کرد کرم داور اکرم مرا	داد مرا دور دو ہم مرا
در رہ اسرار دل اہل درد	کرد ہم او ماہرِ محرم مرا

ایک غزل "چار پارہ" کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

بتے دارم لبہا ماٹی برنگ و بو گلستانی	برخ صبحی ہوشامی می آشامی غزلخوانی
برخ صبحی سخن گوئی بقد سروی بہی تاباں	دہن تنگی بدل سنگی چہ نیرنگی ہلارانی

ان کی ایک مثنوی بھی ان کی قادر کلامی کا نمونہ ہے۔ اس کا عنوان "قصہ ستی نامہ معروف بہ مثنوی سوز و گداز" ہے۔ اس مثنوی میں کشمیر کے ایک نوجوان کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس حسین نوجوان کو اپنی بیوی سے اور بیوی کو اس سے ایسا عشق تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے کے دیکھے بغیر چین نہیں پڑتا تھا۔ قضارا نوجوان بیمار پڑا، طبیبوں نے اس کے علاج سے دست کشی کرلی۔ آخر ناشدنی پیش آکر رہی۔ جب شوہر کی لاش کو نذر آتش کیا تو بیوی بھی اس کی چتا میں جل کر خاک ہو گئی:

جوانے بود در اقصائے کشمیر نیکو رزی و نیکو خو نیک تدبیر

اس نوجوان کا سراپا بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کی محبوبہ کا یہ حال تھا کہ:

نیاسودی بہ یکدم بی رخ یار رساندی ہجر تش بر سوختن کار
ہمہ شب گرد آں زلف چلیپا بگردیدی بصد دل شانہ آسا

اس واقعہ کی تاریخ ۱۱۴۲ھ بتائی ہے۔

کشمیر کی تعریف میں بھی وارستہ نے ایک مختصر مثنوی لکھی ہے جس میں ہنگامہ نوروز میں کشمیر کی بہاروں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس مثنوی کے کچھ شعر یہ ہیں:

بہار است اے مطرب خوش ادا بزن بربط و چنگ در کش نوا
بیا اے سخن سنج فرخندہ خوی ز دی دیری قصہ ہا بر مگوی
کہ نوروز فیروز شد جلوہ گر جہاں خلعت تازہ کردہ ببر

پنڈت بیربل کشمیر کی ایک تاریخ کے بھی مصنف ہیں۔ یہ کرنیل مہان سنگھ کے عہد میں مکمل ہوئی، یہ تاریخ "مختصر التواریخ" "مجمع التواریخ" اور "مجموع التواریخ" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کا آغاز ۱۸۳۵ء میں ہوا اور

۱۸۴۶ء (م ۱۲۶۲ھ) میں اختتام کو پہنچی۔ اس تاریخ سے سکھوں کے عہد کی سماجی اور اقتصادی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ تصنیف کے بارے میں دیباچے سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"امیدوار فضل و افضال دارندہ ابد و ازل پنڈت بیربل معروف بہ کاچرو در ایام فرحت فرجام حکومت باخیر و برکت کرنل میہان سنگھ در سموت یکہزار و ہشت صد و نود و دو مطابق دو صد و پنجاہ و یک ہجری در ہنگام راج سراسر ابتہاج ۔۔۔۔ رنجیت سنگھ پادشاہ سلمہ شری اکال ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ بہ تسطیر مختصر مبادرت نمود"

مصنف نے ابتدا میں ان تاریخوں کا مجمل تذکرہ کیا ہے جو ان سے پہلے لکھی گئی تھیں۔ شیر سنگھ کے حالات پر یہ تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔

"در عمل جہانگیر پادشاہ حیدر ملک چاڈورہ بحکم او از تفصیل سمسکرت معلوم کردہ بزبان فارسی ترجمہ تا سموت یکہزار و شش صد و شانزدہ راجہ بکرما دتی موافق یکہزار و شصت و ہشت ہجری رسانید۔ دیگر نرائن کول نام شخصی در دور محمد شاہ پادشاہ تا سموت یکہزار و ہفت صد و شصت و دو مسادی یکہزار یکصد و بست و دو ہجری تا ضمیمہ حیدر ملک درست ساخت از آں باز آئین تاریخ بدستور معطل ماند۔"

پنڈت بیربل کاچرو نے "مہاشیو پران" کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ آغاز میں حمد و ثنا کے بعد ظہور قدرت و پیدائش شری برہمان جی و شری بشن جی کا حال لکھا ہے۔

"برضمائر فیض مظاہر طالبان رموز وحدت و واقفان اسرار الوہیت

واضح ولائح گردد کہ ذرہ ہیچ تراز ہیچ عبودیت سیر پنڈت راجہ

بیربر معروف بہ کاچرو از مدت کثیر بخاطر جائیگیر گردہ بود کہ بر کیفیت

اسم مبارک شری شیوجی مہاراج کہ بترجمہ فارسی سرور باشد وموحدان

حقیقت جو شب و روز بدریافت آں نور راز نور درجستجو اند علیم

وآگاہ گردد۔"

کرنیل مہان سنگھ ہی کے عہد کی ایک اور تاریخ ملتی ہے جس میں تاریخی حالات سے زیادہ زمین کے بندوبست 'آمدنی' محصولات اور باشندوں کی تفصیل دی گئی ہے اس کے مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلتا لیکن انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف عالم تھا ڈاکٹر صوفی نے اپنی تاریخ میں اس کی تفصیل لکھی ہے۔ یہ ابتدائی دور سے شروع ہوتی ہے اور شیخ غلام محی الدین کی وفات پر ختم ہو جاتی ہے۔

"نورالدین نامہ" باباکمال الدین کی تصنیف ہے۔ نظم میں حضرت نورالدین کے اوپر کے سلسلے کے بزرگوں کا شجرہ لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

امیر کبیر ابن سید شہاب بحضوری آدرد دین خراب

بمیر محمد کہ فرزند اوست نگہدار از دشمنانم چو دوست

ازیں جا بدو شاخ آمدہ ایں شجر یکی گشتہ از ریشیاں پرثمر

"نورالدین نامہ" حضرت نورالدین ریشی کے حالات میں بسیط منظوم کارنامہ ہے آغاز نظم میں سبب تالیف کا ذکر کرتے ہیں، اور اپنے خواب کا ذکر کرتے ہیں:

"تمہید کتاب نورالدین نامہ و بیان رویای خواب" کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ ایک رات خواب میں میرا گذر ایک باغ میں ہوا، جہاں حضرت نورالدین کی بارگاہ میں مجھے پہنچایا گیا، لکھتے ہیں:

چہ بستاں یکی باغ جنت نشاں — بروں از حد وصف ونطق بیاں
مصفا ورعنا چو خلد بریں — نشیمن معطر ہوا عنبریں

باغ میں ایک دربار دُربار آراستہ وپیراستہ دیکھا۔ جس میں حضرت نورالدین نند

شہ ملک ودیں نورالدین نام اوست — چہ جان وچہ انساں ہمہ رام اوست

کے دربار میں گئے اور آپ کے فرمان سے ایک جام شیریں ان کے ہاتھ میں دیا گیا:

بنوشید وسرمستی از سر گرفت — بدل ماند احساں شہ در شگفت

صبح جب بیدار ہوئے تو حضرت شیخ العالم کے آستانے پر حاضری دی اور:

بپیر سیدم از عقل تدبیر شیر — بگفتا سخن ہای مانی الضمیر

انھیں سخن ہای مانی الضمیر کی شرح یہ ضخیم مثنوی ہے۔ اس کی تکمیل کا سنہ ۱۲۹۷ھ ہے جو "تمامی شدہ نورالدین نامہ" سے برآمد ہوتا ہے۔

حمید اللہ شاہ آبادی صاحب دل بزرگ تھے وہ پرنگ کے رہنے والے تھے لیکن آخری عمر میں اسلام آباد (اننت ناگ) آگئے تھے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ درس وتدریس میں بسر ہوا۔ غزل سے زیادہ ان کی طبیعت طویل منظومات اور مثنوی لکھنے کی طرف مائل تھی۔ چنانچہ انہوں نے "بیبوج نامہ" کے علاوہ ایک خمسہ لکھا تھا خمسہ کی مثنوی "شکرستان" سعدی کی "بوستان" کا جواب بلکہ اس کی پیروی ہے۔ "اکبر نامہ" ایک رزمیہ ہے جس میں افغانوں کی تین پہلی جنگوں کے واقعات نظم کئے گئے ہیں۔ اس کا ہیرو دوست محمد خان والی افغانستان کا بیٹا اکبر خان ہے۔ فردوسی کشمیر عبدالوہاب پرے نے اس کا ترجمہ کشمیری نظم میں کیا تھا۔

حمید اللہ شاہ آبادی کی ایک اور تصنیف "دستور العمل" میں پند ونصیحت کی باتیں لکھی ہیں۔ یہ سعدی کی گلستان کے انداز کا رسالہ ہے جیسا کہ ذیل کا اقتباس سے واضح ہوگا:

ہر کہ ترک منصب کرد، بعیش و فراغ نشست و آنکہ ایں کباب ترفہ در رنج و سیخ داغ ببیند :

عیش و عشرت اگر اہل داری | مکن از سرسری عمل داری
ہر کہ از یں غل گلوی خود رالبست | زان پس از مرگ ہم نخواہد دست

تاریخ اختتام آخری اشعار میں لکھی ہے :

سال تاریخش چو پرسد ہوشیار | گو ہزار و دو صد و چہل و چہار

"بیبوج نامہ" سکھوں کی حکومت پر تند و تلخ طنز ہے ۔ اس کے آغازی حصے سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے :-

"دریں ایام حسرت فرجام از چرخ چرخ ستمگر و سفلہ پرور در خطہ کشمیر جنت نظیر از تصرف خانخانان سموالمزمان و نواب عادل خاں بدر رفتہ و بر ملازمان راجہ راجگان سلطان شہر ناپرسان تارا چ سنگھ مسلم گردیدہ و حریص سنگھ کہ در رعیت پروری و عدالت گستری از بندگان عالی نامی بود و از ہمہ گرامی بجندراں صوبہ داری مشرف گشتہ از بسکہ شفقت رعایا و برایا رکوز خاطر عدالت ذخار بود ، ہنگام وداعش مواعیظ کافی و اندرزہای وافی مژدہ فرمودند کہ عدل و داد نہجی باید کرد کہ متوطنان خطہ راز حکایت و شکایت خاموش کنند و قصہ غصہ فراموش رسمی جدید پیش باید گرفت .....

اور یہ نہج ایسا ہو کہ :

ہر سال قطاع الطریق را اجازت دہند کہ بی محابا بکار خود مشغول شوند ..... بی مزاحمت قلبہ در برف پاشند باج از دہاقین در ایام بہار بگیرند ..... گیرندگان بیر شمشیر داد بار خان

بخشی فوج و شامت سنگھ چہرہ نویس سردار سنگھ

قابچی، چرگین داس آشپز .... رہزن باندی در

بان لفتری داس دفتری ......"

مقرر کیا جائے۔ اسی انداز سے آگے مختلف عہدوں کے نام گنائے

گئے ہیں۔

حمید اللہ کا ایک اور مستقل رسالہ "چائے نامہ" ہے

"چائے نامہ" میں نہ صرف چائے بلکہ اس کے سارے متعلقات مثلاً

برگ، چائے، چائے پز، پتیلی، چمچہ، جوشیدن چائے، شیر، مسکہ

سرپوش چائے، چائے دان، نقل چائے، یعنی نان و کلچہ، نوشیدن

چائے، غرض ہر ایک متعلقہ جز کی توصیف کی ہے۔ آخر میں "خلاصہ

مرام از تمہید ایں کلام" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

پدید آمدہ چای سبز و سیاہ   چو شد رنگ بیرنگ را جلوہ گاہ

یکی اسم ہادی و دیگر مضل   کدام آن دو قسم انداے اہل دل

بجوشید و کوشید کاتش بجنگ   ز نیرنگ ایں ہر دو چائے دو رنگ

ابوجہل زین پیش بت سرنگون   محمد بتاں را ازان سر شگون

آگے اپنے اگلے بیان کی صاحب دلانہ تشریح کرتے ہیں۔ اس کی تصنیف

کی تاریخ "باغ ارم" سے نکلتی ہے۔ سنہ کی مزید وضاحت آخری شعر میں

کر دی ہے

اگر صاف دی ریخ فواہی شنو و

ہزار و دو صد سال چہل و دو بود

حمید اللہ نے "رد شیعہ" کے نام سے بھی ایک نظم لکھی تھی۔

حمید اللہ کی نظم "شکرستان" ایک معنی میں سعدی کی بوستان کی پیروڈی ہے۔ اس کا انداز مزاحیہ ہے، اور جگہ جگہ حکایات بھی شامل کی گئی ہیں۔ ایک حکایت "جناب میاں کنگال" کی لکھی ہے۔ جس کے کچھ شعر ہیں سے

قطب ما و غوث ما ابدال ما | پیر پیر ما میاں کنگال ما
در رہی میرفت، ہچوں شیر مست | بے خبر از ہستِ خود مست الست
چند گام اندر رہش آمد بہ پیش | فربہ و رخت قوی چوں گاو میش

آگے کہتے ہیں کہ پیر کنگال نے گائے کو ذبح کیا اور سارے لوگوں نے عید منائی۔

ان کا انتقال ۱۸۴۸ء (م ۱۲۶۴ھ) میں ہوا۔ اپنے انتقال کی تاریخ خود انہوں نے کہی تھی:

عزیز آز من گرکسی پرسدت | بگویش بخلد بریں شد حمید

پنڈت کاشکاری لچھمن ۱۷۸۴ء میں سری نگر میں پیدا ہوئے تھے۔ حبہ کدل کے قریب ان کا خاندانی مکان تھا۔ چونسٹھ سال کی عمر پائی سنہ وفات ۱۸۴۸ء ہے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے "بہار گلشن کشمیر" میں ان کا صرف ایک شعر درج ہے، جو حسب ذیل ہے:۔

اے مصور چشم خشمش می کشی مستانہ کش
چوں بہ چشمش میرسی بگذار من خواہم کشید

شیخ طیب رفیقی جن کا انتقال ۱۲۲۶ء میں ہوا، صاحب کشف و کرامات تھے۔ ان کے والد شیخ احمد رفیقی بھی عالم اور باخدا بزرگ تھے۔ اپنے اسلاف کے حالات میں شیخ طیب رفیقی نے ایک کتاب "رفقاء الفقراء" کے نام سے لکھی تھی۔

شعر و ادب میں ملا عبید اللہ اور ان کے تلامذہ نے اس دور میں شعر و سخن

کی محفلیں گرم رکھی تھیں۔ ملا عبیداللہ مجموعۂ اضداد تھے۔ شاعری میں وہ اپنے عہد کے استاد مانے جاتے تھے۔ چنانچہ ان کے تلامذہ میں مصطفےٰ خان بختور، بابا محمد کاظم اور خاص طور میرزا مہدی مجرم بڑے مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اشتغال باطنی کا بھی چسکا تھا اور تجرید اور تدریس میں عمر گزار دی۔ حضرت شاہ منور حقانی کے یہاں رہتے تھے۔ غزل اور قصائد کے علاوہ ایک طویل نظم شمائل نبوی "بہار" لکھی تھی۔ قصائد سب منقبت میں ہیں۔ ان تمام اوصاف کے ساتھ وہ تنگ مزاج تھے اور اپنے شاگرد میرزا مہدی مجرم سے انہیں پرخاش پیدا ہو گئی تھی۔ ایک قصیدہ مجرم کی ہجو میں لکھا تھا جس کا مطلع اور ایک شعر درج ذیل ہے ؎

اے خوک پوک طینت دی مجرم دلوس | بوالقدر رغز اچہ دگردنگ، قربدوس
ای جامقول مردی دامنوں گرہ | زاغول ہند وکابل دتاتوا سندروس

یہ قصیدہ بلا کی طباعی، لفاظی اور زہر آلود خشمگینی کا نمونہ ہے۔ غزل وہ اچھی کہتے تھے چند شعر ذیل میں ہیں۔ ؎

کوہ کن کز عشق بازی ساختنی با خدہ ننگ | جاں بہ تلخی دادن، اندر ہجر شیرینش سزاست
خانۂ چشم عبید از اشک باری شد تباہ | آری آنکو خانہ بر دریا کند ایمنش سزاست

عبید کا انتقال ۱۸۵۲ء (م ۱۲۶۸ھ) میں ہوا۔

مصطفےٰ خان بختور عربی اور فارسی کے عالم تھے اور "کافیہ" کو عربی میں نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ ان کے قصیدے منقبت میں ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانی کی منقبت انہوں نے ابوالمعالی کی زمین میں لکھی تھی۔ اس کے چند شعر ہیں:

آں سرد جہم جلوہ چو در باغ طرب کرد | چوں ابر کرم خواہش گلگشت عرب کرد
این سرو چہ سر دلبست کہ از میوۂ رحمت | جاں بخشی بغداد و عراقین و عرب کرد

میرزا مہدی مجرم کشمیر کے اونچے پایہ کے شعرا میں سے تھے۔ اقبال نے

ان کی شاعری کو بعض حیثیتوں سے غنی کی شاعری پر ترجیح دی تھی۔ حالانکہ انھوں نے کئی موقعوں پر غنی کے اشعار کی تضمین کی ہے۔ رسمی اسالیب کے باوجود مجرم کے کلام میں بہت کچھ اپج نظر آتی ہے۔ وہ غزل اور رباعی خوب کہتے تھے ایک ضخیم دیوان ان کی یادگار ہے جو غزلیات اور مثنویات پر مشتمل ہے۔ ان کی غزل کے چند شعر حسب ذیل ہیں:

شمعم کہ بہر محفل می سوزم و میناز م ... نم از مژہ غم در دل انعوزم و انداز م
از نرگس فتانت مخمورم و مفتونم ... با جنبش بیجانت ہمروزم و ہمرازم

بیا کہ سوزدم از غم نفس نفس بہ نفس ... ز نالہ بستہ بنایم جرس جرس بہ جرس
سوارہ میرسی اے شہسوار می خواہم ... کہ ہم عنان تو تازم فرس فرس بہ فرس

چشمہ شاہی کے بارے میں جو نظم مجرم نے کہی تھی ذیل میں درج کی جاتی ہے:

چشم بد دور چشمہ ایست کہ ہست ... آب و تابش ز ماہ تا ماہی!
بر سبیلش نہادہ سر تسلیم! ... سلسبیلش نمودہ ہمراہی
بود خاکش بسر ز حسرت شاہ ... آبش افزودہ شیخ جہاہی
بیش ازیں کلک در فشان کلیم ... تر زبان شد کہ کوثر شاہی!
سال تاریخ حال چشمہ شیخ: ... گفت مجرم زروز آگاہی!

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے موقع پر مجرم نے جو مرثیہ کہا تھا، ذیل میں درج ہے:

دریغا کہ کاوس فیروز بخت ... کشید از سر تخت بر تختہ رخت
سر سرداران شاہ رنجیت سنگھ ... نزیں لبدت بر لپشت ایں بزخنگ
نظر بر غریبان و محتاج کرد ... بیک لحظہ صد گنج تاراج کرد

مجرم نے طویل عمر پائی تھی، جس کا اشارہ ان کی ایک مناجات کے درج ذیل شعر

سے ملتا ہے: ؎

بہ فکر شعر مویم شد سفید اے خاک بر رویم
ازیں گِل پاک کن سرچشمہ طبع روانم را!

مجرم کا انتقال ۱۲۵۳ھ (م ۱۸۵۶ء) میں ہوا۔

مجرم کے ایک ہم عصر بابا محمد کاظم تھے۔ وہ عالم باعمل تھے۔ اور مسجد صفا پورہ میں امامت کرتے تھے۔ فارسی اور کشمیری دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ہجو اور ہزل گوئی کی طرف کاظم کی طبیعت زیادہ مایل تھی۔ پیر غلام حسن کھویہامی کا کہنا ہے کہ کوئی بات وہ بغیر ہزلیہ انداز کے نہیں کہتے تھے۔ میرزا مہدی مجرم سے اُن کی چشمک تھی چنانچہ مجرم کی ہجو میں انہوں نے بہت سے شعر کہے تھے۔

کاظم کا انتقال ۱۸۹۶ء (م ۱۲۸۶ھ) میں ہوا۔

اشرف نغز گفتار شاعر تھا۔ غزل قصیدہ، مثنوی ساری اصناف میں اس کا کلام ملتا ہے۔ اس نے دیوان بھی مرتب کیا تھا جس کا ایک مخطوط ریسرچ لائبریری سرینگر میں محفوظ ہے وہ ایرانی تھا اور ہندوستان آگیا تھا جس کا اشارہ اس کے ذیل کے شعر سے ملتا ہے۔ ؎

مرا خود پائے رفتن نیست از ایران مگر اشرف
برد ہیچو حنایم جانب ہندوستان دستی

ہندوستان سے غالباً وہ کشمیر بھی آیا تھا۔

مراد بیگ ماہر خوشنویس تھے۔ انہوں نے خط ثلث کے بارے میں ایک رسالہ تالیف کیا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط ثلث میں انہیں بڑی مہارت تھی۔ رسالہ کی تصنیف کے بارے میں آغاز میں لکھتے ہیں:

"اما بعد چنیں گوید مولف ایں ترتیب و مرتب ایں تالیف الملتجی لجناب

الملک الاحد المعبود مراد بیگ بن عارف بیگ بن موسے بیگ کہ اصل و نسب ایشاں از بخارا است بنا بر اشارہ دوستان خصوصی مولانا و مشفقنا مولوی حاجی محمد عرف دار غفراللہ کہ بسے فاضل عامل و سالک کامل بود و فیض علم ایشاں جاری بود...... اشارہ ایشاں بر بندہ فرض عین شدہ کہ بزبان دُربیان فرمودند کہ تصنیف رسالہ خط و نسخ از ضروریات است۔"

اسی کے اتباع میں یہ رسالہ تصنیف کیا ہے۔ اور حروف کے نمونے اور ان کے ناپ بھی طالبان فن کے لئے دئے ہیں۔

روپ بھوانی، جو روپ بوانی کے نام سے بھی مشہور تھیں، کشمیر کی عارفہ خواتین میں اونچا مقام رکھتی ہیں وہ فارسی نثر اور نظم دونوں خوب لکھتی تھیں۔ شاعری میں الگ تخلص اختیار کیا تھا روپ بھوانی یا روپہ بھوانی کی تربیت ان کے والد نے کی تھی۔ جو خود بھی ایک عارف تھے اور عربی اور فارسی میں دستگاہ رکھتے تھے، روپہ بھوانی کے بھائی بالہ پنڈت در کو اپنی بہن سے گہری عقیدت تھی۔ چنانچہ بھائی جب ہندوستان گئے ہوئے تھے، انہوں نے بہن کو ایک منظوم خط لکھا تھا اسے عرضداشت سے موسوم کیا ہے خط کا عنوان ہے!

" عرضداشت منظوم مِن کلام بالہ پنڈت در مرید صادق (برادر حقیقی) شری روپہ بھوانی صاحبہ کہ در ہندوستان رفتہ بود از انجا نوشتہ فرستادہ است۔"

خط کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

عرض حال سرگذشتم بشنوید	لا علاجم چارہ سازمن شوید
بودم از غفلت در ایام شباب	روز و شب مشغول ذکر خورد و خواب

پھر لکھا ہے کہ میں عرصہ تک تمہارے الطاف کا مورد رہا لیکن میں نے ان الطاف کی قدر نہیں پہچانی تھی، تقدیر نے مجھے تم سے دُور کیا۔ جب غفلت سے جاگا تو منزلِ مقصود کی طرف بڑھنا چاہا۔ لیکن ایک سگ خوں خوار رہزنی کر رہا ہے۔ پھر ایک قلعہ سے قطاع الطریق پہلوان اہرمنوں کی طرح مجھے راہ راست سے گمراہ کر رہے ہیں۔ اس لئے رہبری کی درخواست کی ہے :۔

زانکہ از دل بندہ آں در گہم ۔۔۔ جذبہ فرمای اے خضر رہم!

شری روپہ بھوانی نے اس کے جواب میں لکھا تھا :۔ ؎

دل پسندم فضل حق یار و تو باد ۔۔۔ در حریم خاص دل بار تو باد)

گوش کردم جملہ شرحِ قاصدات ۔۔۔ .. ..

گر بصورت دوری از ہجرم منال ۔۔۔ ایک در معنی بمن داری وصال

ہیچ دُوری نیست از ما نا بہ تو ۔۔۔ درمیاں گر ہست منزل ہا بہ تو

نورہ من بنگر ہر جا جلوہ گر ۔۔۔ عام در حیوان و خاصہ در بشر

آگے بڑی شستہ زبان اور بلیغ انداز میں نکات معرفت لکھے ہیں۔ اس شعر پر نامہ ختم ہوتا ہے : ؎

صد دعا با دا بر احوالت شمول ۔۔۔ زانکہ می باشد دعائے او قبول

شیخ احمد تارہ بلی محمد نعیم کے فرزند اپنے زمانے میں علم و فضل اور ارشاد و ہدایت کا مرکز رہے عربی اور فارسی کے سربرآوردہ علما میں ان کا شمار ہوتا تھا مذہبی علوم میں بھی انہیں اچھی دستگاہ تھی۔ قرات میں شیخ عبادی کے شاگرد تھے۔ سلوک اور عرفان کے مراحل سے بھی باخبر تھے۔ شیخ اکبر کے انتقال کے بعد اُن کے معتقدین، اور خاص طور پر خواجہ امیرالدین پکھلی وال کے اصرار پر، ان کی جانشینی منظور کی اور عوام کی ذہنی اور روحانی تربیت میں مصروف رہے۔ کشمیر کا ناظم شیخ غلام محی الدین

۱۲۵۷ھ، ۱۲۶۳ھ) اُن کا بڑا معتقد تھا۔

شیخ تارہ بلی مصنف اور شاعر تھے۔ ان کی تصنیف "افضل الطریق واشرف الطریق" بابا محمد اشرف کے حالات پر مشتمل رسالہ ہے۔ شیخ مقفی اور رنگین نثر اچھی لکھتے تھے۔ "افضل الطریق" میں مشایخ کرام دراصل معتقدات قلبی وفروغ معاملات کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" بدنی مالی و جانی تابع علم و علماء عظام اہل سنت وجماعت اند کرشہم اللہ وکرہم عبادت اللہ ومجاہدہ فی سبیل اللہ را بنا بران داشتہ بریکی را روشنی ہست معہود وطریقی است محمود۔"

شیخ احمد تارہ بلی کا انتقال ۱۲۷۸ میں ہوا۔ شیخ احمد تارہ بلی نے خواجہ محمد اسحاق کی "تحفۃ القراء" کے ملحقات لکھے تھے۔ اصل کتاب کے مطالب میں اضافے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بروی افزودم مضامین نکو مستفاد از قاریان نیک خو

اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس رسالہ کی تکمیل کے بعد اسے اپنے پیر نور الدین محمد خانیاری کی خدمت میں پیش کیا تھا:

چوں قبول مولوی نور آمد آں زماں ملحقش با تحفہ کردم اے جوان

شیخ احمد کے بھائی شیخ محمد تارہ بلی بھی عربی اور فارسی کے عالم اور مصنف تھے۔ انہوں نے قصیدہ بردہ کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ ان کا ایک اور رسالہ قصیدہ "بانت سعاد" کے منظوم ترجمہ پر مشتمل ہے۔ قصیدہ بردہ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

کرد جرأت اسیر نفس ذمیم غرق عصیاں محمد ابن نعیم
تا بشرح قصیدۂ بردہ خویش را درمیانہ آوردہ
گرچہ منظوم کرد مفہومش ہیچ خبرے نبود معلومش
عمر خود صرف در بطالت کرد ایں قدر نیز از جہالت کرد

اوّل از فکرت دقیق و متین | شرحِ ملا علی قاری بین
معنی و مدّعا ازیں بردار | بعد ازاں سوے ایں نظر بگمار

تاریخ تصنیف ان اشعار میں بیان کی ہے۔

حرفِ پایش رسید تا العین | ختم تاریخ کردم بردِ الغین
مصرعہ اوّل از قصیدہ شمار | نصف تاریخ گیر و کسر گذار

شیخ محمد کا انتقال ۱۲۸۰ھ میں ہوا۔

خواجہ امیرالدین پکھلی وال۔ شیخ احمد تارہ بلی کے مرید تھے اور اپنے زمانے کے اکابر صوفیا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

انھوں نے مثنوی تحفۂ محمدی اپنے معتقد میرزا حاجی محمد خان میر منشی محکمہ ایجنسی راجستھان کی فرمائش پر ۱۲۶۳ء میں لکھی تھی۔ اس کا تذکرہ دیباچہ میں کیا ہے جو نثر میں ہے۔

حمد، نعت اور منقبت کے بعد اپنے فرزند صدرالدین احمد کو نصیحت کرتے ہیں۔ ؎

قرۃ العین من ای احمد بہوش | سوی پند من زمانے دار گوش

صدرالدین احمد اس وقت سات مہینے کے تھے۔ ان کے لئے خواجہ نے دین و ایمان کے ساتھ زندگی کا ایک دستور العمل دیا ہے۔ حضرت ابوالحسن خرقانی اور شیخ ابوبکر مجدلانی کے فرمودات سے اس مثنوی کا آغاز ہوتا ہے۔

مثنوی کے اختتام پر مرشد کی لکھی ہوئی تاریخ درج کی ہے۔

محمد صادق کی "مناقب غوثیہ" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب نثر میں ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:-

" اما بعد مے گوید بندۂ ضعیف گنہ گار محتاج رحمت پروردگار فقیر

محمد صادق شہابی سعدی قادری کان اللہ لہ، کما کان المشائخہ کہ حضرت سلطان الاولیا غوث اعظم رضی اللہ عنہ بر قدم جد اعلائے خود صلی اللہ علیہ وسلم بود ......"

آنند رام بیخود۔ شعر کا بڑا شستہ مذاق رکھتے تھے۔ اور شاعری کے آداب سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کے کچھ اشعار ذیل میں درج ہیں: ۔

سبک کن، پارہ عمامہ از بہر خدا واعظ　　چرا باید بمسجد اینقدر با سر گراں رفتن

چہ خوش بزمے کہ باشد جلوہ گر آں رشک ماہ آنجا
نزاود آفتاب از سایہ برق نگاہ آنجا
چو در محشر کند یاری نگاہ سرمہ آلودش
لب خاموش چوں تصویر گردد داد خواہ آنجا
خرابا تست و ہستی حلقہ بیرون در باشد
ز خود فارغ شوی، بیخود اگر آری پناہ آنجا

میر سید حسین قادری منطقی نے ۱۲۸۰ھ میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے حالات، آپ کی اولاد اور آپ کے مریدوں اور اس سلسلے کے ان بزرگوں کا بھی تذکرہ لکھا ہے، جو کشمیر آئے تھے۔ کتاب کی تصنیف اور سنہ کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

" چوں از مدت مدید و عہد بعید مطمح نظر داشت کہ تذکرہ حضرات قادریہ را در معرض املا آورد و تالیف سازد ..... دریں کتاب تیمناً و تبرکاً بطریق ایجاز و اختصار در سنہ یک ہزار دو صد و ہشتاد آوردہ شد۔"

۱۱
ڈوگرا عہد

۱۸۴۳ء تا ۱۹۴۶ء
۱۲۶۳ ۱۳۶۵

انیسویں صدی کے وسط سے کشمیر پر ڈوگروں کا عمل دخل شروع ہوا۔ اس عہد کے آغاز کے طور پر مہاراجہ رنبیر سنگھ کی حکومت کے دوران کشمیر میں کچھ نئی تہذیبی روایات جاری ہوئیں۔ انگریزی تعلیم و تدریس بھی شروع ہوئی، اور نئے مدرسے قائم ہوئے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کو سنسکرت زبان کی خدمت کا بہت شوق تھا، اسی کی پیش رفت میں جموں میں رگھوناتھ مندر کے احاطے میں سنسکرت کی تعلیم کے لئے ایک پاٹ شالہ قایم کیا تھا۔ اور ایک وسیع سنسکرت کتب خانہ بھی اس سے ملحق تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جو دارالترجمہ قایم کیا تھا اس میں فارسی اور عربی کتابوں کے ترجمے بعض وقت سنسکرت میں بھی کروائے جاتے تھے اُردو بھی ریاست میں عام طور پر رائج ہوگئی تھی۔ اس لئے کئی کتابوں کے ترجمے اُردو میں بھی کروائے گئے۔ کچھ ڈوگری اور پنجابی میں بھی ترجمے ہوئے۔ ترجمے زیادہ تر سائنس اور طب کی کتابوں کے ہوئے۔ کچھ ترجمے فلسفہ اور تاریخ کے بھی ہوئے لیکن جہاں تک ادبی اور دفتری زبان کا تعلق ہے۔ فارسی ہی جاری رہی۔ اس وقت تک کئی

پنڈتوں نے فارسی میں اچھی مہارت حاصل کرلی تھی۔ اس کا سلسلہ افغانوں کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔ اور ڈوگرا عہد میں کئی پنڈت ایسے ہوئے جو شعر و ادب میں اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں پنڈت ٹھاکر داس راز دان فارسی کے عالم تھے اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ وہ نامی تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے گنیش پنڈت کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا تھا۔ گنیش پنڈت کشمیر کے رئیسوں میں سے تھے اور سکھوں کے زمانہ میں مستاجری کرتے تھے۔ اپنے اثر اور اقتدار کی وجہ سے انہوں نے سکھوں کے دورِ حکومت میں، کشمیر کی سیاست میں بہت کچھ دخل در معقول کی تھی۔ قصیدے کے کچھ شعر ہیں۔

اے نشان عزت و شان دلنشین از شان تو	دولت و اقبال از صد پشت پشتیبان تو
در سر نامی کجا باشد ہوائے دیگری	چوں بسر داری ہوا لیش از ہوا خواہان تو
تا نہال سبز گلشن ہست جائے نرگساں	باد رشک جنت الماوی گل بستانِ تو

پنڈت راج کاک در فرخ مشہور پنڈت بیربل در کے فرزند تھے جنہیں باپ نے سکھوں کو کشمیر پر فوج کشی پر آمادہ کرنے کے لئے رنجیت سنگھ کے دربار میں یرغمال رکھا تھا۔ وہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے پیشکار رہے تھے اور کچھ عرصہ دوسرے عہدوں پر بھی رہے۔ شعر کا مذاق بہت اچھا تھا۔ اور بذلہ سنجی اور بدیہہ گوئی میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے چند شعر یہاں منقول ہیں۔

گر نرگسش نگر و فسوں ہائے سامری	در چشم ما کہ بست بگوئید خواب را
فرخ حیات نقش بر آب است چشم وا	بیشی کشا بہ عبرت و بنگر حباب را

فرخ صاحب دیوان ہیں۔ فرخ کا انتقال ۱۸۶۶ء میں ہوا۔

شیخ نور الدین رفیقی کشمیری ۱۸۱۰ء (م ۱۲۲۵ھ) میں پیدا ہوئے تھے مولوی محمد محسن سے علوم کا اکتساب کیا تھا اور علوم روحانی میں اپنے چچا زاد بھائی شیخ حبیب بن احمد بن مصطفےٰ سے مستفید تھے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ موزوں طبع تھے اور مرغوب

اشعار ان سے یادگار ہیں لیکن اب یہ اشعار دستیاب نہیں ہوتے۔

پنڈت ست رام بقایا۔ بقا تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد پنڈت کیشو جیو کشمیر کے بڑے تاجروں میں سے تھے اور پڑوس کے ملکوں افغانستان، تاشقند وغیرہ سے ان کی تجارت تھی۔ شاہ شجاع الملک کے عہد میں ان کے تجارت کا مال قزاقوں نے لوٹ لیا جس کے صدمہ سے وہ زہر کھا کر جاں بحق ہو گئے۔

بقا سنہ [illegible] میں پیدا ہوئے تھے۔ محلہ کھنہ کدل، سرینگر میں ان کے خاندان کی رہائش تھی فارسی اور عربی میں اچھی استعداد حاصل تھی۔ وہ محکمہ کے داغ شال میں ملازم تھے کچھ عرصہ شیخ غلام محی الدین کرنیل میاں سنگھ اور دیوان کرپا رام کے یہاں حضور نویس اور فارن سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ان خدمات کے ساتھ شعر و سخن کی محفلوں میں شریک رہا کرتے ایک دفعہ صائب کے حسب ذیل شعر پر گرھیں لگائی جا رہی تھی۔

بہ چین دو خط بیک طرف آں مو بیک طرف　　کاکلہا تمام یک طرف آں رو بیک طرف

اس محفل میں پنڈت راجا کول ویدی بھی موجود تھے۔ انہوں نے اور پنڈت [illegible] در فرخ نے مصرع پر گرھیں لگائیں۔ بقا نے اسی زمین میں ذیل کا شعر کہا تھا۔

تا پردہ برفتاد ازاں رو بیک طرف　　ہوشم بر [illegible] جادو بیک طرف

یہ شعر ویدی اور فرخ کے اشعار گرہوں سے بہت بلند پایہ ہے۔

"بہار گلشن کشمیر" کے مرتبین نے لکھا ہے کہ ان کا ایک دیوان تھا لیکن اب دستیاب نہیں ہوتا۔ شعر کے علاوہ وہ فارسی نثر بھی لکھتے تھے انہوں نے "دستور العمل" کے نام ایک مقفیٰ اور مسجع نثر سنہ نثر ظہوری کے انداز پر مکمل تھی۔ ان کے منظوم کارناموں میں صورت نامہ اور ایک بحر طویل میں لکھی ہوئی نظم شامل ہیں ان کے غزل کے دو شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

قسم بجان تو بیمارم و نخواہد زیست　　طبیب آمد و نبض مرا گرفت و گذاشت
ز خط تسکین دل افزود خال عنبر افشانش　　فرح بخش دل ما شد ز ریحان تخم ریحانش

مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں مرزا سیف الدین کشمیر میں وقایع نگاری کی خدمت پر مامور تھے وہ اچھے انشاء پرداز تھے اور ان کے خاندان میں فارسی کے کئی اچھے شاعر اور انشاء پرداز پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا احد انگریزی حکومت کے جانب سے کشمیر میں وقایع نگار رہے تھے۔

مرزا احد کے مورث اعلیٰ مرزا قاسم بیگ، ترکستان کے امرا میں سے تھے۔ اور شاہ جہاں کے عہد میں وہ ہندوستان آئے تھے۔ شاہ جہاں کے دربار میں انہیں رسوخ حاصل ہوا اور منصب اور توقیر سے سرفراز ہوئے تھے ان کے بیٹے عنایت اللہ بیگ اورنگ زیب کے دربار میں اعزاز رکھتے تھے چنانچہ ۱۰۷۵ھ میں جب اورنگ زیب کشمیر آئے تو میرزا عنایت اللہ بیگ ان کے ساتھ تھے۔ کشمیر کی فضا اور آب و ہوا سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ یہیں بود و باش اختیار کرلی۔ میرزا احد انہیں کے پوتے تھے۔ یہ فارسی ادب اور انشاء کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اور سکھوں کی حکمرانی کے آخری زمانے میں وہ کشمیر کے وقایع نگار مقرر ہو ... تھے۔

میرزا احد کی اولاد میں کشمیر کی وقائع نگاری کی خدمت کئی پشتوں تک رہی۔ ان کے پانچ فرزندوں، میرزا سیف الدین، میرزا غلام محی الدین، میرزا عزیز الدین، میرزا قمر الدین اور میرزا بدر الدین میں سے تین، یعنی میرزا سیف الدین میرزا غلام محی الدین اور میرزا قمر الدین یکے بعد دیگرے وقائع نگاری کی خدمت پر مامور رہے۔ میرزا احد کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند میرزا سیف الدین کے ذمہ یہ خدمت ہوئی۔ اسی زمانے میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کی حکومت حاصل کی تھی۔ میرزا سیف الدین ذہین اور طباع النسان تھے۔ فارسی میں انشاء پردازی کی مہارت کے علاوہ وہ اچھے خوشنویس بھی تھے۔ اُن کا اثر اور رسوخ انگریزوں کے پاس اور مہاراجہ کے دربار میں دونوں جگہ خاصا تھا۔ اور اس اثر اور رسوخ سے کام لے کر انہوں نے مہاراجہ گلاب سنگھ اور انگریزی حکومت

کے تعلقات میں استواری اور خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انگریز عہدہ داروں اور یورپی سیاحوں سے بھی اُن کے اچھے مراسم رہتے تھے۔ بیرن ہیوگل نے اپنے سفر نامے میں ان کی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔

میرزا سیف الدین نے بہ حیثیت اخبار نویس کے ۱۸۴۶ء سے ۱۸۶۸ء تک کی جو روداد یں لکھی تھیں، وہ مرتب صورت میں محکمہ ریسرچ میں محفوظ ہیں۔ یہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد حکومت کے سیاسی اور سماجی حالات کی اہم دستاویزات ہیں۔ ان کا ایک مستقل کارنامہ ان کی تاریخ کشمیر ہے۔ جو انہوں نے میجر جان بجر کی فرمائش پر ۱۸۵۹ء میں لکھی تھی۔ یہ تاریخ "خلاصۃ التواریخ" کے نام سے موسوم ہے، اور کشمیر کی تواریخ میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ اپنے پیش رو مورخین کے مقابلے میں میرزا سیف الدین نے سلیس اور سادہ اسلوب میں یہ تاریخ لکھی ہے۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ انہوں نے دور از قیاس روایات اور لطایف سے قطع نظر کرکے حتی الامکان صحیح واقعات بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیباچہ میں انہوں نے اپنے پیش رو مورخین اور ان کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے اور سبب تالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایں مختصر ایست دربیان حالات کشمیر جنت نظیر صانہا اللہ عن الافات والبلیات کہ بندہ کمترین میرزا سیف الدین در ۱۲۷۶ھ یکہزار دوصد و ہفتاد و شش ہجری بہ حسب فرمان واجب الاذعان صاحب عالی شان میجر جان بجر صاحب بہادر ..... بعد تحقیق و تبحر از کتب شاستری یعنی راجہ ترنگنی ہائی پنڈت کلہن و زونہ راجہ پنڈت و شیرور پنڈت کہ بزبان سنسکرت حالات راجہای سلف تا عہد اکبر شاہ در قید تحریر آوردہ اند ....."

اس کے بعد فارسی تاریخوں میں ملک حیدر چاڈورہ کی تاریخ، محمد اعظم دیدہ مری کی "واقعات کشمیر" نارائن کول عاجز کی تاریخ، میر سعد اللہ شاہ آبادی کی تواریخ اور پنڈت بیربل کاچرو کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اینہا زیادہ بر احوالات راجہ ہا و احوال ظہور اسلام و سلاطین
اسلام منتظم پاں نمودہ اند بیشتر وگرفتہ اگرچہ در بعضی تواریخ بین
مصنفان در خصوص نام و زمان بعض حکام اختلافی نمایاں
است، اما حتی الامکان تحقیق نمودہ انچہ اصح و انسب است
بقید قلم آوردہ مسمی بخلاصۃ التواریخ کشمیر نمود...."

ابتدا میں لکھتے ہیں کہ بعض اہل تنجیم کشمیر کو اقلیم خراسان میں شامل کرتے ہیں اور بعضوں نے اسے بلاد ہند میں شمار کیا ہے۔ اصل تاریخ ستی سر اور زلدیو (جلدجو) کی روایت سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اختتام ۱۸۵۹ء کے واقعات پر ہوتا ہے۔

میرزا سیف الدین کے بعد ان کے بھائی میرزا غلام محی الدین کشمیر کے اخبار نویس اور وقایع نگار مقرر ہوئے۔ ان کے لکھے ہوئے اخبار اور مراسلات جو ۱۸۵۱ء سے متعلق ہیں محکمہ ریسرچ سرینگر میں موجود ہیں۔ میرزا محی الدین کے بعد میرزا قمر الدین کے ذمہ یہ خدمت ہوئی اور انھوں نے ۱۸۵۶ء تک کے اخبارات اور مراسلات مرتب کئے۔ یہ سارے اہم دستاویزات محکمہ تحقیق سرینگر میں محفوظ ہیں۔

پنڈت گوپال کول، گوپال اور غیوری دونوں تخلص کرتے تھے سرینگر میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں پیدا ہوئے تھے۔ فارسی اور سنسکرت کی تعلیم پائی تھی۔ ملازمت کشمیر ہی میں کی۔ اور ترقی کرتے کرتے صدر دفتر حساب ہو گئے تھے

RekhtaDownload.com

اسی لئے ان کا خاندان "دفتری" کے لقب سے بھی مشہور ہو گیا تھا۔ غیوری کو شعر و سخن سے گہری وابستگی تھی۔ فارسی کے مروجہ اصناف سخن میں شعر کہتے تھے طبیعت مذہب اور تصوف کی طرف زیادہ مائل تھی چنانچہ بھاگوت کے دشم اسکندھ کا انہوں نے منظوم فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ مثنوی میں جگہ جگہ غزلیں بھی آجاتی ہیں اور یہ غزلیں بھی سری کرشن جی کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

بھاگوت کے دشم اسکندھ کا یہ ترجمہ ایک طویل مثنوی کی شکل میں ہے۔ جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

ای حضرت مہیمن کو کہ بے حد بستہ ہر کار
از مکار مہرہ کنند بہر کار!

اوں اوپنبت کنندش کن یاد
بر بھاگوتش و بہیشش کن یاد

گوپال نے اس طویل مثنوی کا معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں ایک طویل مناجات ہے جس میں سری کرشن مہاراج کے بارے میں کہتے ہیں!

وصل تو بہر دو جہان جانم
مجبور از آن سرو جانا کی!

ای سری کرشن از تیہ برو بینہ
گوپال بود مجبور تا کی!

مناجات میں اہل کشمیر کی حالت کا ذکر کرکے سری کرشن جی سے ان کی حالت کی بہتری کے لئے دعا کرتے ہیں۔

لیکہ ایں ہمہ مردمانِ کشمیر
گزشت زمانہ اند دل گیر

کشمیر اگرچہ دل پذیر است
بی شبہ بہشت بے نظیر است

خلق ما غنچہ ساں درایں خاک
خنداں نہ و بینند باد دل چاک

اوہا ہمہ شاں شگفتہ چوں گل
دلہا آشفتہ ہم چو سنبل

چوں روی دل از ہمہ بتابند
از بند جہاں خلاص یابند

ترجمہ ۱۸۹۷ بکرمی (م ۱۸۴۰ء) میں تکمیل کو پہنچا۔

پنڈت گوپال گوپال کے فرزند پنڈت ہرہ کول بھی اپنے زمانے کے اچھے سخنور تھے۔ وہ حضوری تخلص کرتے تھے ان کی ولادت ۱۸۲۲ء میں ہوئی تھی اور محکمہ فوج میں سر دفتر حسابات کی خدمت پر مامور تھے۔ لیکن صرف ۲۶ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے چند شعر ذیل میں منقول ہیں:

سینہ از داغ تو گلشن شدہ است — ماہ من بہ چشم تماشا بکشا
ساقیا جام زمے کن لبریز — گرہ از شیشہ و مینا بکشا
تا شود جان حضوری آزاد — گرہ از زلف چلیپا بکشا

گلاب سنگھ کے آخری زمانے میں ہشیار تخلص ایک مزاح نگار اور ہجو گو شاعر تھا۔ اس نے ایک دیوان چھوڑا ہے۔ جو غزلیات اور قطعات پر مشتمل ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے انتقال پر اس نے ایک طویل نظم لکھی تھی جس میں ان کے حرص و آز کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس نظم کے چند شعر یہ ہیں:

ہزار و ہشت صد و چار و دہ است سموت — کہ گم از جہان شد و آمد ایام امن و اماں
رقم شد ایں غزل از نطق پیر سال بزرگ — بہ از جوان کہ ز ہشیار مستمند زماں
نماند رائے گلاب از جہاں بہ حلت شد — بماند گنج و زر و سیم و تخت بہ دلداں

ایک اور نظم میں بھی گلاب سنگھ کے ظلم اور ان کی طمع کی مذمت کی ہے کہتے ہیں:

نام او بد گلاب بیر نگش — یعنی آن مائی ماکرو تزویر
صاحب ظلم و حاکم طامع — جز بخاکش نگشتہ چشمش سیر

ہشیار نے کشمیر کے بارے میں بھی ایک نظم لکھی ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:

در گلشن کشمیر دلا طائر قدسی — پابند ہوا گشتہ و در دیرہ قفا را

دیوان کرپا رام کی مدح میں ایک قصیدہ ملتا ہے جس کا مطلع حسب ذیل ہے:

افسر دیوانیاں دیوان کرپا رام است و بس — پور دیوان کلاں جوالا سہا نام است و بس

مہاراجہ رنبیر کے عہد میں علم و ادب کو فروغ حاصل ہونے لگا تھا۔ وہ خود زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے، لیکن جیسا کہ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے لکھا ہے، انھیں اکبر کی طرح اپنے اطراف مختلف مذہبوں اور نقطۂ خیال کے علماء کو جمع کرنے کا شوق تھا۔ اکبر کے دربار کی طرح یہ ان کے دربار کے نورتن کہلاتے تھے۔ یہ نورتن اکبر کے دربار کے نورتن کی طرح کی چمک دمک نہیں رکھتے تھے۔ پھر بھی مہاراجہ کے اس شوق نے لوگوں میں علم و ادب کی خدمت کے ذوق کو ابھارا تھا۔ ان کے دربار میں دیوان کرپارام، پنڈت گنیش کول شاستری، ڈاکٹر بخشی رام، ڈاکٹر صبح مل، مولوی غلام حسین طالب لکھنوی، مولوی عبداللہ مجتہد العصر، حکیم ولی اللہ شاہ لاہوری، پنڈت صاحب رام، حکیم نورالدین قادیانی اور بابا نصراللہ عیسائی، اہم مقام رکھتے تھے۔ ان میں پنڈت، مولوی، قادیانی اور عیسائی سب ہی شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رنبیر سنگھ کی توجہ تمام تر سنسکرت علوم کو فروغ دینے پر مرکوز رہی، جس کے لئے انہوں نے رگھوناتھ مندر جموں کے احاطے میں ایک سنسکرت پاٹ شالہ اور سنسکرت کتابوں اور مخطوطات کا ایک وسیع کتب خانہ بھی قائم کیا تھا۔ لیکن فارسی پڑھے لکھے لوگوں کی زبان اور علمی ادبی اور سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے اسے بھی نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے فارسی اور عربی کتابوں کو سنسکرت میں ترجمہ کرانے کے لئے "دارالترجمہ" قائم کیا تھا۔ اس میں فارسی کی کچھ کتابوں کے اردو یا دوسری جدید زبانوں میں ترجمے ہوئے تھے۔ خاص طور پر طب کی کئی فارسی کتابوں سے اردو میں تراجم ہوئے۔ سنسکرت مذہبی کتابیں جیسے، مہابھارت، گیتا اور اپنشد کے ترجمے فارسی میں بھی کرائے گئے تھے۔

جہاں تک فارسی میں تصنیف و تالیف کا تعلق ہے، دیوان کرپا رام کا نام سب سے پیش پیش ہے۔ انہیں فارسی کا ذوق تھا، اور جدید ست پسند کلام صحیح لگا ... دل کی طرح فارسی عبارتیں لکھنے کی کوشش کرتے تھے فارسی میں انکی ایک تاریخ

تصانیف میں۔ (۱) گلزار کشمیر جو کشمیر کی فارسی تاریخ ہے۔ (۲) گلاب نامہ: جو مہاراجہ گلاب سنگھ کی سوانح حیات پر مشتمل ہے (۳) ردِّ اسلام جس میں اسلام کے عقائد اور عمل کی سخت مخالفت کی ہے۔ (۴) "تحقیق تناسخ" اور (۵) "ہدیۃ التحقیق"۔

کرپا رام کی عبارت آرائی کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکے گا۔ جو "گلاب نامہ" سے ماخوذ ہے۔ کرپا رام نے اس کے اسلوب میں ابوالفضل کے "اکبر نامہ" کا تتبع کیا ہے آغاز حمد سے کرتے ہیں۔

"گلاب افشانی سخن عطرہ عنبر بیزی کلام شاہوار بارگاہ سلطان السلاطین سزاست کہ خطیب ازل خطبہ ابدی بنام نامی حضرت جل جلالہٗ بر کرسی آسمان خواندہ و گنجور قدر نقود ثوابت فداول را بر ذرہ آستاں جناب عم نوالہ افشاندہ فلک اطلس فرش ایوان مقدس اوست و ہفت فلک پایہ سلّم بالاخانہ لقدس او فیاضی کہ از نجامہ خانہ فیض عامش جہاں نابود درخت وجود دربر کشیدہ۔"

"گلاب نامہ" بڑے اہتمام سے ۱۹۲۲ء بکرمی (م ۱۸۶۵ء) میں سرکاری مطبع شری رنبیر پرکاش جموں سے شائع ہوا تھا۔ اس کے آغاز میں سید باقر حسین کی طویل تقریظ اور سید اسمٰعیل منیر اور کئی اور مشاہیر اساتذہ اردو کی تاریخیں شامل ہیں۔ اصل کتاب "بیان دلیلی چند بر حدوث عالم و اثبات صانع جلت عظمتہٗ بطرز فلاسفر یونان و حکمت پژوہان ہندوستان ..." کے عنوان سے شروع ہوتی ہے۔

کرپا رام کی "گلزار کشمیر" میں بھی کشمیر کی دوسری فارسی تاریخوں کی طرح ابتدا سے لے کر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد تک کے واقعات لکھے گئے ہیں۔ اس تصنیف کے محرک مسٹر ڈابرٹس ہوئے تھے، جو پنجاب کے جوڈیشل کمشنر تھے۔ یہ تاریخ ۱۸۷۰ء میں چھپی ہے۔

دیوان کرپا رام کا انتقال ۱۸۷۶ء میں ہوا۔

شری مہا بھاگوت کا ایک فارسی ترجمہ جو بارہ اسکندھ پر مشتمل ہے ۱۹۲۵ء بکرمی (م ۱۸۶۸ء) میں غالباً نراین جو نے کیا تھا۔ ترقیمہ سے جو حسب ذیل ہے، کسی نے مصنف کا نام مٹا دیا ہے:

مرقوم بتاریخ ۲۴ ماہ ساون ۱۹۲۵ء (بکرمی) از سردست حقیرنا.....

بااتمام تحریر یافت"

لیکن اس سے پہلے کے حسب ذیل اشعار میں بھی نراین جو نام آتا ہے۔ اشعار ہیں:

جمادی، چند دادم جاں خریدم ۔۔۔ بحمد اللہ بسی ارزاں خریدم

ز انوارش دل شب گشتہ روشن ۔۔۔ سعید ساعتاں گر دید روہن

زحمل دیدگی ماناست ایں پرشن ۔۔۔ نراین جیو کرد اوتار......

مہابھارت کے نثر پریب کے فارسی ترجمے کا ایک مخطوطہ کلچرل اکادمی کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اس کا آخری حصہ ناقص ہے۔ مترجم اور زمانے کا پتہ نہیں چلتا، لیکن کاغذ اور رسالے کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ بھی مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دارالترجمہ میں ہوا تھا۔ ترجمہ رنگین تصاویر سے بھی مزین ہے۔ ابتدائی حصے سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"چو کرن دو روز جنگ کرد، دکشتہ شد روز ہفدہم از جملہ ہژدہ روز مہابھارت تمام گشت ۔"

پنڈت دامودر ترسل، سعادت ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں کشمیر میں جو قحط پڑا تھا، اس کے انتظام کے سلسلے میں سعادت کو سید غلام جیلانی شاہ اسپیشل قحط افسر کے مددگار کی خدمت تفویض ہوئی تھی۔ سعادت سارے اصناف سخن میں روانی سے شعر کہتے تھے۔ ایک "شہر آشوب" بھی لکھا تھا لیکن اب دستیاب نہیں ہوتا۔ ان کے غزل کے ایک دو شعر درج ذیل ہیں:

نبار رنگ حنا پنجہ صنم خم شد ‏ ‏ ‏ ‏ عرق بہ عارض آں گلعذار شبنم شد

بگوش ہوش شنوای سعادت آں دلبر ‏ ‏ ‏ ‏ بخندہ لب میگوں نشاط عالم شد

جب وہ ملازمت کے سلسلہ میں دانتر میں مقیم تھے۔ موسم بہار آیا اور انھیں جھیل ڈل کی سیر اور نشاط اور شالامار دیکھنے کی خواہش ہوئی انھوں نے رخصت کے لئے درخواست کی جو نامنظور ہوئی۔ اس موقع پر ان کے جذبات شعر کا جامہ پہن کر اس طرح ظاہر ہوئے تھے:

خوشا، سال نو دخل کردہ بکشور ‏ ‏ ‏ ‏ ہوائے زمستان بروں شد زکشمر

شگوفہ بہ گلشن سرآوردہ بیرون ‏ ‏ ‏ ‏ بہار ایں طرف یا ارم گشتہ ہمسر

چہ داند سعادت بہ بند از اجازت ‏ ‏ ‏ ‏ بروں بردہ زیں رخت خود را بہ دانتر

ترسل خاندان کے ایک اور فارسی شاعر پنڈت سہج رام ترسل کا تذکرہ بھی محمدالدین فوق نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے اچھے فارسی شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن ان کے کلام کا انتخاب نہیں دیا ہے۔

پنڈت لچھمن بٹ چالاک بھی فارسی کے اچھے شاعر تھے اور کافی کلام چھوڑا ہے وہ صدر ناظم حسابات کے دفتر میں ملازم تھے۔ علم ہندسہ سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں ان کی وفات ہوئی۔ فارسی میں ان کی غزلیں ملتی ہیں۔ ان کے کچھ شعر یہ ہیں:

بیا کہ بے تو نخفت است چشم من امشب ‏ ‏ ‏ ‏ بشوق دید تو شد دیدہ جملہ تن امشب

بخار بنار غم ہجر تو گلی چالاک ‏ ‏ ‏ ‏ چو گل دریدہ سراپائے پیرہن امشب

چرا بندیم دل بر کار دنیا ‏ ‏ ‏ ‏ چرا با این و آں جنگیم بہ ہیچ

ملا رضا قادریہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا کلام جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں ہے دیوان کی صورت میں سنہ ۱۲۸۹ھ میں مرتب ہوا تھا۔ پہلی غزل حافظ کی پہلی غزل کی زمین میں ہے، جس کا مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے:

الا ای انس و جاں غمگین مسازید از بلاد لہا | جناب شاہ جیلاں مینما بد حل مشکلہا
رضا گر وصل او جوئی فنا فی الشیخ حاصل کن | متی ما تلق من تہوی دع الدنیا واہملہا

رضا حضرت شاہ جیلاں کی زیارت کے لئے بغداد کے سفر کی خواہش اسطرح ظاہر کرتے ہیں۔

وقت آں شد کہ ز کشمیر سفر خواہم کرد | میروم سوی جناب تو شوم بغدادی

ان کے کچھ اور شعر ہیں: ؎

بیا ای عیش شو مہمانم امشب | بدرد دل شدہ درمانم امشب
دلا دیدی کہ ہنگامہ نثارش | چہ خرم بود و خوشدل جانم امشب
رضا دیدی کہ شمس آباد گردید | ز مہرش سینہ ویرانم امشب

ملا نورالدین نے سیرت نبوی کو منظوم کیا تھا۔ ان کی مثنوی "مولود النبی" کا ایک خوشخط لکھا ہوا نسخہ جو سنہ ۱۲۰۰ھ کا مکتوبہ ہے، کلچرل اکادمی سرینگر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ حصہ ہجرت نبوی کے بعد کے واقعات پر مشتمل ہے۔ آغاز کے شعر ہیں:

ناقل اخبار و داستاں چوں نشاں | آنکہ چوں پیغمبر آخر زماں
العجب فرمود ہجرت از حرم | پس بہ یثرب آمد آں کان کرم

اس نسخے کی ابتدا میں کعبہ شریف اور روضہ نبوی اور اس کے متعلقات کے نقشے بھی شامل ہیں، جو حاجی محمد یوسف کشمیری نے جفار کر شامل کئے ہیں۔ روضہ نبوی کے نقشے کے نیچے حاجی محمد یوسف کشمیری کی حسب ذیل عبارت قلمی ہے:

"چوں ایں عاصی پُر معاصی حاجی محمد یوسف کشمیری در سال سنہ ۱۲۹۸ھ بزیارت حرمین الشریفین مشرف شدہ بنا بر یادگاری ایں نقشہ مبارکہ مطابق اصل نقل بر داشتہ شد:

غرض نقشے است کز ما یاد ماند | کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحب دلی روزی برحمت | کند بر حال ایں راقم دعائے

نقشے بڑی خوبی سے بنائے گئے ہیں اور ہر مقام کی تشریح میں جو عبارت لکھی گئی ہے، سخن میں نہایت نفیس اور حسین قلم میں ہے۔

نقشبندی سلسلے کے ایک بزرگ، خواجہ عبدالرحمٰن، خواجہ امیرالدین پکھی والی کے معتقدین میں سے تھے۔ وہ مصنف اور اچھے خوشنویس تھے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے حالات میں انہوں نے ایک کتاب تصنیف کی تھی، جو "تحفہ نقشبندیہ" کے نام سے موسوم ہے اور اس کی تصنیف کا سنہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ خواجہ عبدالرحمٰن کا انتقال ۱۲۸۹ھ میں ہوا۔

اس سلسلے کے ایک اور بزرگ خواجہ محمد مراد نقشبندی کے رسالہ "تحفۃ الفقرا" کا محمد الدین فوق نے اپنی تاریخ میں تذکرہ کیا ہے۔

میر محی الدین اکمل کے فرزند، میر حبیب اللہ کاملی بھی اپنے عہد کے علما میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ شعر و سخن کا بھی انھیں پاکیزہ ذوق عطا ہوا تھا اور خوشنویسی کا فن اپنے والد سے حاصل کیا تھا۔ انہوں نے کئی اہم کتب اپنے قلم سے لکھیں تھیں، جن میں بڑی تقطیع کا قرآن مجید بھی شامل تھا۔ اپنے والد کے پیر حضرت میرزا اکمل الدین بدخشانی کی مثنوی "بحرالعرفان" کی بھی کتابت کی تھی۔

حبیب اللہ کاملی کا انتقال ۱۲۸۷ھ میں ہوا، اس وقت ان کی عمر ۵۲ برس کی تھی۔ محمد الدین فوق نے تاریخ وفات "شد حبیب اللہ از جہاں بہ جناں" سے نکالی تھی۔

پنڈت طوطا رام بٹ برہمن کو فارسی شاعری سے بڑا لگاؤ تھا، وہ سری نگر کے ایک مدرسہ میں فارسی کے معلم تھے۔ حمایت دام سبھا کے نام سے ایک مذہبی انجمن اسی زمانے میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے دوسرے جلسے میں برہمن نے ایک طویل نظم مثنوی کی شکل میں پڑھی تھی جو بعد میں "مراسلہ کشمیر" میں ماہ اگست ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس مثنوی کے آغاز میں برہمن دل سے مخاطب ہو کر اپنے شعری اکتسابات کی خود داد دیتے ہیں۔ پھر کچھ ماضی کی تاریخ کے بارے میں اشارے کئے ہیں اور مہاراجہ رنبیر سنگھ، ان کے وزرا

دیوان کرپارام اور وزیر پنوں کی توصیف کی ہے کہ ان کی سعی سے سبھا قائم ہوئی۔ کہتے ہیں۔ ؎

سری مہاراجہ صاحب ذیشاں — واہب فیض بخش وفیض رساں
نام رنبیر سنگھ و نامی تر — از ہمہ ناظماں گرامی تر
نیز دیوان خاص کرپا رام — باوش ایام عیش وناز بکام
ہم امین اماں وزیر پنوں — قامع بیخ اعتساف وجنوں

دیوان کرپارام کی تعریف مندر کی تعمیر کے سلسلے میں کی ہے۔

طالب نفع عام کرپا رام — کردہ مندر بنا مفید عوام
پس گرد ہے ز ہندوان شریف — ایں مکاں بس پسندیدہ وشریف

ست کرم سبھا کی تاریخ بکرمی سنہ میں "ست کرم سبھا ست جن، کشمیر" سے ۱۹۳۲ سمہ بکرمی برآمد کی ہے۔

طوطا رام بٹ نے "شری مہا بھاگوت" کا فارسی نظم میں ترجمہ غالباً رنبیر سنگھ کے دارالترجمہ کیلئے کیا تھا جس کا ایک نسخہ کلچرل اکاڈمی سرینگر کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ترجمہ ۱۹۲۳ سمہ بکرمی (م ۱۸۶۶ء) میں مکمل ہوا۔ کلچرل اکادمی کا نسخہ طوطہ رام کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جیسا کہ ذیل کے ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے۔

"اتمام پوران شری مہا باگوت در ہنگام فرخندہ فرجام ایالت صوبہ داری راجہ صاحب راجہ رنبیر سنگھ جی دام اقبالہ والی جموں خاص در وقت سعید انتظام گرفت از دست طوطا رام بٹ ......
انتظام واتمام در سال صد صورت پذیرفت"

مترجم کے اصل متن کے خاتمے پر حسب ذیل عبارت لکھی ہے:

"ایں پوران سری مہا باگوت لیلائے شری مہاراج بیاسی پور کھ

مشتمل بر دوازده اسکندگیان است بزبان وحی ترجمان بید و پوران از جملہ مہابارتھ بمعرض تغنیف انتظام و انصرام گرفت از دست طوطارام بٹ ولد نند رام بٹ سرکرپاہلے (؟) در ماہ پھاگن سموت ۱۹۲۴ سنہ جلوس میمنت مانوس ہفت دکھرا (... ۱۹۲۴ بکرمی) مطابق نقل سادہ کول سکنہ... علاقہ پانکل وبنا بر مخفی مطالعہ کنندگان رفع حادثات دوراں وحصول مطالبات دوجہاں در زمان مسعود آوان محمود روز فرخندہ فیروز شری شیوراتری ماتاجی کہ آفرینندہ جہان وجہانیاں است ہنگام سہ پہری روز مرقوم یافت۔ بدستخط طوطہ رام بٹ انتظام یافت!

یہ شعر بھی مندرج ہیں:

ناظر ابروی چو اندازی نظر — از خطا و سہو کاتب درگذر

ہیچ نیتی نادہی اندر زباں — بلکہ سازی از دعا شیرین زباں

ہر کہ کاتب شاد سازد آرد دعا — شادیش بخش ای خدا ہر دوسرا

یہ نسخہ طوطا رام بٹ کے فرزندوں، ویشیہ بٹ اور پرشاد بٹ موضع کشتی پورہ (؟) کے قبضہ میں رہ چکا ہے۔

ملا احمد سہروردی جید مشہور عالم اور شاعر تھے۔ انھوں نے "تاریخ جید احمدی" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی۔

"تاریخ جید احمدی" یا "تاریخ جید" یا "خلافت نامہ جید ۱۲۸۳ھ میں لکھی گئی۔ جو تاریخ اسلام پر طویل نظم ہے اور چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ حضرت پیغمبر کی حیات سے لے کر فتح مصر تک واقعات اس میں نظم کیے ہیں۔ نمونۂ تاریخ حسب ذیل ہے:

پئے سال آغاز ایں خوش کلام — خرد گفت اذکار صحب کرام

جبیدؔ نے ایک شہادت نامہ بھی لکھا تھا، جس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے :

بیار است خود را بمصری قبا بسر بست دستار خیرالورا
پس پشت کردہ زمزمہ سپر حمایل قبا ذوالفقار پدر

جبیدؔ کے صاحب زادے سعدالدین بھی شاعر تھے ۔ وہ مسجد نقشبند کے امام تھے اور اچھا شعر کہتے تھے ۔

پنڈت ٹیکارام کول، کشمیری پنڈتوں کے ایک معزز خاندان میں ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کے اجداد میں پنڈت تلک چند منشی رئیس اعظم تھے ۔ فارسی کی مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد، انہوں نے ریاضی پڑھی تھی اور کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک اصطرلاب ایجاد کیا تھا جو اب برٹش میوزیم میں ہے ۔ ان کے علم و فضل کے مدنظر مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انھیں اپنے دربار کے علما میں شامل کر لیا تھا ۔

پنڈت ٹیکارام فارسی میں شعر کہتے تھے اور نثر میں بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے ۔ ایک تاریخ کشمیر بھی لکھنی شروع کی تھی جو نامکمل رہ گئی ۔ یہ تصانیف اب دستیاب نہیں ہوئیں ۔ نظموں کا بھی کافی ذخیرہ چھوڑا تھا، جس میں نثری بھگوت گیتا کا فارسی ترجمہ بھی شامل تھا ۔ پنڈت جانکی ناتھ مدن دہلوی نے اپنے ترجمہ بھگوت گیتا میں جو "فلسفہ الوہیت" کے نام سے موسوم ہے ۔ فیضی کے ترجمہ کے علاوہ ٹیکارام کے ترجمے کا بھی ذکر کیا ہے ۔ پنڈت ٹیکارام کے قصاید کے چند شعر یہ ہیں ۔ دوسرا قصیدہ دیوان کرپا رام کی تعریف میں ہے :

مقبول کرد آں کہ نظام جہاں کند از نطق و خلق و لطف و مباہات و التفات

~~~~~~~

از عدالت از سخاوت از شجاعت می کند فتنہ در خواب و جہاں خرم، عدو در اضطراب
بہر نظم ملک از دیوانی فضل و کمال ساخت رای صاحبش دیوان کرپا رام انتخاب
~~~~~~~

کشمیر سے ملحقہ علاقوں، لداخ اور وسط ایشیا کے بعض ممالک، جیسے یارقند، خطا، ختن، آق سو، ڈاک خطائی، ماچین منغولستان، قمل، کابل، بخارا، کاشغر، خوارزم، ماوراالنہر، سمرقند، فرغانہ، کاک، خجند، آخشی، تاشی، ترکستان، دشت قبچاق، تاتار، چاچی ترخان، کے حالات کا ایک تفصیلی کتابچہ ملتا ہے۔ اس میں مختلف شہروں کے منازل، زراعت، پیداوار، مالیہ، انتظام، اجناس، صاحبان مناصب سب تفصیلات درج ہیں۔

خان خطائی کے حالات میں لکھا ہے:

"خان خطائی را در ممالک خود یک ہزار دو صد وزرای عالیمقدار دارد و نظم نسق ممالک و بند و بست آں در قبضہ قوت و اقتدار آنہا است و از میان این وزرا دوازدہ نفر از روی رتبہ بزرگ و کلاں تراند کہ تمام امورات از ملکیہ و مالیہ ممالک محروسہ خان با تفاق ہمدگر بہ رایہای سنجیدہ و بقانون پسندیدہ بہ انصرام می رسانند"

پنڈت مہتاب جیو ترسل، روشن تخلص کرتے تھے ۱۸۳۹ء میں ان کی ولادت سرینگر میں ہوئی۔ فارسی پر بڑی اچھی مہارت تھی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ کشمیر کے اہل ثروت پنڈتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور علم و ادب کے قدر دان تھے۔ روشن کا انتقال ۴۹ برس کی عمر میں ۱۸۸۸ء میں ہوا۔ ان کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

از آب رو بیش و زتاب مو یش، از اشک گو یش و زسر خویش

سیماب لرزاں، سنبل پریشاں، مجنوں پیچاں، خجل گریزاں

تنہا نہ روشن سر در دل صحرا، از درد ہجرش مفتوں و شیدا

فرہاد و مجنوں در کوہ و ہاموں، بے برگ و ساماں، افتاں و خیزاں

زلفت کہ تکیہ بر ورق گل نیاز کرد   ہندو نگر کہ پای بہ مصحف دراز کرد

شیخ احمد ترالی نے اسی زمانے میں احکام اسلام کے بارے میں "مفتاح السعادۃ" کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا تھا۔ یہ ترال کے رہنے والے تھے اور تیلیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کشمیر میں غلام محی الدین مفتی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی جاکر مولوی اسحاق سے حدیث کے درس لئے تھے۔ سلسلہ کبرویہ میں مرید ہوئے اور دہلی سے کشمیر لوٹنے کے بعد تدریس اور ہدایت میں مصروف رہے آخری عمر میں حج بھی کیا تھا۔ "مفتاح السعادۃ" کے موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہمیگوید فقیر حقیر احمد ترالی عفی اللہ عنہ ولوالدیہ ایں رسالہ ایست مسمی بمفتاح السعادۃ در بیان طاعون و وبا و احکام آں و ترغیب عیادت مریض و صبر نمودن بر بلا و مرض و مسائل تکفین و تجہیز و جنازہ"

رسالہ سترہ فصلوں اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ اس کی تکمیل کی تاریخ اس رباعی سے برآمد ہوتی ہے۔ جو آخر میں درج ہے۔

چوں گرد قلم از صفحہ خاطر رفتم   از منقب فکر دُر معنی سفتم
دنگہ پی نام و سال تاریخ کتاب   مفتاح سعادت بسعیداں گفتم!

میر غلام حسین نے لکھا ہے کہ "ناسوار" کے حرام ہونے کے بارے میں بھی انہوں نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ شیخ کا انتقال ۱۲۹۶ھ میں ہوا۔

پنڈت واسدیو، جو شادکا کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ۱۸۲۷ء میں کشمیر کے گاؤں نوڈ میں پیدا ہوئے تھے اور پچپن برس کی عمر میں ۱۸۸۲ء میں انتقال کیا۔ مذہبی آدمی تھے۔ اور سوامی طوطہ کاک جی مہاراج کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ دیوان

پنڈت شیو ناتھ کول منتظر اور پنڈت دیوہ کول دیوہ کے دوست تھے اور ان کے ساتھ شعر وسخن کی محفلیں گرم رہا کرتی تھیں۔ سوامی طوط کاک کی تعریف میں انہوں نے ایک قصیدہ دو قافیہ والا لکھا تھا۔ جس کے دو شعر حسب ذیل ہیں:

نظرت کیمیا ست گر نگری ۔۔۔ گنج باشد زمشت خاکم کم

تاکنی جلوۂ بباغ ظہور ۔۔۔ گل بکف رنگ، دبوی شبنم کم

پنڈت شیوجی در "تاریخ کشتوار" کے مصنف پنڈت مہانند جو در کے بیٹے تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انھیں کشتوار اور بھدرواہ کا افسر مال اور وزیر وزارت مقرر کیا تھا۔ اسی تعلق کے باعث انھیں اس علاقے کی تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ "تاریخ کشتوار" کے دیباچے میں وہ اپنے بارہ میں اور تاریخ کی ترتیب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"برضمیر منیر ادیبان زمان وخاطر خطیر البیان دوران پنہان نماند کہ چوں من راجی مسمی بہ پنڈت شیوہ جی در بن مہانند پنڈت در بن گنیش پنڈت در سکنہ خطہ کشمیر جنت نظیر از حضور سرکار گردون اقتدار در سال سمت ۱۹۳۸ وسنہ بکرمی بخطاب وزیری بر حکمرانی ملک کشتوار و بھدرواہ مقرر و مفتخر شدم۔ فرمان واجب الاذعان درباب ترتیب تاریخ ایں دیار عز اصدار یافت۔ بر طبق آں از عمران ایں سواد و نجران ایں بلاد استفسار کوائف حاکمان سلف و زبان خلف نمودم از آں جاکہ از اسناد سابق مانند بی نشان نام و نشانی نداشتند۔ تمادی از منہ بردۂ کل العنہ تفاوت بسیار و مسافت بے شمار افتاد . . ."

پنڈت شیوجی کی اس کوشش نے اسی دور افتادہ علاقے کے حکمرانوں

کی تاریخ ہماری دست رس میں لادی ہے۔ کشمیر کی تاریخ کے بعد اس علاقے کی تاریخ بھی قدیم ہے۔ شیوجی کا انداز بیان ہندوستان کے فارسی نویس منشیوں کا سا ہے، جس سے واقعات تک پہنچنے میں بیان کے پیچ وخم سے گزرنا پڑتا ہے، تاہم شاید کشتواڑ کی یہ کمیاب تاریخ ہے۔ جو ہماری دست رس میں ہے۔

منشی محمدالدین فوق نے اپنی "تاریخ اقوام کشمیر" میں کشتواڑ کی ایک اور تاریخ کا تذکرہ کیا ہے۔ جو "تاریخ کشتواڑ" کے نام سے موسوم ہے اور سید نجم الدین حسن کی تصنیف ہے۔ لیکن یہ تاریخ اب کمیاب ہے۔

پنڈت شیوجی نے اپنی تاریخ میں تھوڑی تفصیل کشتواڑ کے جغرافیائی موقف کی دی ہے۔ پھران دیہات اور پرگنوں کا حال لکھا ہے۔ جو کشتواڑ میں شامل تھے۔ ہر پرگنہ کے قریوں کی تعداد بھی التزام کے ساتھ بتادی ہے۔ عہدہ دار مال ہونے کے تعلق سے یہ سارا مواد ان کی تحویل میں تھا۔ جہاں تک تاریخی حالات کا تعلق ہے۔ وہ مختصر ہیں اور اسناد کی عدم موجودگی میں اس سے زیادہ لکھنا ان کے لئے شاید ممکن نہیں تھا۔ تاہم اس کو پڑھنے سے کشتواڑ کے حکمران خاندانوں کا خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اکثر مقامات کے موجودہ ناموں کی مختصر تاریخ بھی دی ہے، جس سے وجہ تسمیہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ مثلاً مغل میدان، جس کا قدیم نام مغل مزار تھا اور جہاں اکبر کے عہد میں ناکام مغل حملہ آوروں کی لاشیں مدفون ہوئی تھیں یا ہستی گنڈ، گرباغ وغیرہ۔

یہ تاریخ رشی شرہ پال کے عہد سے شروع ہوتی ہے اور رنجیت سنگھ کے آخری ایام پر ختم ہو جاتی ہے۔ آخر میں سپاہیوں اور اہلکاروں کے آئین، ان کے مصارف اور دوسری ضروری معلومات بھی فراہم کر دی ہیں۔

پنڈت ٹیکارام آخون کے فرزند اور پنڈت کول بھی فارسی کے شاعر تھے۔

اور بہارؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۰۰ء میں سرینگر میں ہوئی تھی فارسی اور عربی کی تعلیم والد سے حاصل کی اور مدرسہ میں فارسی کا درس دیتے تھے۔ ان کی کچھ غزلیں، قصیدے اور دو مثنویاں "مناظرۂ عقل و دولت" اور "مناظرۂ شمع و پروانہ" یادگار ہیں۔ اول الذکر مثنوی "مراسلۂ کشمیر" میں چند قسطوں میں چھپی تھی، پھر مطبع نولکشور، لکھنؤ سے ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔ ۱۸۸۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ قصیدے کشمیر کے رئیس پنڈتوں کی مدح میں ہیں۔ ایک قصیدے کے دو شعر حسب ذیل ہیں:

رسید مژدہ کہ ایام عیش و ناز آمد — بجو بیار امید آب رفتہ باز آمد
شگفت غنچہ دلہائے خویش و بیگانہ — چو این نسیم بشارت باہتزاز آمد
کہ یعنی از شرف حکم لطف شاہ زماں — بحال پنڈت جواد دلنواز آمد

پنڈت کیلاس کول میگزین صبا، حبہ کدل کے قریب زینداد محلہ میں قیام کرتے تھے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی، اس لئے طالبان علم ان سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے ہم عصر سخن سنج اشعار کی تفہیم میں دقت محسوس کرتے تو ان سے رجوع کرتے تھے۔ ان کی قابلیت کے مدنظر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے ایک درباری رام کشن نے انھیں مہاراجہ کے دربار میں پیش کیا۔ مہاراجہ ان کے علم و فضل سے متاثر ہوئے اور محکمہ فوج میں میگزین کا افسر اعلےٰ مقرر کیا۔ اس وقت سے ان کا اور اہل خاندان کا لقب "میگزین" پڑ گیا۔

کبھی کبھی فارسی اشعار میں کشمیری زبان کے الفاظ بھی باندھ جاتے تھے جسے "بہارِ گلشن کشمیر" کے مرتبین نے یک نقص جانا ہے۔ کشمیری شاعروں کے لئے دراصل یہ ایک فطری بات تھی۔ استاد شعرا میں غنی کاشمیری نے یہ تحریک شروع

کی تھی۔ لیکن بعد کے شعرا میں کم ہی نے اس سنت کی پیروی کی۔ کچھ شاعر ایسے ضرور ہوئے ہیں جنہوں نے فارسی کشمیری آمیز اشعار ریختہ انداز کے کہے ہیں۔

صبا غزل کہتے تھے اور غزل کے مروجہ موضوعات کو کبھی کبھی تصرف کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کلام کا اقتباس حسب ذیل ہے:

اشکِ بے اختیار را چہ کنم طفلِ دیوانہ وار را چہ کنم
کردمی دردِ دل بسینہ نہاں دیدۂ اشکبار را چہ کنم

بر سرِ سرکش فتد بر خاک آخر از خودی در چمن فوارہ ہر دم سرنگوں ازمائی است

کلاہ کبر زمائی منہ صبا بر سر ترا کہ چشم تری چوں حباب می باید

احمد سعید تارہ بلی نے قادری سلسلے کے بزرگوں کے ملفوظات اور تعلیمات پر ایک "رسالہ قادریہ" ۱۲۹۵ھ میں مرتب کیا تھا۔ اس کی تالیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"خواستم کہ آن تعلیمات و مضامین مراقبات و مشاہدات آں اختصاراً و ایجازاً لفظاً یا معنیً وازنتائج و ثمرات آں کہ موجب حوصلہ و استعداد و فراخورد ظرف خود کہ مطابق بواقع است و چنوں و افسانہ گوئی و نتائج تراشی نیست فہمیدم و یافتم، و سایہ گستری بزرگاں در خود وجداً کشفاً و عیاناً دریافتم و مشاہدہ نمودم بغیر تطویل و تزخیم حفظاً لنفس، لا للافتخار، بین خلائق بقلم آرم۔"

"برہانِ ہدیٰ" میرزا غلام احمد قادیانی کی توصیف میں ایک منظوم رسالہ ہے جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو۔ یہ رسالہ میرزا عظم رسول شاہ کے قادیانیوں پر

اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ ذیل کے اشعار میں میر واعظ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

الا ای میرواعظ بشنو از من بکن فیصلہ باین آیہ احمد
جہانی بیند این جنگ مقدس کہ در کشمیر رسول شاہ احمد

مصنف میرزا غلام احمد قادیانی کو مسیح موعود مانتا ہے اور جو کوئی اس کا منکر ہے اُس سے ناراض ہے۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے یہ تک بندی ہے۔ اس میں شاعری کا شائبہ بھی نہیں۔ بلکہ اکثر مصرعے ساقط الوزن ہیں۔

چودھویں صدی ہجری کے ابتدائی زمانے کا ایک شاعر عاقب بھٹے بال کا پورا نام عبدالحی بن عبد الغفار تخلص عاقب تھا۔ تاریخ اسلام پر انہوں نے ایک مثنوی جو "مثنوی عاقب" کے نام سے موسوم ہے، لکھی تھی۔

حمد و نعت کے بعد حضرت پیر شاہ سید احمد سامانی کی منقبت میں کچھ شعر کہے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم کی فتوحات، عمرو بن عاص کا مصر پر حملہ اور فتح کا حال لکھا ہے:

دمی باش با ہوش دل اے پسر دو سہ کلمہ از من بشنو مختصر

تاریخ کے بارے میں حسب ذیل شعر کہا ہے:

گر از سال کشمیر جوئی خبر دو الف و لی دال و نون مختصر

ابو محمد خواجہ حسن شعری جو عام طور پر خواجہ حسن شعری کے نام سے مشہور ہیں سکھوں کے عہد حکومت میں کشمیر کے ایک سربرآوردہ شاعر اور عالم تھے۔ شاعری ان کا پیشہ نہیں تھا، بلکہ شالی کی تجارت ان کا ذریعہ معاش تھا۔ وہ ناظم کشمیر خواجہ عنایت اللہ خان کی اولاد میں تھے۔ ان کی ولادت ۱۲۲۳ھ م ۱۸۰۸ء میں ہوئی تھی۔ سردار کھڑک سنگھ کے دور میں سکھوں کے مظالم سے ناراض ہو کر وہ پہلے امرتسر گئے اور پھر دہلی۔ دہلی میں مرزا غالب سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ ان کا انتقال رنبیر سنگھ

کے عہد میں ہوا۔ شعری کا پایہ شاعری میں بلند تھا۔ انہوں نے سلطان ترکی کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ بھیجا تھا جس پر انہیں سلطان کے دربار سے "فخر الشعرا آفتاب ہند" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ صوفی نے ان کی مثنوی "لعل و گوہر" سے حسب ذیل اشعار نقل کئے ہیں:

نقش یمین است بر نگینم   شعری و سہیل نوشہ چینم
نامم بزبان حسن بیان است   شعری لقبم ز آسمان است

شعری کا انتقال ۱۲۹۸ھ م ۱۸۸۰ء میں ہوا۔ انہوں نے اپنی وفات کی تاریخ خود کہی تھی:

*

جست تاریخ فوت خود شعری   شد بدار رحمت خدا آمد

صوفی نے ان کے نثری کارنامہ "گلزار خلیل" کا بھی تذکرہ کیا ہے، جو ماقبل تصانیف جیسے بابا داؤد مشکواتی، خواجہ محمد امین گاؤنی، قاضی عبدالکریم چھاوے کے تذکروں اور قاضی حیدر قاضی خان کے رسائل پر مبنی ہے۔

پنڈت ہری رام کول نے دیا بجالت کا ترجمہ کیا تھا۔ ترجمہ کی وجہ تحریک کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ایک رات شری راجندر جی نے خواب میں تاکید کی تھی:

"بلسان فارسی کہ پارسی داننذ بعبارت صاف و معنی درست ترجمہ نمایند کہ تا فارسی خوانان بسہولت تریب وجہ بخوانند ہم تا سعادت دارین حاصل شود۔"

ترجمہ نظم اور نثر دونوں میں کیا گیا ہے۔ جس کا سنہ ۱۹۳۴ بکرمی ہے۔ ترجمہ میں تکلفات بارد سے بھی کام لیتے ہیں۔ مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

چوں پانڈواں نیک بخت کہ بر آئینہ خداوندان تخت و دیہیم خدیوان زیباں دیہو دبلند تحریم اند بجہ فتح و ظفر کہ آری مفتاح کنوز جاہ و حشم موجب انبساط دیگرند و نعم است کہ نعم شاں زبردست بنیر

دستی خود رو بر دست بیکدسرت نمودند گوی رای از رایان
جہاں کہ موید الطاف رای رایان جہاں آرا و جہان اند ربودند۔"

اختتام کا ایک شعر ہے:

ای ہر برامم دائم دمادام | یا درت رام بادو بخت بکام

پنڈت واسدیو کول اوگرہ، بلبل تخلص کرتے تھے وہ سری نگر کے محلہ خانقاہ معلی کے قریب رہتے تھے۔ ان کے خاندانی نام "اوگرہ" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ زمانہ قحط میں چاول کا اوگرہ بنا کر تقسیم کیا کرتے تھے۔ ان کی پیدائش کا ۱۸۵۰ء ہے۔ فارسی میں ان کے استاد علامہ پنڈت سرت رام مجرم تھے جو اپنے زمانہ کے مستند عالم ہونے کے علاوہ شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ شاگرد کی تربیت انہوں نے بڑی دلدہی سے کی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بلبل کو فارسی نظم و نثر پر بڑی اچھی قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ "دیوان بلبل" کے نام سے مرتب ہوا ہے اس کے علاوہ ان کی تصانیف سے "چہار درویش" "گلزار بلبل" "گلشن عندلیب" اور ایک ناٹک "ہریش چندر" بھی ان کی یادگار ہیں۔ غزل میں وہ سادگی اور سلاست کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ غزل کے چند شعر ہیں:

زاہد از تیرگی شوی دل صاف | گر گشی درد آبگینہ ما
دل براہ غمت چو پای نہاد | نہ فلک گشت پای زینہ ما

گفتم کہ من یار تو ام، گفتا ندانم کیستی | گفتم غمت دارم بدل، گفتا نہ غمخوار ما

"گلشن عندلیب" مثنوی ہے جس میں بنارس کے ایک نوجوان کا قصہ بیان کیا ہے اس کی بیوی ایک اور نوجوان پر عاشق تھی، اس نے مکر سے اپنے شوہر کو شہر سے باہر

بھیج دیا تھا۔ اس موقع پر بلبلؔ نے سرشت بے وفائی زناں پر ایک لمبا چوڑا وعظ لکھ دیا ہے، کہتے ہیں :

سرشت زناں چوں بنا کردہ اند ... بآب گل مکر پروردہ اند

"گلزار بلبل" بھی مثنوی ہے۔ جس کے اہم حصے حمد و ثنا، ساقی نامہ اور تعریف بہار ہیں۔ بہار کی تعریف میں کشمیر ان کے مد نظر ہے۔ کچھ شعر ہیں :

چوں گشت زمیں ز گل مزین ... شد چشم جہاں چو چشمہ روشن
بشگفت گل و دمیدہ سنبل ... زد جوش بہار آتش گل
در باغ بہار کردہ خانہ ... در زلف بنفشہ کرد شانہ
بر شاخ چنار سبز پہلو ... زد فاختہ نالہ ہای کو کو

بلبل کی "چار درویش" ایک ضخیم مثنوی ہے جو کئی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ حمد، مناجات، تعریف بادشاہ، تعریف استاد، مذمت دنیا۔ اس کے ابتدائی ابواب ہیں۔ سبب تالیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ میں ایک دن اپنے ایک رفیق کے ساتھ سیر باغ کو گیا تھا :

"اندراں باغ شب گزار شدیم ... باہم از عیش سازگار شدیم
بفسانہ فسونِ شب کردیم ... باہم از خوشدلی طرب کردیم

انھیں افسانوں میں پادشاہ آزاد بخت کا افسانہ بھی تھا۔ دوست نے جب یہ قصہ سنا تو انہیں اس قصے کو منظوم کرنے پر مجبور کیا۔

گفت کای در سخنوری ممتاز ... شعر تازہ ز تو گرفتہ طراز
زیں فسانہ کہ از تو بشنفتم ... از طرب باغ باغ بشگفتم
ہست ایں قصہ عجیب و غریب ... دلنواز است دلفریب عجیب
گر پی خاطرم کنی زیبش ... دہی از نظم شعر ترتیبش۔

اسی فرمائش کی پیش رفت میں یہ داستان منظوم کی گئی۔ تو کلاسیکی انداز داستان نگاری کی ساری خصوصیات کی حامل ہے۔ قصہ کے اختتام پر لکھتے ہیں :

نقد من ہست این خزینہ گنج | کہ درو چون خزینہ بردم رنج
پنج قصہ درون این گنج است | پنج گنجم ز بہر تاریخ است
از در لعل این خزینہ پر است | نہصد و دہ ہزار لعل و در است

یہ حصہ بھی بہت طویل ہے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کی مدح سرائی پر ختم ہوتا ہے۔

ترقیمہ کے طور پر یہ لکھا ہے۔

یہ کتاب آج بوقت ۳ بجے روز بروز پنجی کر سمہ پختہ بدستخط پرسا دکول بہ تائید شری دیوی صاحبہ اختتام پائی۔

تاریخ تحریر ۱۴ ماہ بہادوں ۱۹۷۲ سمہ بکرمی ہے۔

حافظ غلام رسول شیواؔ، مشہور مورخ کشمیر پیر غلام حسن کویہامی کے والد، فارسی اور عربی کے عالم تھے اور اسلامی تصوف سے انھیں خاص شغف تھا۔ ان کے اجداد میں گنیش کول دتاتریہ نے حضرت مخدوم شیخ حمزہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ ان کا اسلامی نام غازی الدین رکھا گیا تھا۔ مغلوں کے دور میں اس خاندان سے شیخ محمد فاضل نے جن کی وفات ۱۷۳۷ء (م ۱۱۵۰ھ) میں ہوئی بڑے عالم اور فاضل ہوئے ہیں۔ مغل حکمرانوں نے انھیں جاگیر بھی عطا کی تھی۔ سکھوں کے عہد میں یہ جاگیر ضبط کر لی گئی تو اس خاندان کے افراد پرگنہ کویہامہ کے گاؤں گمر میں منتقل ہو گئے۔ شیواؔ نے "مجموعہ شیوا" کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی تھی ان کا ایک رسالہ "مناظرہ عندلیب و قمری" کے نام سے موسوم ہے، جس میں شاعر نے بیان کیا ہے کہ ایک صبح وہ باغ کی سیر کو گیا۔ وہاں اس نے عندلیب اور قمری کو سرگرم تکرار دیکھا!

قضا را عندلیب نالہ پرداز — بدیں قانون ترنم کرد آغاز
کہ چوں گل کس ندارد دلبری یاد — کہ باشد بندہ او سرد آزاد

یہ زمزمہ سنتے ہی قمری کی غیرت جاگ اٹھی اور وہ عندلیب سے بحث کرنے لگی۔ آخر فیصلہ مرغ سلیمان نے کیا کہ سرو گل دونوں چمن کی زینت ہیں۔ تم دونوں ایک ہی باغ کے رہنے والے ہو، تم کو اس بات پر جھگڑنا نہیں چاہئے۔

پیر غلام حسن ۱۸۳۳ء (م ۱۲۴۹ء) میں پیدا ہوئے تھے ابتدائی تعلیم والد کے یہاں حاصل اس کے بعد وہ پنجاب اور افغانستان کے سفر پر گئے اور وہاں کے علما سے بھی استفادہ کیا۔ خواجہ محمد تاشقندی کے ہاتھ پر انہوں نے نقشبندیہ سلسلے میں بیعت کی۔ اس سیاحت کے دوران انھیں ہندوری کے ایک عالم، ملا محمود کے پاس سے، ملا احمد کشمیری، زین العابدین بڈشاہ کے ملک الشعرا کی تصنیف "وقائع کشمیر" دستیاب ہوئی تھی۔ جو ان کے یادگار کارنامہ "تاریخ حسن" کی محرک ثابت ہوئی۔ اسی تاریخ سے انھوں نے کشمیر کے ان ابتدائی پینتیس راجاؤں کا حال اخذ کیا تھا جو "شاہان گم شدہ" سے موسوم کئے جاتے ہیں۔

حسن نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں کشمیر کے ناظم، وزیر پنوں کے کشمیریوں پر مظالم کے بارے میں ایک طویل نظم فارسی میں لکھ کر مہاراجہ کو پیش کی تھی، جس پر ناظم کو ہٹایا گیا اور لوگوں کو اس کے مظالم سے نجات نصیب ہوئی تھی۔ اس نظم کی وجہ سے پیر غلام حسن پہلے پہل منظر میں آگئے۔ چنانچہ جب سر ڈبلیو، آر، لارنس کشمیر میں جندوبست اراضی کے کمشنر مقرر ہوئے، تو دہقانوں کی حالت کی تحقیق میں انہوں نے پیر غلام حسن سے مدد لی تھی۔ دیوان اننت رام نے ان سے کشمیر کا ایک جغرافیہ لکھنے کی فرمائش کی تھی، جس پر پیر غلام حسن نے وہ کتاب لکھی تھی۔ جو "تاریخ حسن" کا پہلا حصہ بن گئی ہے۔

پیر غلام حسن نے اس کے بعد اور تین جلدیں لکھ کر کشمیر کی سیاسی تاریخ اور اولیا، علماء اور شعرا کے حالات کے بارے میں ایک یادگار کارنامہ نبیاد کر دیا۔ سیاسی تاریخ دوسری جلد میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے اور قدیم ترین راجاؤں کے عہد سے لے کر خود اپنے زمانے، یعنے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد تک کے سارے واقعات اس میں شامل کئے ہیں۔ اس حصے کی ترتیب میں حسن نے اپنے پیش رو خواجہ اعظم دیدہ مری کی تاریخ "واقعات کشمیر" سے بہت مدد لی ہے، اور بعض جگہ جملے تک مستعار لے لئے ہیں۔ تاہم یہ تاریخ اگلی ساری تاریخوں کے مقابلے میں زیادہ بسیط اور زیادہ سلیقے سے ترتیب دی گئی ہے۔ صاحب زادہ حسن شاہ اولاً مددگار، اور بعد میں ناظم محکمہ تحقیق اور اشاعت کی ترتیب کے ساتھ پہلی اور دوسری جلد ایک عالمانہ مقدمہ اور حواشی کے ساتھ نہایت سلیقے سے شائع ہوئی ہے۔

پیر غلام حسن نے اس میں قدیم راجاؤں کے بارے میں دلچسپ لطائف اور حکایات بھی شامل رکھی ہیں۔ جن میں اکثر قدیم عہد کی سنسکرت تاریخوں اور خاص طور پر کلھن سے چلی آرہی تھیں۔ اس طرح کا ایک لطیفہ راجا مہرہ کل کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ سنگلدیپ کے راجا کو مغلوب کر کے لوٹ رہا تھا:

> "وقتیکہ بر کوہ پیر پنجال رسید، ناگاہ فیلی از کتل غلطیدہ و ہنگام غلطیدن بسیار فریاد و غوغا نمود۔ راجہ را صیحۂ او خوش آمدہ یکصد فیل در انجا بزیر غلطانیدہ و خندہ و خوش حالی نمود ازاں باز آں مکان را ہستت ویخ می گویند"۔

پیر غلام حسن کا انتقال ۱۸۹۸ء (م ۱۳۱۶ھ) میں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی ولادت اور وفات کے بارے میں خود ہی ذیل کا قطعہ لکھ رکھا تھا۔

آہ غلام حسن بلبل باغ سخن
رفت ازیں خوش چمن جانب مینو کہ

ہاتف فرخندہ فال ازپی تاریخ سال　　عمرِ ولادت وصال گفت زیک بیت جو

بلبلِ باغِ اصفیا ۱۲۳۳ آمد و ساجد بزیست　　ازپی سال وفات یافت حسن بہشت گو ۱۳۱۶

تاریخ گوئی میں کشمیری شعرا ۲۸ اور علما کو جو امتیاز حاصل رہا ہے، اس کی طرف گزشتہ اوراق میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اپنی تاریخ وفات خود کہہ رکھنے کی روایت بھی کشمیری شعرا اور علما میں بہت ملتی ہے۔ لیکن پیر غلام حسن نے ولادت عمر اور وفات کو ایک بیت میں اکٹھا کرنے کی جس عجیب و غریب روایت کی ابتدا کی تھی، دراکی کا کمال تھا۔ پیر غلام حسن شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن شاعری میں ان کا کوئی پایہ نہیں ہے۔

پنڈت بلہ کاک توتہ دار مسرور، کشمیری پنڈتوں کے ایک سربرآوردہ خاندان سے تھے۔ ۱۸۵۱ء ان کا سنہ ولادت ہے۔ سرینگر کے مشہور محلہ رینہ واری میں ان کا قیام تھا۔ انہوں نے مہاراجہ گلاب سنگھ بانی سلطنت جموں و کشمیر کا آخر عہد دیکھا تھا۔ مکتب سے فارسی کی تحصیل کی کچھ عرصہ فوجی محکمہ میں اسٹور کیپر کی خدمت انجام دی، اس کے بعد ترک ملازمت کر کے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے اور مالش وغیرہ کا کام کرتے رہے اور یہ بلا معاوضہ خدمت خلق اللہ کے طور پر کرتے تھے اس زمانے میں وہ مذہبی کتابوں اور شاستروں کا بھی مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا۔

فارسی میں ان کا ایک دیوان ہے جو "ہمسایہ کاشی" کے نام سے موسوم ہے اس کے علاوہ شاستروں کے کچھ منظوم فارسی ترجمے بھی کئے ہیں۔ ان کی غزل حلاوت سے خالی نہیں ہے۔ کچھ شعر ہیں:

بتے دارم سراپا مہر و گل رخسار دلداری　　سمن بر نازپرور، دلبری، شوخی و عیاری

عیار نازنیں، غارت گر عقل و دل و دینم　　نگاری نوش لب شیریں سخن و شہد گفتاری

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی مدح میں مسرور نے ایک نظم کہی تھی، جس کے دو شعر ہیں:

شہنشاہی بدیں جاہ و دیں فر — نبود است و نخواہد بود دیگر
الٰہی تا ابد موجود بادا — بہ شان و سروری ذی ہوش بادا

شاستروں کا ترجمہ بھی انہوں نے گرو چمپا ناتھ سوامی کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس بارے میں کہتے ہیں:

پئے تصنیف ایں دھرم گرامی — رسید ارشاد چمپا ناتھ سامی
ازاں در خدمت اہل بلاغت — نیاز آرم بہ امید اجابت

انشائے بخشی دیارام کا جزو دوم موسوم بہ واقعات مہاراج رنبیر سنگھ رقعات کا مجموعہ ہے۔ جو بخشی دیارام نے مختلف عہدہ داروں کی جانب سے اور دوستوں کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط کو ان کے فرزند بخشی دینا ناتھ نے مرتب کر کے مہاراجہ رنبیر سنگھ کی خدمت میں ۱۹۷۲ء بکرمی (م ۱۹۱۴ء) میں پیش کیا تھا۔ دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

"بزرگان احقر در زمان شہریاری چغتائیہ در کشمیر از نوی کار دانی قلم اختیار دیوانی افاغنہ وا زعہد قبول وار دیگر سلطانی بکف داشتند از بس اعتبار در بار و کاروبار بادشاہی اقتدار با اقتدار بیگذرانیدند۔"

اپنے بزرگوں میں چودھری بھیش اور نرائن بٹ کا ذکر کیا ہے جو مختلف حکمرانان کشمیر سے منسلک رہے تھے۔

اصل کتاب مہاراج گلاب سنگھ کے حالات سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ دیارام نے اس کتاب کو رنبیر سنگھ کے نام سے معنون کیا ہے۔ اسی لئے اس کا متبادل نام رقعات مہاراجہ رنبیر سنگھ تجویز کیا ہے۔ بخشی دیارام کا انداز فارسی کے قدیم منشیوں کا سا ہے۔ وہ مطلب سے زیادہ

عبارت آرائی میں گم ہو جاتے ہیں ۔

تمہید کتاب کے بعد مختلف عنوانات قائم کئے ہیں جن میں سے ایک مناظرہ دبیرو منشی بھی ہے ۔ اصل رقعات حسب ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کئے گئے ہیں :

صحیفہ اول :

القاب اول ۔ بجناب سری مہاراج صاحب مہاراجہ رنبیر سنگھ بہادر ۔

القاب دوم ۔ بخدمت دیوان صاحب فیاض دیوان کرپا رام ۔

القاب سوم ۔ متفرقہ برائے یاران و دوستان ۔

صحیفہ دوم :

برائے شہریار گردوں مدار مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر و شاہزادگان والا تبار ۔ خاتمہ قواعد و ضوابط انشا پر مشتمل ہے ۔

پنڈت راجاکول عرض بیگی دیری مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے ۔ وہ سرینگر کے ایک معزز خاندان سے تھے ۔ ان کے والد پنڈت رام چند کول مہاراجہ گلاب سنگھ کے عرض بیگی رہ چکے تھے ۔ اسی سے ان کا خاندانی نام عرض بیگی پڑ گیا تھا ۔ دیری کی ولادت ۱۸۲۸ء میں ہوئی ۔ باضابطہ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا انھیں موقع نہ مل سکا ، اس کے باوجود سرینگر میں اس وقت فارسی شاعری اور ادب کا جو ذوق پھیلا ہوا تھا ، اس سے وہ بھی متاثر ہوئے تھے ۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ۔ ان کا گھر والد کے برسر خدمت ہونے کے زمانے میں علما ، ادیبوں اور شاعروں کا مرکز بنا رہتا تھا ۔ چنانچہ دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

" اکثری از عالمان و فاضلان و اختر شناسان و شاعران و بذلہ گویان برای مصاحبت ایں احقر موجود بودند ۔

اپنی شعر گوئی کے آغاز کے سلسلے میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن کسی شاعر نے ان کے آگے یہ بیت پڑھی:

سکندر سد بمی بستی کہ نامش در جہاں ماند ۔۔۔ دو مصرع را تو انستی اگر بایکد گر بستن

یہ بیت سن کر معاً ان کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ:

"دنیا ناپائدار و رہ گذر است نامی در دنیا باقی ماندن غنیمت است از بہر فکر شعر پسندیدم۔"

والد کے بعد دیری ان کی خدمت پر مامور ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ وہ تحصیلدار بھی رہے، لیکن پھر مہاراجہ رنبیر کے یہاں عرض بیگی کی خدمت پر لوٹ آئے۔ وقائع نگار اور محکمہ خفیہ کے مہتمم بھی رہے۔ ان ساری مصروفیتوں کے باوجود اساتذہ فارسی کے دواوین کے مطالعے نے ان کے مذاق شعری کو شستہ بنا دیا تھا۔ انہوں نے اپنا دیوان خود مرتب کیا تھا، جس کا دیباچہ نثر میں لکھا ہے۔ دیوان میں غزلوں کے علاوہ مہاراجہ رنبیر سنگھ اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی مدح میں قصائد بھی شامل ہیں۔ کچھ تاریخی قطعے بھی ہیں۔ ان کے دیوان کو پروفیسر نندلال کول طالب نے ایک بسیط انگریزی مقدمہ کے ساتھ ریاست کے محکمہ تحقیقات اور اشاعت کی جانب سے شائع کیا ہے۔

دیری کا انتقال ۱۹۰۰ء میں ہوا۔

ان کی غزل کے کچھ شعر درج ذیل ہیں:

رخی چو ماہ کہ بی پردہ در جہاں گردید ۔۔۔ کہ پارہ پارہ دل ماہ چوں کتاں گردید

کہ شانہ زد بخم و پیچ زلف عنبر بار ۔۔۔ کہ مشک خیز چو صحرای چین جہاں گردید

شہ زمانہ جواں دولت و جواں بخت است ۔۔۔ کہ پیر چرخ پئے خدمتش جواں گردید

دیری کی ایک نظم جو کشمیر کے بارے میں ہے اس موضوع کی نظموں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ اس نظم کے چند شعر ذیل میں مندرج ہیں۔ جو احسن کی زمین میں

لکھی گئی ہے:

جہاں شگفتہ ز رنگ بہار کشمیر است — نگار خانہ چیں لالہ زار کشمیر است
سحر بہ باغ نشاطم نسیم صبح آورد — کہ آبروی جہاں شالمار کشمیر است
شنیدم از لب فوارہ بارہا یارب — کہ آب ریز بہشت آبشار کشمیر است
چرا بعہد گہہ کس سر فرو کند دیگر — غلام بار گہہ شہریار کشمیر است

قصاید کے علاوہ غزل میں بھی وہ موقع بہ موقع "شہریار کشمیر" کی مدح سرائی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے قصائد جو مہاراجگان کشمیر کی مدح میں ہیں اکثر اساتذہ فارسی کی تقلید میں لکھے گئے ہیں۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی مدح میں کہے ہوئے قصیدہ کے شعر ہیں:

براں سرم کہ نشیتم بزیر سایہ تاک — شراب ناب بپیا پی کشم بکاسہ خاک
دوم بدرگہہ پرتاپ سنگھ شاہ جہاں — بہ آرزوی شرف روی خود نہم برخاک

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے طبیب خاص محمد باقر جنہیں افسر الاطبا، کا خطاب ملا تھا۔ مہاراجہ کے دارلترجمہ میں طب کے تراجم کے نگرانکار تھے۔ اور طب یونانی کی عربی کتابوں کے فارسی اور ڈوگری میں ترجمے انھیں کی نگرانی میں ہوئے تھے۔

پنڈت بشن چندر دشن کول جو قمر تخلص کرتے تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ والی جموں وکشمیر کے عہد کے اچھے شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ مہاراجہ کی موت پر تاریخ کہی تھی:

چو رحلت کرد از دنیای فانی — شری رنبیر سنگھ والی کشمیر
شنیدہ چوں قمر ایں حال جانکاہ — پے تاریخ او شد عزم تحریر
بگفتہ سال رحلت از سر آہ — کہ شد ماتم ز جموں تا بہ کشمیر

رنبیر سنگھ کے عہد تک کئی اچھے خوشنویس منظر عام پر آئے۔ ان میں سے

امام ویردی، محمد تقی کشمیری اور احمد علی کشمیری کے قلم کے نمونے میرزا کمال الدین شیدا کے پاس محفوظ ہیں۔ امام ویردی کا ۱۲۷۵ھ کا مکتوبہ غنی کا یہ شعر ہے!

نامہ را چوں ز سر لطف فرستاد بمن — روشنم گشتہ کہ آں ماہ خطی پیدا کرد

محمد تقی کشمیری کے قلم کا نمونہ ۱۲۸۶ھ کا اور احمد کشمیری کا ۱۳۰۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔

گنیش داس نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی مدح سرائی میں ایک منظوم رسالہ لکھا تھا ابتدا نارائن کی حمد سے ہوتی ہے۔ مناجات اور تمہید کتاب کے بعد سخن کی تعریف میں کچھ شعر کہے ہیں، اور دنیا کی مذمت بھی کی ہے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی مدح جگہ جگہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے وزیر اعظم اور مہاراجہ کے بھائیوں کی بھی توصیف کی ہے۔ ایک عنوان "در بیان انجمن آرائی مہاراج پرتاپ سنگھ" کے تحت کہتے ہیں؛

کہ روزی آں مہاراج نکو بخت — نشستہ بود در کشمیر بر تخت

بگرداگرد او ہر ایک وزیری — بدند از بس جوانمردی دلیری

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے درباریوں میں سے چند کے نام لئے ہیں۔ پھر بتایا ہے کہ ایک قاصد خبر لے کر آیا کہ چلاس کی فوج نے کشمیر کی طرف کوچ کیا ہے۔ اس کے بعد چلاس کی فوج سے جنگ کی تفصیل لکھی ہے اور پرتاپ سنگھ کے فتح پانے کا ذکر کیا ہے۔ بیانات کے ضمن میں حکایات بھی لکھے گئے ہیں۔

پنڈت بیربل کول "سخنور" تخلص کرتے تھے۔ وہ سرینگر کے محلہ ٹنکی پورہ میں رہتے تھے۔ فارسی کی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند ہوئے اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ شعر کی ساری اصناف میں کلام سرانجام کیا ہے۔ وہ نثر بھی لکھتے تھے۔ سخنور نے مہابھارت کے بعض اجزا کو فارسی میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ حمد و ثنا کے تمہیدی حصے کو طویل منقبت کی شکل میں منظوم کیا ہے۔ جس کے چند شعر حسب ذیل ہیں:-

اے تاج بخش تخت نشینان روزگار — بر درگہ مقدس تو چرخ پردہ دار

لبریز از ثنائے تو گنجینۂ سخن — چوں سینہ صدف ز گہرہای آبدار

ایں گنبد فلک کہ کشیدست سر باوج — دیلیزۂ ز صحن جناب تو تنگبار

اسی زمین میں کوئی چالیس شعر سرانجام کئے ہیں۔ جس سے ان کی قادر کلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں مناجات ہے:

چوں ذرہ ام گرفت ز خاکم برادوج بر — ای آفتاب مطلع اعزاز و افتخار

میرزا مہدی پرتاپ سنگھ کے زمانۂ ولی عہدی میں انھیں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے عوام اور خواص میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ آخری عمر میں وہ مختل الحواس ہو گئے تھے ۱۸۹۵ء میں امیرا کدل کے قریب دریائے جہلم میں ڈوب جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ مہدی کو قصیدہ نگاری اور ہجو میں بڑی مہارت تھی۔ ان کے شعر کے تیور بڑے خوب ہوتے تھے۔ مثلاً ذیل کا شعر ملاحظہ ہو:

ز طمطراقِ بہار از برگ ریزی گل — شد است فرش زمیں آسمان اختردار

ان کا ایک اور شعر ہے:

از جای چو برجستی و جستی جگر ما — بستی کمر خویش شکستی کمر ما

کشمیر کی ایک اور اہم فارسی تاریخ حاجی محمد محی الدین مسکین نے لکھی تھی جو "تاریخ کبیر" کے نام سے موسوم ہے۔ اس تاریخ کی بنیاد اگلی تواریخ ہیں، تاہم مصنف کے عہد کے واقعات بھی اس میں شامل ہیں۔ خاص طور پر اولیائے کشمیر اور شعرا کے بارے میں کچھ مزید تفصیلات اس تاریخ سے دستیاب ہوتی ہیں۔

مسکین "تاریخ کبیر" کا آغاز کشمیر کے نام کی وجہ تسمیہ سے کرتے ہیں اور طوفانِ نوح میں سرزمین کشمیر کے زیر آب ہونے کا حال لکھنے کے بعد کشف رشی اور ستی سر کی عام روایت بیان کی ہے۔ اس حصے کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

"کشف نام عابدی کہ او در قبیرہ بہرہا وانند بزیارت معابد میرفت۔ چوں بکوہ شمیر رسید آنولایت خراب حال یافت سبب خرابی پرسید گفتند کہ جلد بود در میان ستی سرمی باشد ازاں جابرآمدہ آدمیاں رامیکشد و باز بہ آب فرو می رود۔ دل کشف را بدرد آمدہ بمدت ہزار سال در موضع نومیدن کہ مکانی است متصل ہیرہ پور کہ واقع در راہ شوپیان است عبادت میکرد۔"

باقی روایت وہی ہے۔ جو عام تواریخ میں مذکور ہے۔ تاریخ کا عام انداز بھی وہی ہے جو اور تاریخوں کا ہے۔ ۱۹۵۷ء بکرمی کے حالات پر تاریخ ختم ہوتی جو ۱۹۰۰ء کے مطابق ہے۔

پنڈت دیارام رینہ، شاد تخلص، سیدن گاؤں تحصیل بڈگام میں ۱۸۳۷ء (۱۸۹۵ء بکرمی) میں پیدا ہوئے تھے۔ فارسی کی مروجہ تعلیم ختم کرنے کے بعد ملازمت اختیار کی۔ لیکن جلد ہی ملازمت سے کنارہ کش ہو کر ایک مکتب جاری کیا، اور آخر تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ فارسی شاعری کے علاوہ مذہبی علوم سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ چنانچہ رامائن کے فارسی ترجمہ مہابھارت کو اکثر پڑھا کرتے تھے۔ شاد خوشنویس بھی تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۰۲ء میں ہوا

ان کے دو شعر ذیل میں درج ہے:۔

برقع ز عارض برنگن تا عالمی شیدا شود — بعضی زرد، بعضی زنو جمع زلب من از دہن
چوں در تکلم میروی از حیرتت گم می کنند — سوسن زباں، قمری فغاں، طوطی نوا، بلبل سخن

"کیفیت انتظام ملک کشمیر" کے عنوان سے پنڈت رام جو دسنے ایک کتابچہ مرتب کیا تھا جو ۱۸۰۰ء تا ۱۳۰۰ھ کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے مشتملات کی تفصیل کے بارے رقمطراز ہیں:

"برضمیر صاحبان عقل وفراست مخفی نماناد کہ مجموعہ ہذا مجمل و مختصر مشحون از کلی مطلوب یعنی حقیقت انتظامیہ کشمیر از ابتدائی عمل افاغنہ الی حال تالیف نمودہ بر سہ باب و ہر باب بر دو دو فصل ختم نمودم۔"

پہلے باب میں افغان حکام کے حالات، دوسرے باب میں سکھ دور کی تفصیلات اور تیسرے باب میں ڈوگرا راجاؤں کے زمانے میں ملک کے نظم و نسق کی تفصیل لکھی ہے۔

احمد میرانی سرینگر سے دس بارہ میل دور، گاندربل کے متوطن تھے۔ انہوں نے ۱۳۰۱ھ میں ایک طویل مثنوی "جواہر المنظوم" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے سبب تالیف کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دن احباب کا مجمع تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی استطاعت اور حوصلے کے مطابق گلفشانی کر رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ اس پر احباب نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کے لئے کہا:

مخلصاں گفتند آخر کم و بیش — در بیاں آور ز وسع ذہن خویش

پھر شاعر کہتا ہے کہ ان کے اصرار پر:

سر بفکرت بردہ با اخلاص دل — بہر در طلبی شدم غواص دل
گفت دل درہا کہ بودہ شاہوار — تاجراں بردہ پئے ہر شہریار
یک باقی ماندہ یک در یتیم — باش دلشاد و رہا کن ترس و بیم
قصص پیغمبراں مشہور ہست — بہر استخلاصت آں منشور ہست
گر توانی آں قصص منظوم کن — زبدہ قصہ ہاست آں منظوم کن

یہی دراصل "جواہر المنظوم" کا موضوع ہے، جس کو احمد میرانی نے عمدگی سے نظم کیا ہے، اور جگہ جگہ قرآنی آیتوں اور حدیثوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔

احمد میرانی شیخ احمد تارہ بلی کے مرید تھے ۔ مثنوی کے آغاز میں پیر کی مدح سرائی بھی کی ہے ۔

غلام احمد سوپوری نے بھی ایک مثنوی لکھی تھی ۔ جس کا زمانہ تصنیف چودھویں صدی کا اوایل ہے ۔ وہ حضرت شیخ حمزہ کے معتقدین میں سے تھے ، اور مثنوی انھیں کے فضائل میں لکھی ہے ۔ ایک شعر میں کہتے ہیں :

یافت چوں ہمنامی آں غازی نامی دیں   پہلوانی در جہاد نفس زور او شد است

حضرت شیخ کے ہم مسکن ہونے پر اس طرح فخر و مباہات کا اظہار کرتے ہیں :

کشور کشمیر او را مولد و مسکن شدہ است   مولد این مخلص او ہم ہمیں کشور شدہ است

پیر من حقانی است و ہست لازم پیرویش   زانکہ از بہر سلوک او است چوں مسطر شدہ است

ترقیمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس مثنوی کا جو مخطوطہ محکمہ ریسرچ میں محفوظ ہے ۔ انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے :

" الحمد للہ والمنتہ کہ کتاب مستطاب ہذا من ید اضعف عباد اللہ الصمد غلام احمد بن عبدالرحمٰن ابن عبدالغفور ساکن قصبہ سوپور بتاریخ سلخ شہر ذوالحجہ نقلم آمد ۱۳۰۸ھ "

عبدالنبی خانیاری کشمیر کے فارسی مورخین میں اپنا مقام رکھتے ہیں ۔ انہوں نے " وجیز التواریخ " کے نام سے کشمیر کی ایک فارسی تاریخ لکھی تھی جس میں ابتدا سے لیکر مصنف کے عہد تک کے حالات شامل ہیں ، دیباچہ میں اپنے اور تصنیف کے بارے میں کچھ باتیں لکھی ہیں ۔ اس حصے کا اقتباس ذیل میں درج ہے :

بندہ عاصی پر معاصی غلام محمد نبی معروف بہ شاہ ابن ملا انور بن ملا نظام الدین مفتی خانیاری چند کتب تاریخ مطالعہ نمودہ ... باوجود عدم استطاعت و قلت بضاعت دریں امر اقدام نمودہ مختصر و

Rekhta Download.com

موزوں بعبارت عام فہم .... دو تاریخ کشمیر ایں چند اوراق

ارقام نموده بنی بریک مقدمہ و دو قسم ساخت و دجیز التواریخ

نام نہاد ...."

اس تاریخ کا انداز اور اس کی ترتیب وہی ہے جو دوسری تاریخوں میں ملتی ہے۔
۱۳۱۱ھ کے واقعات پر تاریخ ختم ہوتی ہے۔

ملا صدر الدین عالم فقہ تھے، اور فقہ کے اصول اور مسائل پر ۱۳۰۸ء
میں "تحفتہ العابدین" کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔

ملا کے فرزند نور الدین بھی عالم تھے اور "نور البیان فی توضیح القرآن"
کے مصنف تھے۔ یہ قرآن کے مسائل کی توضیحات پر ایک اچھا رسالہ ہے۔

پنڈت بلبدر جیودر، بدر تخلص کرتے تھے اور مہاراجہ سری پرتاب
سنگھ کے عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ مہاراجہ کی مدح میں انہوں نے کچھ قصیدے بھی
لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ کا مطلع ہے۔

رسید موسم فصل بہار در کشمیر | بہ برگ عیش و طرب کرد عالمی تسخیر

یہ قصیدہ بہاریہ تشبیب سے شروع ہوتا ہے۔ مدح کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:

بہ درج اوج چو دُرّ یتیم بے ہمتا | بہ برج عرج چو مہر منیر در تنویر
بشرم حکمتش بسکہ آب شد دریا | گذاشت مصر ایں رو بہ قعر در کثیر
دبیر بارگہش وبدہ لعل پنڈت در | خمیدہ ہمچو کماں از خطش دمام تیر
علیم و فاضل و دانا دشعر داں و گزیں | فہیم، عاقل و بینا دل و نکو تدبیر

قصیدہ میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے متبنیٰ فرزند کی تعریف میں بھی شعر کہے ہیں۔

میر شاہد کے فرزند میرزا غلام محی الدین کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ان
کے فرزند میرزا سعد الدین اپنے عہد کے علما میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ فارسی

LIBRARY
IDARE-ADBIYAT-E-URDU
ACC. No 3.4.4... 283

اور اردو کے شاعر بھی تھے۔ لیکن ان کا زیادہ کلام اب محفوظ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی منظومات کا ایک مجموعہ "تحفہ سعد" کے نام سے ۱۳۲۰ھ میں مرتب کیا تھا جو ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا۔ یہی اب ان کے افکار سے باقی رہ گیا ہے۔ میرزا اسعد الدین سعد تخلص کرتے تھے۔ ان میں اور مولانا شبلی نعمانی میں گہرے مراسم تھے۔ چنانچہ مولانا شبلی جب کشمیر آئے تھے تو انہیں کے یہاں مہمان ٹھہرے تھے۔ کشمیر میں قیام کے زمانے میں شبلی بیمار ہو گئے جس کی وجہ سے انھیں یہاں سے جلد لوٹنا پڑا۔ صحت یاب ہونے کے بعد شبلی نے ۱۸۹۹ء میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جو "قصیدہ کشمیریہ" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ قصیدہ شبلی نے میرزا سعد الدین کے پاس بھیجا تو میرزا نے بھی ایک قصیدہ لکھ کر اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ سعد کے قصیدے کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:

گل بیانگ آمد و گلبانگ نشاطی برخاست — شاہد آرائش نائی و نئی و ساقی بنخواست

خامہ ئی آمدہ و نائی وی نامہ نگار — نامہ مشکی آمدہ و خامہ وی می پیماست

نامہ ئی نسخہ معجون مرکب آمدہ — زانکہ صفرا شکن و دافع رنج سوداست

شکر احباب کہ آمیختہ با شکوہ تب — شکر ئی بہر گوارا شدن تلخ دواست

او درآمد چو درین گلکدہ گل رخت بہ بست — گلہ از گل بودش شکوہ نہ از آب و ہواست

چارہ گر نبض ورا دیدہ بحیرت می گفت — کاین نہ بیمار بود بلکہ طبیب دلہاست

درد تنہائی و رنج سفر و فکر علاج — بہ ادائی کہ ادا کردہ جگر سوز اداست

گاہ چون بلبل دلگیر ز سیر کشمیر — در فغانست کہ گلگشت فضا رونق فضاست

آگے شبلی کے علم وفضل کی توصیف کی ہے۔

شبلی اے جان معانی، بلقب نعمانی — کہ بود والد تو والد رشید است

یہ قصیدہ شبلی کے لئے بہترین تمناؤں اور دعاؤں پر ختم ہوتا ہے۔

شبلی نئے عہد میں ادب اور شاعری کے نئے تصورات کے علمبرداروں میں سے تھے۔ مسلمانوں کے مادی سے زیادہ ذہنی احیا کی انھیں خواہش تھی اور شبلی کا یہ اثر کسی حد تک سعد پر بھی پڑا تھا۔ چنانچہ "تحفہ سعد" میں ان کی دو نظمیں "انتخاب نوحہ بہ تاثر کشمیر" اس تاثر کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس نظم میں سعد نے کشمیر کے مسلمانوں کے ذہنی انحطاط پر مرثیہ خوانی کی ہے، کہتے ہیں:

نہ آں مہر و محبت نہ حمیت در مسلماناں
کہ در کشمیر بودہ پیش در عہد مسلمانی

عہد اسلامی کے مسلمانوں کے علم و فضل اور اخلاق کا ذکر کرنے کے بعد اپنے زمانے کے مسلمانوں کی حالت کی کچھ تفصیل بتاتے ہیں کہ عظیم مقاصد اب ان کی نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلاف تنازع کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

گہی بر غسلخانہ متفق کایں بہتر از مسجد
بما فرض است تعظیمش بما واجب نگہبانی

چو از سیلاب شد غرق و شکست و ریخت پس گفتیم
کہ آں جای نحس بودہ تماشاگاہ عریانی

گہے اوقاف مسجد را چو میراث پدر دانیم
برای ہضم آں صد حجت آریم از کتب دانی

قصیدے میں اپنے زمانے کے علما، پیشوایان دین اور شعرا سب پر تعریض کی ہے۔ اور اس کے لئے معذرت خواہ ہیں کہ:

شکایت کردہ ام در نوحۂ اول زمیر و پیر
خدا شاہد ز حب قوم نہ ز اغراض نفسانی

عظمت گذشتہ کی یاد پر یہ نوحہ ختم ہوتا ہے۔

"تحفہ سعد" میں سعد کی اردو نظم کا عنوان "کشمیر کا دلچسپ فوٹو" ہے شعر میں غالب کی طرح اپنی فارسی دانی پر اس طرح فخر کرتے ہیں:

آج اردو میں لکھا ہے حال کچھ کشمیر کا
گو زبان فارسی پر سعد کا ہے افتخار

اسی مجموعے کی دوسری نظمیں مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات، قصیدہ در نعت، غزل، الوہم پادشاہ کی فتح کی تاریخ اور ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر مرثیہ قابل ذکر ہیں۔ "تحفہ

ذیل کے قطعہ تاریخ پر ختم ہوتا ہے:

مخزن نعت و مناجات و قصائد چوں دید | گفت ہاتف پی سالش کہ "دل شعر و سخن"

میرزا اسعد الدین کا انتقال ۱۹۰۲ء میں ہوا۔

خواجہ سیف الدین شال نے ۱۳۲۰ھ میں ایک رسالہ "گلدستہ بے نظیر" کے نام سے منظوم کیا تھا۔ اس میں ایک کشمیری داستان نظم کی ہے۔ کچھ کلام فارسی بھی ہے۔ نظم کی ابتداء فارسی اور کشمیری آمیز اشعار سے ہوتی ہے۔ چند شعر ہیں:

ذاکر بنام خدا ابتدا | تہندا ابتداہی بجز ابتدا

سو بے مثل و مانند و بی کیف و کم | سو خلاق عالم بنور قدم

بیک رمز قدرت کیا آشکار | زمین و زماں و خزاں و بہار

آخر میں کہتے ہیں:

بحمد اللہ ایں مثنوی بس متیں شد | کہ بر خاتم شعر ہمچو نگیں شد

مفرح چہ بس دلکشا در لطافت | بشیرینی شعر چوں انگبیں شد

بہ یوہ سر و ہم بشمار سالش | عجب گلستاں ہمچو گلزار چیں شد

ایک مختصر نظم شہر آشوب کے انداز کی بھی اس میں شامل ہے۔ جس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

دگر گونہ چوں دور چرخ بریں شد | طبایع مخالف ز اہل زمیں شد

ریاست باہل خباثت مسلم | شرافت نہاں از کمال و کمیں شد

ایک طویل قطعہ میں محلہ گنپت یار میں ہولناک آتش زدگی کا حال نظم کیا ہے۔ اس نظم کا ایک شعر ہے:

گشت پیدا آتش پر سوز از ایک خانہ | تا حسام نیستاں حالی ز گنپت یار شد

اس مجموعہ پر ان کے فرزند غلام محمد نے اردو میں ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اس کا اقتباس

حسب ذیل ہے:

"یہ کتاب قلمی موسوم بہ گلدستۂ بے نظیر میرے والد مرحوم و مغفور خواجہ سیف الدین صاحب شالبافی نے ۱۳۲۰ھ میں کسی خوشنویس سے تحریر کرائی ہے ..... صاحب ممدوح ۱۳۲۵ھ آخر رمضان کو انتقال کر چکے۔"

آگے لکھتے ہیں ان کے انتقال پر شعراء نے مرثیہ لکھے تھے اور قطعات تاریخ کہے تھے۔ ان میں سے منشی امیرالدین "ملک الشعرا" کی حسب ذیل تاریخ نقل کی ہے۔

چل دیا جب سیف باغ عیش سے　　　اب محمد کو یہاں لاکر بٹھا کہنے کو ہیں

میرزا جلال الدین۔ جو میرزا احد کے پوتے اور میرزا بدرالدین کے فرزند تھے فارسی کے خوش گفتار شاعر تھے۔ وہ غزل بھی کہتے تھے۔ لیکن ان کی مثنوی "حسن و گوہر" کلاسیکی انداز کی اچھی مثنوی ہے۔ میرزا جلال الدین ریاست کے محکمہ مال میں ملازم تھے۔ ان کا انتقال کم عمری ہی میں ہو گیا۔ انتقال کا سنہ ۱۹۱۱ء ہے۔ وہ میرزا تخلص کرتے تھے۔ مثنوی "حسن و گوہر" کشمیر کی سرزمین سے متعلق ایک قصے پر مشتمل ہے۔ آغاز قدیم مثنویوں کی طرح حمد اور نعت سے ہوتا ہے۔ نعت کا وہ حصہ جو معراج کے بیان سے متعلق ہے، مثنوی کے اچھے پاروں میں سے ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

شبی روشن تر از خورشید خاور　　　از آں نوری گرفتہ ماہ و اختر

براق کی توصیف میں کہتے ہیں:

دمش چوں زلف محبوباں مسلسل　　　دمش عطری پر اتش لبس مکلل

براق کی تیز رفتاری میں کئی شعر کہے ہیں:

تگاور نہ صبا رفتار ابری　　　بزور و شور چوں غراں ہزبری

نگار درنہ یکی معشوق طناز | بصد آرائش وزیب و بصد ناز

کشمیر کی توصیف میں بھی کئی شعر کہے ہیں۔ چند شعر یہ ہیں:

خوشا کشمیر و خوشتر کوہسارش | طراوت بخش جانہا لالہ زارش
کنار آب ڈل دامان کہسار | بہشت آسا بہر سو باغ و گلزار
بشاخ آں درختان پر از گل | نوای قمری و دراج و بلبل
گل بادام کردہ گلفشانی | بفرق عاشقاں از مہربانی

داستان کشمیر کے ایک نوجوان کی ہے، جو شالامار میں ایک حسینہ گوہر کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس کی حالت جدائی میں تباہ دیکھ کر اس کا ایک دوست احمد، گوہر کے گھر کا پتہ ڈھونڈ نکالتا ہے اور دونوں میں ملاقات کی صورت پیدا کرتا ہے۔ اس ملاقات کے بعد نوجوان عاشق کی حالت اور بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ وہ راتوں کو چھپ کر گوہر کے مکان کو جاتا ہے اور بالا خانہ کے نیچے کھڑے ہوئے اس کی گوہر سے گفتگو ہوتی ہے۔ گوہر کا باپ، جو ایک رئیس ہے، صبح نماز کے لئے مسجد کو جاتے ہوئے انھیں گفتگو دیکھ کر ناراض ہوتا، اور شحنہ شہر کے پاس پکڑ کر لے جاتا ہے۔ احمد شحنہ کو رشوت دے کر دوست کو رہائی دلاتا ہے۔ باپ بدنامی کے ڈر سے ایک اور نوجوان کے ساتھ گوہر کی شادی طے کرتا ہے۔ لیکن عین شادی کے دن وہ غم سے ہلاک ہو جاتی ہے۔

قصے کے خاکے میں دلچسپی نہیں ہے۔ تاہم میرزا نے گوہر کے سراپا کا نقشہ کھینچنے میں بڑی چابک دستی دکھائی ہے۔ کچھ رسموں کی تفصیل اور دلہن کی آرائش کا بیان بھی دلچسپ ہے۔ سراپا کے کچھ شعر یہ ہیں۔

قد بالا بلای جان عشاق | برعنائی چو شیریں شہرہ آفاق
جبینش لوح سیمین جہاں تاب | ز نور افشانیش خورشید بیتاب
لبش لعل یمن یاقوت جان است | مجوب درخندہ کان گوہر فشان است

میرزا غزل بھی کہتے تھے، لیکن ان کی غزلیں عام طور پر نہیں ملتیں۔ مثنوی میں کئی غزلیں موقع بموقع آ گئی ہیں۔ ایک غزل کے شعر ہیں:-

درگلستاں چشم میگونش بتاک رز فتاد | زاں زمیخانہ بروں آید برنگ گل شراب
چوں شدہ مداح رویش میرزای خوش کلام | از سخن گفتن زباں بستہ بلیر فاریاب

پنڈت تارا چند ترسل ٗ سالک ٗ، میرزا جلال الدین کے ہم صحبتوں میں شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور انشاپرداز بھی تھے۔

خواجہ امیر الدین ٗ امیر ٗ فارسی، اردو اور کشمیری تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اسلامیہ ہائی سکول میں فارسی اور اردو کے مدرس اول رہے۔ اور بہت سے نوجوانوں کی علمی تربیت کے ساتھ ساتھ ذوق شعر و سخن کی بھی تربیت کی۔ امیر کی طبیعت میں بہت روانی تھی اور بہت تیزی سے شعر کہتے تھے۔ مزاح کی طرف زیادہ مایل تھے۔ انجمن نصرۃ الاسلام سرینگر کے سالانہ جلسوں میں ان کی فارسی، اردو، کشمیری اور کبھی کبھی ان تینوں زبانوں کی ریختہ، آمیختہ نظمیں پڑھی اور شوق سے سنی جاتی تھیں۔

ملا حبیب اللہ حبیب بھی اس دور کے طباع شاعروں میں سے تھے، وہ فارسی اور کشمیری میں شعر کہتے تھے اور کبھی کبھی فارسی اور کشمیری ریختہ بھی کہتے تھے جیسے کہ ذیل کے اقتباس سے اندازہ ہوگا۔

دوش می داہمی ستو دم مسن | زاہد خشک سنج ترچہ داود ھیس[۱،۲]
آری از غصہ سرلبنگ زند | وصف خوبی اگر کینم یچھس[۳]
گفتم ای انکہ کز دو روزہ نماز | اعتقاد لیست مراترا بوچھس[۴]
زیں سخن ہای بی ریای حبیب | منفعل گشت جاچہ ماچہ بوچھس[۵]

پنڈت دودھ لعل درطالع، نہا نند جو در پنڈت کے بیٹے تھے، اور مہانند در

---

۱ کوٹنا ۲ سینہ ۳ ایک بدصورت جانور ۴ میں ہوں ۵ لب خشک ہونا

میر و پنڈت کی اولاد میں تھے۔ جو جہاں گیر کے عہد میں فوج اور نظم کے ذمہ دار عہدہ پر فائز ہے تھے۔ میر و پنڈت نے دکن کی مہمات میں بھی حصہ لیا تھا۔

طائع غزل اچھی کہتے تھے اور انداز میں پختگی تھی۔ ان کے دو شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:

جلوہ حسن رخ یار بود قاتل ما | ہچو پروانہ بہ شمع رخ جانا سوزم
عوض سبزہ دمد شعلہ آہ از گل ما | بس کہ سرگرم فغانیم پس از مردن ہم

میر غلام محمد مختار حبیب اللہ کاملی کے فرزند تھے۔ یہ خاندان خطاطی اور شاعری میں شہرت رکھتا تھا۔ مختار نے بھی علم اور خطاطی میں اپنے خاندان کی روایات کو برقرار رکھا۔ جغرافیہ اور ریاضی میں بھی انھیں مہارت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے علم ریاضی پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ اخلاق اور تصوف پر ان کی ایک ضخیم مثنوی کا ذکر محمد الدین فوق نے کیا ہے۔ وہ غزل بھی کہتے تھے۔ لیکن بہت کم جو غزلیں کہیں ہیں ان میں اساتذہ کے کلام کی سی پختگی ملتی ہے۔ ان کے چند شعر ہیں۔

دستی نیافت بر سر آبروی ما | نشکستہ است سنگ ملامت سبوی ما
ورنہ صبا چہ دم زند از جستجوی ما | آفت تعلق است رمیدن نمی دہد

مختار کا انتقال ۱۲۲۶ھ میں ہوا۔

پنڈت لچھمی رام سرینگر کے سوامی کیلاش کول جی کے معتقدین میں سے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں سوامی جی کا انتقال ہوا۔ پنڈت لچھمی رام نے ان کی رحلت پر کئی تاریخیں کہی تھیں۔ ایک رباعی ذیل میں درج ہے:

لالہ ہمہ خون دیدہ در دامن کرد | در ماتم او دہر بسی شیون کرد
قمری بمذ سیاہ در گردن کرد | گل جیب قبای ار غوانی بدبد

تاریخ وفات "در ساخت چو کیلاس بہ کیلاس نشیمن" سے نکالی گئی ہے۔

کشتواڑ کے راجہ محمد تیغ سنگھ کے ملک الشعرا حافظ نصرالدین ناصر کا تذکرہ دور افاغنہ کے سخن سنجوں میں کیا گیا ہے۔ ان کے دونوں فرزند حضرت ضیاء الدین ضیائی اور حافظ محمد الدین فارسی اور عربی کے عالم اور فارسی اور اردو کے اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ ضیائی کی کئی تصانیف بھی ہیں۔ جن میں "روضتہ العارفین" بقول عشرت کشتواڑی ایک "معرکتہ الآرا" تصنیف ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ "کلیات ضیائی" کے نام سے موسوم ہے، جس میں فارسی اور اردو کا کلام شامل ہے۔ آپ کے صاحب زادے حکیم غلام محی الدین محی بھی مصنف اور شاعر تھے۔ ان کے کلام کا بھی مجموعہ "کلیات محی" کے نام سے مرتب ہوا ہے۔ ان کی تصنیف "تاریخ کشور" اہمیت رکھتی ہے۔ کشتواڑ کی تعریف میں محی کی ایک نظم کے کچھ شعر ہیں۔

خوشا دلکش دیار کشتواراست | بہر ماہ نوش جام صد بہاراست
ز چوگاں بلکہ خوش بستان جنت | ز سور بجاں بساطش زرنگاراست
بہر سو نرگس بیمار مخمور | مسیحا دم صبا بیمار داراست

چوگان، کشتواڑ کے ایک مرغزار کا نام ہے، جس کا ذکر شیوجی کی "تاریخ کشتواڑ" کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ محی کی وفات ۱۳۳۷ھ میں ہوئی۔ ان کے صاحبزادے بہاءالدین بہا بھی فارسی کے اچھے شاعر تھے، لیکن والد کے انتقال سے ایک سال پہلے ہی ان کی وفات ہو گئی۔ مرغزار چوگان کی توصیف میں ان کی نظم کے چند شعر ہیں:

بجا گویم کہ چوگان الحق جنت | میان مرقد شاہنشہان است
چو رشک ایمن است چوگان دلکش | تجلی گاہ فیض مردان است
بہائی در پناہ شاہ اسرار | گدا ہم یہ صاحب قران است

پنڈت ہری کول ہری تخلص، ۱۸۵۷ء میں سری نگر میں پیدا ہوئے تھے۔ فارسی کی تعلیم اس زمانے کے مشہور عالم پنڈت ٹھاکر بھان سے حاصل کی طبیعت

کو معرفت سے لگاؤ تھا۔ کہتے ہیں کہ چودہ برس کی عمر میں انھیں للہ عارفہ کا درشن عالم مستی میں ہوا، وہ گھر سے کارہ ہامہ گاؤں کی طرف نکل گئے اور وہاں دو سال تک لشکر ناگ پر دھیان گیان میں مستغرق رہے۔ یہاں ایک رات خواب میں شری کمار جی کے بھی انھیں درشن ہوئے۔ انھوں نے ایک کتاب عطا کی اور اسے پڑھنے کی ہدایت کی۔ اس وقت سے وہ شعر کہنے لگے۔ پرگوئی کا یہ حال یہ تھا کہ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر بہت سا کلام سرانجام کر لیتے تھے۔ کلام دیوان کی صورت میں ترتیب دیا تھا، لیکن وہ تلف ہوگیا۔ جب شعر سے لگاؤ پیدا ہوا تو انھوں نے فارسی کے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا۔ چنانچہ مثنوی میں وہ نظامی کا اور قصیدہ میں قاآنی کا تتبع کرتے تھے۔ بعض وقت زبان میں تصرف بھی کر جاتے تھے۔ اور بہت تکلف اور تصنع سے کام لیتے تھے۔ ہری نے عربی میں بھی صلاحیت پیدا کرلی تھی۔ پنڈت ہری کچھ عرصہ گلگت اور جموں میں بھی ملازمت کے سلسلے سے مقیم رہے۔ پھر ملازمت ترک کردی۔ ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔

ہری کول نے گل بکاولی کی داستان کو "گلشن عشق" کے نام سے منظوم کیا تھا۔ بکاولی کا سراپا بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

دلبرِ دلکش و دل آرامی　　گل بر و گل رخ و گل اندامی

وہ چہ پیشانیش بحسن و جمال　　صبح نوروز بدر چرخ کمال

آگے اسی طرح اس کے ہر عضو کی تعریف میں موشگافیاں کی ہیں۔ بہار، باغ اور صبح کا سماں خوب کھینچا ہے۔ اور عشق کی تعریف بھی کی ہے۔ ان کی کبھی کبھی کی بے راہ روی میں بھی ایک آن ہے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی مدح میں ان کے قصیدے بھی ملتے ہیں ایک قصیدہ عرفی کی زمین میں کہا تھا جس کا مطلع یہ ہے:

چوں صبح خون تیرہ شب از تیغ بیضا ریختہ　　گردون گرواں بر سرش عنفر یار یختہ

خواجہ شاہ نیاز اچھے شاعر تھے زبان اور اظہار پر انھیں بڑی قدرت تھی ان کے دیوان کے صرف چند اجزا ریسرچ لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اس میں غزلیں ہیں اور زیادہ تر تصوف اور معرفت کے گہرے نکات سے پر ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں بھی غزلیں لکھی ہیں۔ کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

بر چہرہ تو نقاب تا کی — بر چشمہ نور سحاب تا کی
بر دیدہ ما حجاب از ما ست — در ما و تو ایں حجاب تا کی

عاشق بہجر منم من نہ منم نہ من منم — عارف باہنر منم من نہ منم نہ من منم
سوز دل و جگر منم وحشت پردہ در منم — دانش بخبہ گر منم من نہ منم نہ من منم

من آں نورم کہ اندر لامکاں موجود بودستم — باشراق خودم خود شاہد و مشہود بودستم
ہیولائی دو عالم مادہ ارواح و اشباحم — حریر جسم و جاں را بچہ تار و پود بودستم
لباس بوالبشر پوشیدہ مسجود ملک گشتم — بہ تصویر محمد حامد و محمود بودستم
نیاز اندر حقیقت لایزال و لم یزل ہستم — مگر با ایں تعین نیست و نابود بود ہستم

خواجہ سید سعد الدین نقشبندی، خواجہ عبدالرحیم کمان کے مرید اور پیر عبدالرشید شہید کے فرزند تھے۔ والد کی شہادت کے بعد خواجہ کمان کی روحانی تربیت کی مدد سے وہ بھی روحانی مرتبوں تک پہنچ گئے اور خود ارشاد و ہدایت کا مرکز بن گئے۔ شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق رکھتے۔ ذیل کے شعر ان کے کلام کا اقتباس ہیں:

ہر جا کہ آید عشق تو ویراں نماید خانہا — گویا کہ بہر خویش گنج جا کند ویرانہا
از غازہ تا افروختی آں شمع روی خود بتا — سوزند جہاں ہا گرد تو از شوق چوں پروانہا
تا بت پرستی کردہ من بر خویش سید در جہاں — ہر جا کہ بینی رفتہ وز و آباد شد بتخانہا

چند سازی گلہ از بخت و کج فو دستید کہ ترا از کف دلدار گذشت آنچہ گذشت

خواجہ کا انتقال ۱۳۱۲ھ میں ہوا

خواجہ محمد شاہ نقشبند جن کا انتقال ۱۳۴۵ھ میں ہوا، صاحب دیوان شاعر تھے اور خواجہ محمد امین داراب کے بقول شاعر پرور بھی تھے۔ خواجہ رسول شاہ اور حاجی مختار شاہ اشائی سے ان کے قریبی رشتے تھے۔ خواجہ محمد شاہ اسعد تخلص کرتے تھے۔ اور ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ دیوان غزلیات، قصاید نعتیہ، اور منقبت پر مشتمل ہے۔ غزل اچھی سرانجام کرتے تھے۔ حافظ کا ان پر بہت اثر تھا اکثر غزلیں حافظ کی زمینوں میں کہی ہیں۔ ان کی غزل کے چند شعر ذیل میں منقول ہیں:

بیا کہ میکنمت جاں فدا بہ آں عارض کہ ہست دعوی مہر و وفا باں عارض

مکن تو عیب ز دیوانگی باد ہرگز شد است اسعد ما مبتلا بہ آں عارض

ای کہ از گریہ افغاں اثری نیست ترا مگر از حال خرابم خبری نیست ترا

خوں شدم گرچہ نہ بجراں و ندانم چہ کنم ایں چنیں حال نزارم نظری نیست ترا

سینہ حسن بت کشمیر چو از مژگان کشد لشکر کشد ترکان غارت گر کند مشہد بخارا را

ایک نظم اسعد نے "نوحہ کشمیر" کے عنوان سے بھی لکھی تھی۔ جو انگریز وائسرائے کی کشمیر میں آمد کے موقع پر کہی تھی۔ اس میں نراین داس کے مظالم کی شکایت کی ہے۔

بنا شد اختلاف مذہب و ملت شہاں را مانع احساں اگر در قدرتی یکساں نمودہ لطف یزدانی

ولی در شہر ما شاہا، چرا شد بر خلاف این نراین داس فرمدن ہم نمی خواہد مسلمانی

حقوق اہل اسلام از کفش یکسر شدہ زائل بغیر از آریہ ہرگز نسازد کس ثنا خوانی

پنڈت موتی رام منشی فراق کا تذکرہ "بہار گلشن کشمیر" میں کشمیری پنڈت

شعرا میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ انکا خاندان کہاں مقیم تھا۔ فراقؔ کے خاندان میں شعر سخن کا ذوق موروثی تھا۔ چنانچہ ان کے پوتے پنڈت اجودھیا پرشاد مبتلاؔ فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ فراقؔ کا فارسی کلام ملتا ہے۔ ان کی ایک غزل کے کچھ شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

اے ز روے تو گل تر در کنار آئینہ را　　دی ز مژگان تو در دل خار خار آئینہ را
بسکہ در ہجراں او رومی خراشد در الم　　زخم ناخن گشتہ جوہر در کنار آئینہ را
تا چہ سازد با دل زار فراقؔ ناتواں　　آں کہ کرد از سایہ مژگان فگار آئینہ را

پنڈت دینا ناتھ بدن متخلص بھی خوشگو شاعر تھے۔

بے رام پنڈت گھڑیالی، عیاشؔ، سرینگر میں طوس مسجد کے قریب رہتے تھے اور عدالت میں اہلکاری کی خدمت پر مامور تھے۔ فارسی میں کافی کلام چھوڑا ہے۔ غزل کے کچھ اقتباس درج ذیل ہیں:

گل روے تو دیدنم ہوس است　　خار از دل کشیدنم ہوس است
پیرہن دوختنی عبث ناصح　　کہ گریباں دریدنم ہوس است
خیز عیاشؔ ہمرہ ما شو　　کہ بجاناں رسیدنم ہوس است

دلا بہ درد فراقش بگو چہ چارہ کنم　　ہمیں بس است کہ سویش یکی نظارہ کنم
اگر بنالہ در آیم ز سستی طالع　　اثر درون دل سخت سنگ خارہ کنم

پنڈت گنگا بشن منصورؔ کا سرینگر کے محلہ بھابنہ میں قیام تھا ان کی کچھ غزلیں اور قصائد فارسی میں ملتے ہیں۔ ان کا سنہ ولادت معلوم نہیں ہوتا۔ مرتبین "بہار گلشن کشمیر" نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ ان کا انتقال بہتر برس کی عمر میں ہوا۔ ان کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

پیرِ مغاں بگوشِ من گفت بہ ہر دری مرو   ہر چہ طلب تو می کنی ہست بما زما طلب

نیست جُز دامنِ صحرا جای   دل پسند ایں دلِ دیوانہ را

کشمیر کے ایک مشہور صاحبِ ذوق علم دوست خاندان کے مختلف افراد نے مختلف زمانوں میں علم وفضل اور شعر وادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں۔ خواجہ محمد امین دارالب جن کا ذکر اگلے باب میں آرہا ہے، اسی خاندان سے ہیں۔ خواجہ سعدالدین سائلؔ انھیں کے اسلاف میں سے تھے۔ سائل پیشہ ور شاعر نہیں تھے، لیکن ان کا ذوقِ شعر پاکیزہ تھا۔ اس خاندان میں پشمینہ کی تجارت سالہا سال سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آتی ہے۔ سائل کی تجارتی کوٹھیاں بھی برطانیہ اور فرانس میں قائم تھیں۔ خواجہ عزیزالدین عزیزؔ، جن کا ذکر خواجہ امین دارالب کے سلسلے میں آیا ہے، سائل کے چچیرے بھائی تھے۔ اس خاندان کی سعی سے مشہور زیارت گاہ حضرت بل کی توسیع ۱۲۸۶ھ میں عمل میں آئی تھی۔ عظیم الدین اس کے نگران تھے۔ سائل نے تاریخ کہی تھی :-

چو شد ساعی عظیم از راہِ اخلاص   دو چندیں یافت وسعت مسجد خاص

پَیِ اتمام تاریخش، سخندان   شمردہ "وسعت مسجد" دو چنداں

تاریخ گوئی کا سائل کو خاص ملکہ تھا۔ انھوں نے ایک شہر آشوب بھی لکھا تھا اور ایک طویل ترکیب بند، سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی کے موقع پر لکھ کر، ان کی خدمت میں قسطنطنیہ روانہ کیا تھا، جس کا مادہ تاریخ حسبِ ذیل ہے :-

دل ز سر جہد یافت سالِ جلوسِ سعید   تکیہ زد عرش مجید باد بسلطان حمید

ان کی غزل کے شعر ہیں :

بہار زندگی بود جمال یار در نظر   بط مئی و شرط بہت خط نگار در نظر

نہ ساقی شراب زن بسوز سینہ آب زن   نہ مطربی رباب زن دریں بہار در نظر

نہ دل نہ صبر یا الگن نہ دلفریب زیں چمن   نہ غم کنارہ جُز ز دل نہ غمگسار در نظر

۱۲

موجودہ دور

کشمیر کے نئے عہد میں قدم رکھنے کے بعد، نظم و نسق کے اہتمام کے لئے انگریزی کی تعلیم و تربیت کی ضرورتوں نے، انگریزی کو جب اہمیت بخش دی تو فطرتاً فارسی علم و ادب کا ذوق گھٹنے لگا، اور فارسی شاعری سے بھی لوگ کم دل چسپی لینے لگے۔ پنڈت ادیبوں اور اہل قلم میں سے اکثر، انگریزی میں لکھنے کی طرف مایل ہوگئے اور ہندوستان کے اور حصوں کی طرح کشمیر میں بھی اکثر فارسی کے ادیب اور شاعر، اردو میں اظہار خیال کو ترجیح دینے لگے۔ اس طرح موجودہ عہد میں فارسی میں شعر کہنے یا تصانیف سرانجام کرنے کے محرکات بہت کم ہوگئے ہیں۔ تاہم اس دور میں بھی کشمیر کچھ بلند پایہ سخن سنجوں سے بالکلیہ خالی نہیں ہے۔ ان میں پیر شمس الدین حیرت کاملی، اور محمد امین داراب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شاعری کے علاوہ، تصنیف و تالیف کے لئے بھی کبھی کبھی فارسی کے کلاسیکی واسطے سے کام لیا جاتا ہے۔

لیکن جہاں تک فارسی زبان کی تعلیم و تدریس کا تعلق ہے، موجودہ عہد میں اس کی نئی تنظیم وقت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ریاست کے اسکولوں اور کالجوں میں فارسی تعلیم کی نئی تنظیم عمل میں آئی۔ ایک اور اہم بات یہ ہے، کہ گذشتہ ادوار میں، فارسی کشمیر میں کلاسیکی اسالیب کے ساتھ رائج رہی تھی لیکن اس دوران میں خود ایران میں فارسی زبان، اسالیب اور اصطلاحوں میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان اور کشمیر کے سرمایہ سے استفادہ کے لئے کلاسیکی فارسی پر دستگاہ لازمی ہے، تاہم اس کے جدید اسلوب سے بھی علماء اور طلبا کا واقف رہنا ضروری ہے۔ اس لئے فارسی جدید سے بھی علما اور طلبہ فی الجملہ آگاہی حاصل کر رہے ہیں۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ جہاں تک ادب اور شاعری کا تعلق ہے یہ عہد بھی چند اچھے شاعروں اور ادیبوں سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ مولانا شمس الدین حیرت کاملی اور مولانا محمد امین داراب کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

مولانا شمس الدین حیرت کاملی، موجودہ عہد کے فارسی شعرا میں، اپنی فکر کی تازگی، جدید رجحان کے شعور اور زبان اور انداز بیان پر استادانہ قدرت کی وجہ سے، ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ کاملی خاندان کو فارسی کے علاوہ عرفان اور تصوف سے جو لگاؤ رہا ہے، اس کا وافر حصہ، پیر شمس الدین حیرت کو بھی ملا ہے ان کے والد میر غلام محمد مختار کا ذکر پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے۔ پیر شمس الدین بھی عربی اور فارسی کے عالم ہیں۔ موسیقی اور عروض میں بھی انہیں مہارت ہے۔ ان ہمہ جہتی صلاحیتوں کے ساتھ وہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی ولادت سرینگر کے محلہ پانڈان میں ۱۳۰۷ھ میں ہوئی۔ اسی لئے اپنے نام کے ساتھ "پانڈانی" بھی لکھتے ہیں۔

پیر شمس الدین کئی اہم کارناموں کے مصنف ہیں۔ اپنے اور اپنے معاصرین کے حالات میں ان کی مثنوی "فسانۂ حیرت" جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے، اپنے عہد کے حالات کے علاوہ، اخلاق، تصوف اور شعری محاسن کا ایک یادگار کارنامہ ہے، جسے محمد الدین فوق نے "چودھویں صدی کی ڈائری" سے موسوم کیا ہے۔ اس کے علاوہ دو اور مثنویاں بھی انھوں نے لکھی ہیں، جن میں سے ایک "نیرنگ حیرت" کے نام سے موسوم ہے اور دوسری "قانون صحت"۔ کشمیری زبان میں بھی وہ شعر کہتے ہیں۔ چنانچہ چند قومی نظموں کے علاوہ ایک مثنوی "رعنا زیبا" کشمیری حلقوں میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور کئی بار چھپی ہے۔ کشمیری میں ان کا ایک اور اہم کارنامہ مولانا جلال الدین رومی کی "مثنوی معنوی" کا منظوم ترجمہ ہے۔

فارسی میں پیر صاحب کا ایک اور کارنامہ "شاہ نامہ بڈشاہی" جو سلطان زین العابدین بڈشاہ کے حالات میں ہے، ایک یادگار کارنامہ ہے۔ غزل میں ان کی طبیعت رواں ہے، اور اساتذۂ قدیم کے معیاروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، غزل میں وہ جدید عصر کے رجحانات کی بھی بڑی خوبی سے ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی چند غزلوں سے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

ای بدور چشم تو میخانہ نرگس خراب — جام و ساغر در خمارستاں تو در دِ شراب
صبح شب ہای وصالت اول شام غم است — صبحدم پیدا و پنہاں شد ز چشم آفتاب
حسن تا شد جلوہ آرا عشق آمد اشک ریز — ابر گردد دُر فشاں تا برق باشد مے سحاب
حیرت از گلزار حسن کیست گل چین بہار — می چکد از ساغر چشمش چنیں سیل گلاب

حیرت کی غزل میں رسمیت بھی، ان کے مشاہدات میں مبدل ہو جاتی ہے اس کا اندازہ اوپر کے اقتباس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ صنائع کا

استعمال بھی وہ بے تکلفی سے کرتے ہیں، جس سے شعر میں حسن صناعی کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ ذیل کا اقتباس اس سلسلے میں، ان کی فکر کے اس پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ کہتے ہیں:

گلی دارم بہار آرا کہ ایمن از خزاں دارد
بخط سنبل، بخند نسرین، بقد سرو رواں دارد
ز قد و کاکل پیچیدہ در خسار زیبائش
صنوبر پا بگل، خم سنبل و خوں ارغواں دارد
بہ شمس از عشق و شوق و ہجر و درد و جور و یاد او
سرشک و آہ و سوز و نالہ و شور و فغاں دارد

ذیل کے اقتباس میں زبان کی روانی، خیال کے تلازمات، خاقانی کے بعض قصائد کا آہنگ ذہن میں تازہ کر دیتے ہیں:

فوارہ ہا برخاستہ شمشادہا پیراستہ جو بارہا آراستہ گل بردہ علیای دگر
بلبل نوا آہنگ زد در دامن گل چنگ زد بر نام زر و بر سنگ زد آتش ز سودای دگر

لفظی صنعت گری کی ایک اور مثال ذیل کے اشعار میں ملتی ہے:

بہار ہا، عذار ہا، نگار ہا دیار ہا ز عاشقان زار ہا ہمی برد قرار ہا
شگفتہ لالہ زار ہا، بگرد کوہسار ہا رسیدہ جو بیار ہا، ہمی ز مرغزار ہا
ہزار ہا ہزار ہا نمودہ نالہ زار ہا
سمن سمن، چمن چمن، دمن دمن زمین گل روش روش ختن ختن جہاں شدہ رہین گل
ز درد و دل سخن سخن شنو آفرین گل ز عندلیب و بلبلاں شنیدہ از قرین گل
چو صبح بادہ کردہ فر از لالہ زار ہا

شعرا نے کشمیر کے گلزاروں، کوہساروں اور لالہ زاروں سے متاثر ہو کر

نظمیں کہی ہیں اور اچھی اچھی نظمیں لکھی ہیں، لیکن اوپر کے اقتباس سے بہار کا جو تصور ذہن میں ابھرتا ہے وہ کشمیر کی رعنائیوں کا صحیح پس منظر رکھنے والے شاعر ہی سے ممکن تھا۔

اس رومانی انداز فکر کا موازنہ ذیل کے حقیقت شعارانہ انداز سے، حیرت کی فکر کے اس پہلو کو بھی نمایاں کرے گا۔

سخن شاعر فرزانہ بود تیغ اصیل
کہ بیک طرفہ کند فتح چہ ایراں وچہ روس
حرف فرزانہ ہر انجا کہ رسد می ترسد
توپ افرنگ، وسنان حبش وخنجر طوس

فکر اقبال کی صدائے باز گشت کشمیر کے اس سخنور کے کلام میں اس طرح سنائی دیتی ہے۔ شعر ہیں:

ہر کہ مست است از نوای خودی
اندریں باغ بلبلی باشد
دست حاجت اگر دراز کند
زاہد ورفتنش پلی باشد

ڈل شاعروں کا محبوب موضوع رہا ہے۔ حیرت، ڈل سے جو کام لینا چاہتے ہیں، نئے شعرا میں ان کے لئے مقام پیدا کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں۔

ای آب ڈل زمدت ممتد تو خفتہ
سیل بلا بخواہ کہ ممتاز می شوی
ای گوہر نشستہ بہ بیم درصدف خموش
برشو زفرش تا شرف تاج می شوی

پیر شمس الدین کاملی کے علاوہ، دوسرے عظیم شاعر جنھوں نے ہمارے عہد میں کلاسیکی روایات اور معیاروں کو قائم رکھا، خواجہ محمد امین داراب ہیں۔ لیکن وہ کلاسیکی شاعری ہی کی نمائندگی نہیں کرتے، بلکہ پیر شمس الدین کی طرح امین داراب کی شاعری بھی جدید تصورات اور اسالیب سے فی الجملہ بیگانہ نہیں ہے۔ ان کی خوش گفتاری ہندوستان کے فارسی عالموں ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ، ایران کے موجودہ ادیب بھی ان کے شاعرانہ کمالات

سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ ایران کے مشہور ادیب علی اصغر حکمت جب کشمیر آئے تو پیر شمس الدین اور خواجہ محمد امین داراب دونوں کا کلام سُن کر، انہیں خوشگوار حیرت رہی کہ اس زمانے میں بھی ہند اور کشمیر میں ایسے فارسی اساتذہ موجود ہیں، جن کا کلام ایران کے چوٹی کے شعراء کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔

خواجہ داراب ۱۳۰۵ھ میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ نورالدین نے "گل ارغواں" سے تاریخ ولادت نکالی تھی۔ خواجہ داراب کا سلسلہ نسب، کشمیر کے پہلے مسلم حکمراں رینچن شاہ، سیف الدین تک پہنچتا ہے کوٹا رانی سے رینچن شاہ کے بیٹے حیدر کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ خودکشی سے پہلے ماں نے حیدر کو کشمیر سے چلے جانے کی ہدایت کی تھی۔ چنانچہ وہ ترکستان اور ایران کی طرف جانے والے ایک قافلے کے ساتھ چلا گیا تھا، اور اپنے ساتھ کچھ دولت بھی لیتا گیا تھا۔ کشمیر سے باہر ملکوں میں رہ کر اس نے تجارت شروع کی اور اپنے کارکنوں کو کشمیر بھیج کر مال منگوایا کرتا تھا۔ حیدر کا پوتا یا پڑپوتا، محمد مقیم کشمیر آیا، لیکن حکومت کا خیال اس کے ذہن سے نکل چکا تھا، اور تجارت میں اس خاندان کے افراد کو کافی فائدہ ہوا۔ چنانچہ کشمیر میں نوشہرہ میں محمد مقیم نے ایک کوٹھی تعمیر کروائی، اور خوشحالی کی زندگی گذارتا رہا۔ اس کی ایک کوٹھی فرخ آباد میں بھی تھی۔ محمد مقیم کو شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ کشمیر کے شیعہ سنی فسادات میں جب نوشہرہ کی کوٹھی کو آگ لگا دی گئی تو محمد مقیم کے چچیرے بھائی، خواجہ محمود نے نزورہ میں زمین خرید کر نئی کوٹھی تعمیر کروائی۔ خواجہ محمود کی اولاد میں خواجہ محمد صفی تھے جن کا لکھنؤ میں بھی قیام رہا۔ خواجہ عزیز الدین جن کا قیام لکھنؤ اور کشمیر دونوں جگہ رہا کرتا تھا، اپنے زمانے

کے باکمال شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی تصانیف میں "مثنوی ید بیضا" "ہفت بند عزیزی" "تہنیت نامہ" وغیرہ چھپ چکی ہیں۔ "مثنوی ید بیضا" ۱۳۱۰ھ میں محمد عبدالغنی مدارسی کے اہتمام سے اصح المطابع میں چھپی تھی۔ "تہنیت نامہ" ۱۳۱۵ھ میں چھپا۔ اس میں سلطان عبدالحمید خاں سلطان ترکیہ کی فوج کے ہاتھوں یونانیوں کی شکست پر عربی، اردو اور فارسی میں تہنیت نامے شامل ہیں۔ "ہفت بند عزیزی" "ہفت بند کاشی" کے جواب میں لکھا ہے۔ "ید بیضا" کے ساتھ ایک مخمس بھی شامل ہے، جو خاقانی کے مشہور قصیدہ کے انداز میں بڑی خوبی سے سر انجام کیا ہے۔ اس کا ایک بند حسب ذیل ہے۔

نسیم نو بہار ہا   وزد بمرغزار ہا   برقص کبک و سار ہا   بدشت و کوہسار ہا
عزار ہا چنار ہا   زصوفیان قطار ہا   بوجد شاخسار ہا   زنالہ ہزار ہا
بہ از صدائے تار ہا نواہی زیر و زار ہا

خواجہ محمد صفی کے ایک بیٹے خواجہ عظیم الدین کا انتقال حیدرآباد میں ہوا خواجہ امین دارابؔ کے والد خواجہ نور الدین داراب کو بھی علم و ادب کا شوق تھا، حالانکہ اس خاندان کا مشغلہ پشمینہ کی تجارت تھی۔ خواجہ محمد سخی تو اس خاندان کی نمایاں شخصیت ہیں، ملک التجار کہلاتے تھے۔ ان کی تجارتی کوٹھیاں، حیدرآباد، لکھنؤ اور بمبئی میں تھیں، لیکن علم و ادب کے ذوق کی وجہ سے شعرا اور علما کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ میرزا مہدی مجروح نے ان کے بارے میں کہا تھا۔

جامہ زیب تاجران خواجہ سخی ذاہل سخا

برتنش لبس سخاوت کا ملا چست است و بس

خواجہ عزیزالدین عزیز کے علاوہ، اس خاندان میں خواجہ نورالدین، خواجہ سلام الدین اور خواجہ سیف الدین بھی نامی گرامی گذرے ہیں۔ تصوف کی طرف رجحان اس خاندان کی خصوصیت رہی ہے اور یہ اثر، ایمن داراب کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔

خواجہ داراب کی فکر کے روشن گوشے، فارسی کے اساتذہ قدیم کی شاعری کے محاسن کے ساتھ، جدید عہد کے انداز نظر کے بھی حامل ہیں۔ غزل ان کی توجہ کا زیادہ مرکز نہیں، بلکہ ان کی نظر کائنات کے حقائق کی طرف زیادہ ہے اور وہ اپنے طور پر گتھیوں کو سلجھانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم جہاں کہیں تغزل کے آثار داراب کی شاعری میں مل جاتے ہیں، جذبات میں پاکیزگی بلکہ طہارت اور ماورائیت کا احساس، شعر کو نورانی لبادہ بخشش دیتا ہے۔ چند مثالیں ہیں۔

بعشق ہر کہ کمند کو نہی ز سربازی　　کمند گردنش از گیسوی دراز آور
بہ بزم ناز فروشاں تو نیز ناز فروش　　نیاز ہدیہ بدرگاہ بی نیاز آور

از شور جنون ما محشر چہ برانگیزی　　ای خلوتی دلہا، از جلوہ بپرہیزی
ساز غم دارد راز جگرم در دل　　سوز نفسم باشد محو اثر انگیزی

سیر سلوک من ببیں عشق و جنوں من نگر　　تو بۂ من براہ حق، روی دلم بسوی تو
روز و شبم چناں گذشت ہست حساب مختصر　　شب بطواف کوی تو، روز بگفتگوی تو

داراب کے یہاں افکار کا لحاظ رکھتے ہوئے، شعری لوازم اور با معنی لفظی رعایتوں کی نگہداشت کی بڑی حسین مثالیں بھی ملتی ہے۔ ان کے مجموعہ

کلام میں ایک دعا شامل ہے، جس کے کچھ شعر حسب ذیل ہیں:

محروم مرا تو بار خدا یا ثمر بده — چون نخل شمع سوز دل و چشم تر بده
در جام زاده صدف بحر طبع من — آبی که ریخته نشود چون گهر بده
مرغ مرا که دانه نچینند ز خرمنی — از خویش آب و دانه مثال درر بده

داراب شعر سے اخلاق ستودہ کو ابھارنے کا بھی اکثر کام لیتے ہیں، اور بڑے حسین انداز میں کام لیتے ہیں۔ مثلاً:

تو بشوق نغمه نو، جگر دگر بدست آر — که صدای دلکشی هست بضمیر تار سازم
تو ز فلسفه چه کوشی که کشائی عقده من — چو هنوز پی نبرده ملک و فلک به رازم

هر که امروز در آئینه ببیند فردا — رهرو دانه همه تن گوش بر آوازی هست

اسی غزل کے مقطع میں، اس خیال کو کہ نامرادی، جس کا نتیجہ غم ہے اچھی شاعری کی محرک ہوتی، داراب نے ایک شخصی تجربہ بنا کر، موثر انداز سے اس طرح پیش کیا ہے:

شاعر، و بیغمی، داراب، محال است، محال
قفس و دام پی مرغ خوش آوازی هست

عرفان اور حکمت کے مسائل ان کے اپنے طور پر سوچے ہوئے انداز میں، داراب کی شاعری کا عمومی محرک ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے بہت سے شعر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں:

نهاد بار گران امانتم بر دوش — دگر نه بوده چه حاجت بدین نمود مرا

دانش و علم راه جو، عشق و جنون راه بین — مستی و ذوق رهنما د بر مناره نشان

بادہ عیش و بے غمی ہست براہلہان بیل ‏ جام بخوں دل زدن روزی اہل دانشاں

بصدف چو دانہ دُر بزم خانہ مہمانم ‏ بوطن بخانہ اندر، نہ وطن نہ خانہ دارم

جای کہ جوی از غم صد خرمن عیش ارزد ‏ از بزم دو صد خسرو یک خاطر محزوں بہ
حکمت بچہ کار آید، وز عقل چہ بکشاید ‏ جای کہ بود حیرت از علم فلاطوں بہ

داراب اس صدی کے شاعر ہیں، جس کے اپنے گوناگوں مسائل ہیں اور وہ چشم بینا، دل حساس رکھتے ہوئے شعر کے پرپیچ جاج محصور نہیں رہ سکتے تھے۔ اپنے عہد کے مسائل سے بھی وہ نبرد آزما ہوئے ہیں۔ ان کے کم و بیش ہم عصر سخن گو، اقبال نے اپنی فکر کی توانائیوں کو ان مسائل سے نپٹنے کے لئے وقف کیا تھا۔ داراب نے "زبور عجم" کو پیش نظر رکھ کر بہت سی نظمیں کہی ہیں، اور گویائی کے اس سارے حسن کے ساتھ جو، داراب کے دست بس میں ہے۔ اس کی پہلی نظم ہے۔

میدرم سینۂ افلاک بہ آہی گاہی ‏ انگنم در جگر خاک نگاہی گاہی
خوی کن دیدن ہر چیز بہ تعمیق نظر ‏ بر کشی یوسفی زین دلو ز چاہی گاہی

کشمیر کے بارے میں انھوں نے زیادہ نہیں لکھا۔ ایک شعر ہے:

اگرچہ ساخت کشمیر ساز کلک داراب است
نوادر تار او خود از صفاہان است و تبریز است

داراب کی ایک مرصع نظم ہے، جس میں انھوں نے بہت سلیس انداز میں کائنات کی کچھ بنیادی حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ اس کے چند شعر ہیں:

بمحفل آمدم، چوں شمع دل پرداختم رفتم
تا دم، سوختم، بگریستم، بگداختم رفتم

چه می پرسی چه بوده حاجتم زین بزم افروزی
نظر افروختم، گردن شبی افراختم، رفتم

تگاپوی زدم در وادی امید بی حاصل
دویدم، ماندم، افتادم، نفس در باختم رفتم

ابین داراب بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے محقق اور نقاد بھی ہیں۔ انھوں نے دیوان غنی کی ترتیب کے سلسلے میں دہلی، لکھنؤ، رامپور وغیرہ کا سفر کیا اور بڑے ذوق اور تلاش کی نظر سے غنی سے متعلق جو معلومات کتب خانوں سے اکٹھی ہو سکتی تھیں، انہیں جمع کیا، اور ایک بسیط مقدمہ بھی قلم بند کیا ہے۔ اس چھان بین کے نتیجے میں، غنی کے بارے میں ان کی نظر اتنی گہری ہو گئی ہے کہ، بڑی حد تک سند کے ساتھ کوئی بات کہنے کے موقف میں ہیں۔ اس مقدمہ میں انھوں نے حوالوں اور عقل و تدبر کی پشت پناہی کے ساتھ، بہت سے نتیجے اخذ کئے ہیں اور اپنے پیشرو لکھنے والوں سے اختلاف کیا ہے۔ مثال کے طور پر غنی کے اس شعر سے:

کردہ است ہوائی ہند دلگیر مرا
اے بخت رساں بہ ملک کشمیر مرا

غنی کے بارے میں اکثر لکھنے والوں نے ہند میں ان کے قیام کا نتیجہ نکالا ہے، لیکن ابین داراب، شعر کو مدلل بنیادوں پر الحاقی سمجھتے ہیں۔ اس بحث میں انھوں نے جو پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، وہ بہت ہی پر لطف، اور ادیبانہ ہے۔ استدلال کے بعد رباعی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میرا عقیدہ ہے کہ یہ الحاقی ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ میرا گمان غالب ہے کہ مولانا کا کلام ان کی بے پروا مزاجی کی وجہ سے ان کی حیات ہی میں ایک لاوارث سی چیز بن گیا تھا، اور ان کے کلام کا کچھ حصہ اوروں کے قبضے میں چلا گیا، اور دو تین رباعیاں اوروں کی ان کے حصے میں دیدی گئی ہیں، جن میں یہ رباعی بھی ہے۔ میں انہیں اس

اڈیشن میں درج نہیں ہونے دیتا، مگر چونکہ میری نظر میں ان کا کوئی دعویدار نہیں لہذا یتیم پروری کی نیت سے ان صفحات میں بدستور رہنے دیتا ہوں۔

پیر عبدالقادر آثم، خواجہ صدر الدین کی اولاد میں سے تھے، جن کا شمار اپنے زمانے کے متقی اور پرہیزگار لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ شیخ بابا ہردی رشی کے مرید تھے۔ خواجہ صدر الدین کے فرزند خواجہ مسعود پانپوری بھی بڑے صاحب باطن بزرگ ہوئے۔ وہ بابا داؤد خاکی کے ارادتمندوں میں داخل تھے۔ ان کی اولاد میں بابا محمد طاہر بھی اپنے زہد اور تقویٰ کی بدولت کشمیر کے بزرگوں میں ایک مقام رکھتے ہیں۔

پیر عبدالقادر آثم انہیں کی اولاد میں سے تھے۔ ان کی ولادت ۱۳۱۵ھ میں ہوئی۔ اپنے زمانے کے مشہور علما مولوی غلام محمد زرگیر، پیر عبدالعلی پاندانی اور مولوی سید مبارک شاہ سے تعلیم حاصل کی۔ شعر و سخن سے گہری دلچسپی تھی، اور متصوفانہ شعر کہتے تھے۔ ان کا کلام اپنے زمانے کے ادبی رسائل "گلریز" وغیرہ میں شائع ہوتا رہا تھا۔ فارسی کے علاوہ اردو میں بھی وہ شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام دیوان کی صورت میں مرتب ہوا ہے، لیکن شائع نہیں ہو سکا۔ کلام کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

محبت عاقبت محمود دارد ۔۔۔ سحر می زد صلا حسن ایازی

نہ مجنوں گیر درس عشق لیلی ۔۔۔ نہ فہمد رمز آں راعقل رازی

اگر آثم رخ رخشندہ خواہی ۔۔۔ چو شمع آموز سوز خود گدازی

نیارد دیدہ آئینہ تاب عکس رخسارش ۔۔۔ شعاع والضحی باشد نقابی آفتابش را

شہید یک نگاہش در شہود ذات مستغرق
زمازاغ البصر کحلی است چشم نیم خوابش را

امشب زجاناں آمد پیامی
آمد جوابی عرض سلامی

جاناں چہ جاناں، جان جہانی
شاہی بصورت ماہ تمامی

لوح جنبینش طور تجلی
رخسار و کاکل صبحی وشامی

جادو نگاہی مژگاں سپاہی
بالا بلائی رعنا خرامی

خطش چہ خطی تفسیر مصحف
دارند باہم خوش انتظامی

آثم فراقش بگداخت مارا
از ہستی ما باقی است نامی

پیر آثم کا انتقال ۱۲۹۴ھ میں ہوا۔ خواجہ محمد امین داراب نے ایک شعر میں تاریخ ولادت اور تاریخ وفات اس طرح نظم کی ہے۔

زاد "شمع ارشادت" انکہ گوئی
"مرد شمع سخن" بسال وفات

یہ شعر آثم کی قبر پر کندہ بھی کیا گیا ہے۔

پروفیسر نند لال کول طالب، اردو کے مشہور شاعر ہیں، لیکن فارسی شاعری سے بھی انہیں لگاؤ رہا ہے اور مخصوص محفلوں اور موقعوں پر انھوں نے فارسی میں بھی کہا ہے۔ پنڈت طالب کشمیر کے قدیم اساتذہ فارسی میں سے ہیں۔ وہ مختلف کالجوں میں فارسی اور اردو کے پروفیسر رہے۔ منشی امیرالدین امیر سے طالب نے شعر میں استفادہ کیا تھا۔ اردو میں ان کے کلام کا مجموعہ "رشحات التخیل" ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ "مرقع افکار" ۱۹۵۲ء میں چھپا۔ کشمیر میں فارسی اور اردو کی تعلیم کو مقبول بنانے میں پنڈت طالب کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

ان کی ایک فارسی غزل جو لالہ سری رام مصنف "خمخانہ جاوید" کی

کشمیر میں آمد کے موقع پر منعقدہ ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی، اس کے کچھ شعر ذیل میں درج ہے۔ یہ مشاعرہ ۱۹۲۱ء میں سری نگر کے پرتاپ سنگھ کالج میں منعقد ہوا تھا، اور میر مشاعرہ، اردو کے مشہور شاعر چودھری خوشی محمد ناظر تھے۔

مدتی بگذشت و من در انتظار افتادہ ام
ساقیا، رطل گراں دہ در خمار افتادہ ام
حرف الفت نقش گردید است بر سیمای چرخ
تا من اندر خاک و خوں در اضطرار افتادہ ام
از تگ و دو کی بیا ساید فرا پای طلب
مثل آب سیل من از کوہسار افتادہ ام

پنڈت طالب کی اساتذہ فارسی کے اشعار کی کچھ تضمینیں، قطعات اور کچھ تاریخیں بھی ملتی ہیں۔ للہ دید کے ایک کشمیری قطعہ کا ترجمہ بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ترجمہ ذیل میں درج ہے:

در میاں بحر ناپیدا کنار و پُر خطر — کشتی خود را ہمی رانم بیک تار طناب
مستمندم با سلامت طی کنم راہ سفر — ایں دعا از من شود یا رب قبول و مستجاب

"بہار گلشن کشمیر" کے لئے پنڈت طالب نے قطعہ تاریخ کہا تھا۔ اس کا آغاز فنون لطیفہ کی اہمیت کے بیان سے کرتے ہیں، کہتے ہیں۔

نوای نغمہ دلکش کہ قوت روح انسانیست — تو آں دریافت از ساز حقیقت شو پنہانش

شعر کے بارے میں کہتے ہیں:

ز شعر روح پرور عالم مستی شود پیدا
بوجد و حال آید دل، بود جاں مست فیضانش

میر غلام رسول نازکی کشمیر کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انکے خاندان میں فارسی اور عربی کے عالم ہوئے ہیں۔ "نازکی" کی نسبت ایک بزرگ میر نازک سے ہے جن کے بارے میں خواجہ اعظم دیدہ مری نے لکھا ہے کہ "از علم و عمل بہرہ موفور داشت"۔ ان کے والد بھی عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ انہیں کی تربیت میں میر غلام رسول نازکی نے فارسی اور عربی کا ذوق پیدا کیا۔ وہ اُردو، فارسی اور کشمیری تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں، اور اپنے علمی پس منظر کے علاوہ شاعری کی روایات کا ان کے یہاں پورا احترام ملتا ہے۔

میرزا کمال الدین شیدا، میرزا احمد، میرزا سیف الدین اور میرزا سعد الدین سعد کے خاندان سے ہیں۔ شیدا کے والد میرزا جلال الدین میرزا کا تذکرہ بھی گذر چکا ہے، جو "مثنوی حسن و گوہر" کے مصنف تھے۔ میرزا شیدا نے اپنے اسلاف کی علم دوستی اور ذوق ادب اور شاعری سے حصہ وافر پایا ہے۔ ان کی ولادت سنہ ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد، بلدی نظم و نسق کی تربیت حاصل کرنے کے لئے، انہیں ہندوستان بھیجا گیا۔ واپسی کے بعد وہ بلدیہ سرینگر کے وارڈ افسر مقرر ہوئے، اور بعد میں ڈائرکٹر لوکل باڈیز بھی ہو گئے۔ ۱۹۵۸ء میں جموں و کشمیر کلچرل اکاڈمی کی معتمدی کا عہدہ ان کے تفویض ہوا، اس طرح انہیں علم و ادب کی خدمت کے وسیع مواقع نصیب ہوئے۔ میرزا شیدا کا ذاتی کتب خانہ کشمیر کے کارناموں اور خطاطی کے نمونوں کا مختصر مگر مستحسن مخزن ہے

اردو ادب اور شاعری کے ساتھ، فارسی شاعری کا بھی انہیں اچھا ذوق ہے۔ صاحب زادہ عبد الرحمٰن ذکی، جو "نانک ساگر" کے مصنف محمد عمر کے بھائی ہوتے تھے، اور خود شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے، میرزا شیدا

کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ ان کے آپس میں شعر و سخن کے مقابلے بھی رہا کرتے تھے۔ ان مختصر نظموں کا مجموعہ "سوز و منظر" کو میں نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ میرزا شیدا نے زیادہ تر اردو میں کلام سرانجام کیا ہے، تاہم وہ کبھی کبھی فارسی اور کشمیری میں بھی شعر کہتے ہیں۔ ان کے فارسی اشعار سے چند کا اندراج یہاں کیا جاتا ہے:

بہ صحن چمن لالۂ شعلہ کاری	چو شمع فروزاں بہ شب ہائی تاری
رواں آبشاری بصد اضطراری	نہ او را قراری نہ ما را قراری
سمن، یاسمن، نسترن جلوہ فرما	بہ باغ نشاطی و در شالہ ماری

گل بروئیاں و اسیر گل مباش	بی خبر از فتنہ ہای دل مباش
خام خرمن پختہ کن از سوز برق	زی لب طوفاں، کشتہ ساحل مباش
بہر بالیدن ہلال عید شو	بہر کاہیدن مہ کامل مباش
جلوہ گاہ دوست کن در خود تلاش	از جنوں گرویدہ محمل مباش

محمد طیب شاہ صدیقی ضیغم، کشمیر کے مشہور "ٹوپیگرو" خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ٹوپیگرو کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ علامہ محمد یعقوب، جب دہلی سے کشمیر آئے تو حضرت خواجہ طاہر رفیق اشائی نے انہیں دیکھ کر فرمایا تھا۔ "ٹوپی گرد آمد" کیوں کہ اس زمانے کے عام علما کے برخلاف یہ ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ یہ عالم باعمل تھے اور کشمیر میں کئی علما ان کے فیض صحبت سے تربیت پا کر نکلے تھے۔

ضیغم کی ولادت کا سنہ ۱۹۰۴ء ہے۔ انھوں نے اردو اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ان دونوں زبانوں میں ام۔ اے پاس کرنے کے بعد محکمہ

تعلیمات میں ملازم ہوئے اور مہتمم تعلیمات کے عہدہ تک ترقی کی۔ سری پرتاپ کالج میں اردو اور فارسی کے لکچرار بھی رہے اور کچھ عرصہ پوسٹ گریجویٹ شعبۂ فارسی، جموں و کشمیر یونیورسٹی میں، فارسی کے لکچرار کی خدمت بھی انجام دی۔

ضیغم اردو فارسی اور کشمیری تینوں زبانوں میں فکر شعر کرتے ہیں۔ وہ کئی علمی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت شیخ یعقوب صرفی کے حالات اور کلام کے بارے میں ہے۔ "ذکر العارفین" بھی انکا ایک رسالہ ہے جو چھپ چکا ہے۔ ایک مثنوی "محشر الاسرار" کے نام سے لکھی ہے اور فارسی دیوان "شمائم" کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ ضیغم نے غزلیں کہی ہے اور نعتیں بھی لکھی ہیں ان کی مختلف غزلوں سے انتخاب ذیل میں درج ہیں۔

ماہ من جلوہ چوں نمود امشب　　عالمی راز خود ربود امشب
جام از بادہ شہود چو داد　　یافتم حاصل وجود امشب

شکن اندر شکن کردند گیسو　　بقصد ناتوانی دام کردند
پئے صید دل بیچارہ ضیغم　　خدنگ غمزہ را خوشکام کردند

حذر از خرقہ سالوس کن و تسبیح صد دانہ
بہ زناری کہ باشد رشتہ جاں بند دلہا کن
مغنی ساز را بنواز ان تاری کہ دل دوز است
نوای درد و غم از مزمر سازم ہویدا کن

سید مبارک شاہ فطرت قادریہ سلسلہ کے پیر طریقت ہیں، جن کا حلقہ ارادت کشمیر تک محدود نہیں، بلکہ اس سے باہر بھی کئی لوگ ان کے معتقد ہیں

ان کا تعلق اور ان کے رشتے ترکستان سے گہرے رہے ہیں۔ چنانچہ فطرت کے عم زاد بھائی، سید غلام محمد، یارقند ہی کے متوطن ہیں۔ فطرت کے والد سید غلام الدین قادری عالم اور نانا میر مبارک ہمدانی صاحب باطن بزرگ تھے فطرت کی ولادت ۱۳۱۶ھ میں ہوئی۔ ایک بزرگ صوفی خیر اللہ نے تاریخ کہی تھی۔

وہ کہ از وقت غلام الدین | مصرعہ خاستہ چہ برجستہ
سال تولیدِ ایں مبارک نام | اختر قائد کمر بستہ

ترکستان اور خاص طور پر یارقند سے ان کے تعلقات کی وجہ سے فطرت کچھ عرصہ وہاں رہے، اور شادی وہیں کی۔ یارقند سے وہ اقسوں، ختن کا شعر وغیرہ مقامات بیں گھومے، جس کا تذکرہ ان اشعار میں کیا ہے:۔

صحبت پاک نژادان ختن روزی چند | شد نصیب من مہجور وطن روزی چند
بمزارات شہیداں ہمہ شب تا بہ سحر | شمع ساں سوختہ بودم بہ لگن روزی چند
سنگ مویان خطا، غالیہ سامان ختن | تازہ کردند مرا داغ کہن روزی چند
چہ مبارک نفسی ہست وچہ فطرت نفسی | کہ بہتر کان خطا کرد وطن روزی چند

فطرت نے اپنے اور اپنے سلسلہ گیلانیہ کے حالات میں ایک مختصر مثنوی "آئینہ فطرت" لکھی ہے جو چھپ چکی ہے۔ اس میں اپنے سفر ترکستان کے دوران جن جن بزرگوں سے ان کی ملاقات ہوئی، ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

من براہ طلب زدم چوں گام | صحبتی یافتم ز مجتہد و خاص و عام

"مثنوی فطرت کے اختتام پر" مثدی بر دومند بہ عزیزی ارجمند" کے عنوان سے یہ چند شعر کہے ہیں۔

چشم فطرت بجسن تو خیرہ | دلی ہر غافلی از و تیرہ
زانکہ ہستم با اصل خود واصل | نیستم لحظہ ز خود غافل

ناتوانی تو ظاہر آرا شو باطنت را بپوش و نکتہ شنو
ما حریفیم و مست مولائیم پاک از نوش و حرص دنیائیم
لیک وانند طریقت مردان فردن اولی کہ مان از دوناں

مثنوی کے ساتھ اپنے کچھ حالات اردو نثر میں بھی لکھے ہیں ۔ اپنے ماموں میر احمد ہمدانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"میر احمد ہمدانی راقم کے مشفق ماموں تھے ۔ میری تربیت اور تعلیم میں آپ کا بڑا حصہ ہے ۔ آپ پچاس سال کی عمر تک میرے والد سید غلام الدین قادری گیلانی کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہائش فرماتے تھے ، اس وجہ سے آپ کی توجہ میری تعلیم و تربیت کی طرف زیادہ منعطف رہتی ... ... چونکہ انہیں کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے راقم کو متبنیٰ کر دیا تھا ۔"

فطرت کے آبا و اجداد بغداد کے رہنے والے تھے ۔ بغداد سے یہ خاندان ٹھٹھہ منتقل ہو گیا ۔ پھر اس خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالقادر ثانی ٹھٹھہ گئے اور انہیں کی اولاد میں سید شاہ محمد فاضل قادری کشمیر آئے اور محلہ خانیار میں مقیم ہوئے ۔ اخوند اسد اللہ قلاشیوری سے ابتدائی فارسی تعلیم حاصل کی ، اور مولانا ناصر الدین ماشوجی سے عربی پڑھی ۔ حدیث کے درس مولانا محمد انور سے لئے اور سید حسن افندی سے ، سفر یارقند کے موقع پر قادریہ سلسلہ میں بیعت کی ۔ حج بیت اللہ کا شرف بھی فطرت کو حاصل ہوا ۔

میر غلام رسول نازکی نے ، جو فطرت کے دوست اور عزیز بھی ہیں ، "مثنوی آئینہ فطرت" پر ایک تعارف لکھا ہے ، تعارف میں ان کی محفلوں اور احباب کا بھی تذکرہ کیا ہے ۔ ان میں عالم اور فارسی کے ادیب اور شاعر بھی

شامل ہیں۔ اس حصے کا اقتباس درج ذیل ہے:

"مجھے بھی کبھی کبھی ان جاں نواز محفلوں میں شریک ہونے کا موقع ملتا تھا۔ مولانا جیرت کاملی، مولانا حسن شاہ حولی، خواجہ محمد امین صاحب بیچہ، جناب عبدالحق صاحب برق اور فطرت صاحب اس انجمن ناز کے خواص خمسہ تھے"۔ ... ... اس کا نام انجمن اخوان الصفا رکھا تھا ـــــ اس کے ایک اور ممبر پیرزادہ نجم الدین صاحب تھے"۔

انجمن یا بزم اخوان الصفا کی مجلسوں میں ان اصحاب، اور میر غلام رسول نازکی کے علاوہ محمد امین داراب، میرزا کمال الدین شیدا اور باہر کے شعراء میں حفیظ جالندھری، روشن صدیقی، احسان دانش، اثر عسکری اور اثر صہبائی بھی شرکت کرتے تھے۔

فارسی اور اردو میں فطرت کی کئی تصانیف ہیں۔ رشحات فطرت، معارف طبع فطرت، بیاضہای فطرت، چندپند فطرت، رباعیات فطرت فارسی میں اور فریاد جرس، اور الثقلان اردو میں ـ کشمیری میں بھی وہ شعر کہتے ہیں۔ ان کی کشمیری غزلوں کا مجموعہ زمزمہ فطرت کے نام سے مرتب ہوا ہے۔ ان کے علاوہ اخبار الاحرار، حقانی، اور اشجار الابرار بھی ان کی تصانیف ہیں۔

فطرت فارسی میں غزل بھی کہتے ہیں، اور اس صنف میں ان کے کلام کا اچھا خاصہ مجموعہ تیار ہو گیا ہے، جو ابھی تک شائع نہ ہو سکا۔ غزل کے علاوہ نعت اور منقبت میں بھی کافی کلام سرانجام کیا ہے۔ غزل کے کچھ شعر ذیل میں درج ہیں۔

ز جام عشق نوشا نوش دارم	صدای نغمہ در گوش دارم
مہ پنداری کہ من دیوانہ وارم	دل مستانہ با صد ہوش دارم

نظرت اندر جہان بے بنیاد	چوں حبابی ز آب آمد و رفت

بنال بلبل شوریدہ در حریم قفس	تو باغ و راغ نوای غنا چہ میجوئی
ہزار نغمہ توحید از زبان ہزار	سحر بباغ شنو بینوا چہ میجوئی

سید شمس الدین غمگین، بلوامہ کے گاؤں رتنی پورہ کے متوطن ہیں اور اندرابی سیدوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ غمگین کے والد سید نورالدین کشمیری کے شاعر تھے، اور ارشاد و ہدایت ان کا مشغلہ تھا۔ والد کے بعد غمگین، ان کے جانشین ہوئے۔ "گلریز" (نومبر ۱۹۵۲ء) کے تعارفی نوٹ میں لکھا ہے کہ غمگین کو "شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا ..... آج آپ ایک اونچے پایہ کے استاد فن ہیں"۔ غزل اور نظم دونوں میں ان کی طبیعت رواں ہے اور نئی نئی صنعتوں کو شاعری میں بروئے کار لاتے ہیں ایک نظم کے چند شعر ہیں۔

دی شب ہر اندر نظر زین دو نیامد خوبتر
آراستہ با یک دگر	ماہ من و ایوان تو
ای زیب خوبان جہاں	ماہ جہاں ماہ شہاں
دارم بہی اندر جہاں	طوع من و فرمان تو
غمگین را شو غمزدہ	از قرب خود پیش خدا
بادا تنہا ہر شد جدا	دست من و دامان تو

ایک منقوطہ غزل کے دو شعر ذیل میں درج ہیں :

تیغ بن تیز نیش زن بینی ۔۔۔ پیش تشنیش زنجینی
زینت تن جبیں بے جنبش ۔۔۔ بینیش زیب نقش جبین بینی

سرخوش کشمیری بھی موجودہ عہد کے شعرا میں قابل ذکر ہیں۔ ان کا کلام "گلریز" کے مختلف شماروں میں شائع ہوا ہے۔ وہ غزل بھی کہتے ہیں، لیکن انھوں نے اپنے عہد کے عام حالات کے بارے میں ایک نظم "شہر آشوب" کے نام سے لکھی تھی جس کے کچھ شعر ذیل میں درج ہیں :

عجب واژوں مزاج چرخ کج رفتار می بینم
سفاہت کار فرما و نزاہت خوار می بینم
بزا خفش بجای صاحب کشاف بر منبر
صداقت در رحل عرقوب در دربار می بینم
خری را کسوت اکسون اشہب زیر پالانی
بہ گلشن زاغ و بلبل زیر پر منقار می بینم
یزیدی در لباس بایزیدی رہزن ایماں
بلیسی صورت جبریل اندر کار می بینم
کنی تا کی ز جور چرخ واژوں شکوہ سرخوش
بہای نغمہ ہایت چوں نہ در بازار می بینم

حکیم غلام احمد زہری، چرار شریف کے رہنے والے ہیں، اور مختلف اصناف میں شعر کہتے ہیں۔

ان کی ایک فارسی نظم "عتاب رند و جواب شاعر" کے عنوان سے "گلریز" (اپریل ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے کچھ شعر ذیل

ہیں نقل کئے جاتے ہیں :

دوش چوں پیر مغاں مارا تہی پیمانہ دید
از تاسف گفت چوں حال بتا ہم بنگرید
وای بر رندی کہ باشد مدتی اندر طلب
عین وقت میکشی ساغر ز دست خود چکید
وای بر آں حال شاعر زاری باید گریست
ساز بر ہم دادہ چوں سوزی بمحفل آفرید
گفتم ای سر حلقہ رندان اہل میکدہ
بشنو آن رازی کہ از پیش و پسم کس نشنوید
مدتی گشتم بدشت زندگی دیوانہ وار
از درون سینہ ام گاہی چنیں آہی وزید
کز دم او چاک شد دامان بزم گلستاں
نالہ بیباک من چوں سینہ گردوں درید

سوپور کے حکیم محی الدین' .... بھی اس عہد کے شاعروں میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے کچھ شعر ..... درج ذیل ہیں۔

ظلمت شب از ضیای صبح دامن گیر شد | در عبوحی بر گلستاں آسمانم زیر شد
در گلستاں عندلیباں نغمہ ہا پرداختند | گل ز دل شد زر فشاں و گلستاں گلریز شد
روی گل جاں ادیباں خوی گل گل انگبیں | بوی ہر گل روح پرور سوز بلبل تیز شد

پیرزادہ غلام احمد مہجور جو کشمیری کے سربرآوردہ شاعروں میں سے تھے کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے لیکن ان کا فارسی کلام اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ ان کے ایک قطعہ کے کچھ شعر ملے ہیں۔

پنڈت دودھ لعل در طالع، جو پنڈت بیربل در کی اولاد میں تھے، مہجور کے زمانے میں کشمیر کے حاکم مقرر ہو کر آئے تھے۔ اس موقع پر مہجور نے سعدی کے مشہور قطعے کی زمین میں، جس میں سکھ جیون مل کے درباری شاعر محمد جان بیگ سامی نے بھی ایک قطعہ کہا تھا، ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا، جس کے کچھ شعر یہ ہیں۔

اے سر سروراں عالی جاہ — یادگار قبیلہ در ہا

آمدی با ہزار جاہ و حشم — فکندیم در رہت سرہا

اندو چو دگر وہ راہ زناں — بود ایں سرزمین پر شرہا

سوی زنداں بحکم تو رفتند — ایں ہمہ سارقاں و لیڈرہا

موجودہ عہد میں فارسی زبان اگرچہ شاعری اور ادب کے میدان میں زندہ محرک کے طور پر باقی نہیں رہی ہے تاہم جہاں تک اس کی تعلیم اور تدریس کا بہتر بندوبست ہو رہا ہے، اور پچھلے تین چار سال سے فارسی میں تحقیقی کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ اسکولوں میں فارسی پڑھنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔ چھٹی جماعت سے فارسی زبان ایک زاید زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے، اور تقریباً سارے سرکاری اسکولوں میں اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ نصاب میں شامل کرنے کے لئے تجربہ کار اساتذہ سے کتابیں مرتب کروائی گئی ہیں، جن میں کلاسیکی فارسی کے علاوہ جدید فارسی سے طلبا کو روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ طلبا ابتدا ہی سے جدید محاورہ سے بھی واقفیت حاصل کر سکیں۔

فارسی کی تعلیم کا سلسلہ کالجوں میں بی ڈگری اور ڈگری کے معیار تک داخل نصاب ہے، اور اس مضمون کو پڑھانے کے لئے یونیورسٹی کی اعلیٰ

سندیں رکھنے والے اساتذہ کا تقرر کیا گیا ہے۔ ذیل میں مختلف کالجوں میں فارسی کی تعلیم کا اجمالی خاکہ درج کیا جاتا ہے:

(۱) سری پرتاپ کالج۔ سری نگر کے قدیم کالجوں میں سے ہے، جس کی کچھ تعلیمی اور ثقافتی روایات بھی بن گئی ہیں۔ اس کالج کے اساتذہ اور صدور فارسی کے سربرآوردہ علما رہ چکے ہیں۔ یہاں دو اساتذہ کے تفویض فارسی کی تعلیم ہے، جن میں سے ایک جناب عبدالعزیز اور دوسرے جناب محمد شفیع ہیں۔ جناب عبدالعزیز نے جموں و کشمیر یونیورسٹی سے اور جناب محمد شفیع نے علی گڑھ سے فارسی میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی ہے طلبا کی تعداد سو کے قریب ہے۔

(۲) امر سنگھ کالج سری نگر بھی قدیم تعلیمی ادارہ ہے جس کے فارسی اساتذہ میں مفتی جلال الدین اور ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت شامل رہ چکے ہیں۔ مفتی جلال الدین میں قدیم اساتذہ اور علما کے سارے اوصاف موجود ہیں، وہ کچھ عرصے جموں و کشمیر یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ فارسی میں بھی درس دے چکے ہیں۔ انھوں نے کچھ لکھا بھی ہے اور فارسی ادب کے بارے میں ان کے مضامین رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں، اور علمی کاموں میں مشغول ہیں۔ کالج کے موجودہ اساتذہ میں جناب نورالدین اور جناب علی شاہ مصدر شامل ہیں۔

(۳) گورنمنٹ ویمنز کالج، سری نگر میں فارسی پڑھنے والے طلبا کی تعداد تقریباً سو کے قریب ہے، اور یہاں فارسی کی استاد مسٹر محبوب جن جموں و کشمیر یونیورسٹی کی ایم۔ اے ہیں۔ انھوں نے ایم اے کے لئے کشمیر کے مشہور شاعر اور مثنوی نگار بہاءالدین متو پر جدید فارسی زبان میں مقالہ بھی لکھا تھا۔ "ریشی نامہ" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

دربارہ ریشی نامہ باید دانست کہ ریشیان یکی از طائفہ صوفی

RekhtaDownload.com

عارفاں را تشکیل میدہند۔ کلمہ رشی بہمیں صورت در زبان سنسکرت موجود است و بمعنی خدا دوست و تارک الدنیا مورد استعمال است"

(۴) گورنمنٹ ویمنز کالج نواکدل سرینگر کی پرنسپل، مسز شمیم مفتی نے فارسی میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ام۔ اے کیا ہے وہ حال تک گورنمنٹ ویمنز کالج، سرینگر میں فارسی کی پروفیسر تھیں۔ مسز مفتی کے علاوہ مس رضیہ مفتی بھی یہاں فارسی کی لکچرار ہیں۔ انھوں نے بھی علی گڑھ یونیورسٹی سے فارسی میں ام۔ اے کیا ہے۔ ایک اور تجربہ کار استاد، جناب محمد عبد اللہ شیدا ہیں، جو پہلے دانشگاہ معلمین سرینگر اور گورنمنٹ ویمنز کالج، سرینگر میں بھی فارسی پڑھاتے تھے، اس وقت عارضی طور پر اسی کالج میں فارسی پڑھا رہے ہیں، یہاں طلباء کی تعداد (۵۰) کے قریب ہے۔

(۵) گاندھی میموریل کالج، سرینگر میں جناب عبد الجبار فارسی اور اردو کی تعلیم دیتے ہیں، انہوں بھی جموں اور کشمیر یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ام۔ اے کے امتحانات کامیاب کئے ہیں۔

(۶) دانشکدہ معلمین، سرینگر میں جناب عبد الاحد رفیق اردو کے معلم تھے انہوں نے اردو اور فارسی دونوں میں جموں و کشمیر یونیورسٹی سے ام۔ اے کے امتحانات کامیاب کئے ہیں اس وقت مولانا آزاد میموریل کالج میں ہیں

(۷) گورنمنٹ کالج اننت ناگ (اسلام آباد) میں پروفیسر جان محمد فارسی کے معلم ہیں۔ پروفیسر جان نے علی گڑھ یونیورسٹی سے فارسی میں ام۔ اے کیا ہے۔ اس کالج میں طلباء کی تعداد پچاس، ساٹھ کے قریب ہے

(۸) گورنمنٹ کالج، سوپور میں طلباء کی تعداد چالیس پچاس کے قریب ہے۔

اور جناب غلام نبی بٹ فارسی کا درس دیتے ہیں۔

خاص کشمیر کے علاوہ ریاست کے مختلف ضلعوں میں جو کالج قائم ہیں، ان میں سے جموں کے مولانا ابوالکلام آزاد میموریل کالج، گورنمنٹ کالج بھدرواہ بارہمولہ اور پونچھ کے کالجوں میں بھی فارسی کی تعلیم ہوتی ہے۔ پونچھ کالج میں جموں وکشمیر یونیورسٹی کے ایک فارغ التحصیل محمد شفیع فارسی کے استاد ہیں جنھوں نے جموں وکشمیر یونیورسٹی سے فارسی میں ام۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ اور اس امتحان کے لیے کشمیر کے مشہور با خدا بزرگ اور صوفی بابا داؤد خاکی کی حیات اور شاعری پر "شرح احوال و آثار بابا داؤد خاکی" کے عنوان سے جدید فارسی زبان میں مقالہ لکھا ہے۔ اس کا تذکرہ، یونیورسٹی میں تحقیقی کام کے سلسلے میں آگے آرہا ہے

جموں وکشمیر یونیورسٹی میں فارسی کی تعلیم اور تدریس کا باضابطہ شعبہ قائم ہے، جس میں ام۔ اے کی ابتدائی اور آخری جماعتوں میں دس بارہ طلبا تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ اساتذہ میں ڈاکٹر شمس الدین احمد، پروفیسر رحمٰن راہی اور ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت شامل ہیں۔ درس وتدریس کے علاوہ ام۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر شمس الدین احمد، دارا شکوہ کے پیر اور استاد، ملا شاہ بدخشی کے بھائی کے احفاد میں سے ہیں۔ ان کی ولادت سرینگر میں ہوئی اور یہیں تعلیم پائی۔ جموں وکشمیر یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد، انھوں نے علی گڑھ سے ام۔ اے کا امتحان فارسی میں پاس کیا اور فارسی کے امیدواروں میں اول آنے کے صلے میں انھیں یونیورسٹی کی جانب سے طلائی تمغہ بھی عطا ہوا تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ریاست کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے اور مختلف

کالجوں میں فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں ان کا انتخاب پوسٹ گراجویٹ شعبہ فارسی، جموں و کشمیر یونیورسٹی میں لکچرار کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں ایرانی حکومت نے انہیں جدید فارسی کی تربیت حاصل کرنے کے لیے ایران کا وظیفہ عطا کیا۔ دو سال وہ ایران میں رہے اور دانش گاہ تہران سے، ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا مقالہ کشمیر کے مشہور شاعر "محمد رضا مشتاق" پر لکھا گیا ہے جس میں انھوں نے مشتاق کی حیات اور شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ان کے دیوان کو بھی مرتب کیا ہے۔ مقالہ جدید فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اس مقالے سے غزل کی اہمیت سے متعلق اقتباس درج ذیل ہے:

"غزل بہترین وسیلہ است برای اظہار احساسات رقیق عارفانہ شاعر روح عارف، و عاشق تشنہ عشق و محبت و معرفت الٰہی می باشد۔ طبع لطیف و شوریدہ وی کہ در مہد عرفان تربیت شدہ است و با ہر چیز عشق می ورزد برای بیان نمودن عواطف و احساسات درونی خویش بار سنگین کلمات نغز را می تواند تحمل کند۔ طبع مشتاق کہ مردی بود عاشق و عارف و حسن پرست در مہد عرفان تربیت شدہ بود، از شیوہ عشق و طراز ہای حسن آگاہی کامل داشت"۔

۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر شمس الدین کو ریڈر کے عہدہ پر ترقی ملی۔ مقالے کے علاوہ انھوں نے کشمیر کے کئی اساتذہ کے بارے میں اردو میں مضامین بھی لکھے ہیں، جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔

پروفیسر رحمان راہی نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے

کا امتحان کامیاب کیا اور مختلف کالجوں میں فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۱۹۶۲ء میں انھیں جموں و کشمیر یونیورسٹی کے پوسٹ گراجویٹ شعبہ فارسی میں لکچرار مقرر کیا گیا۔ فارسی کے علاوہ انھوں نے انگریزی میں بھی ام۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ادب کے نظریہ اور مصرف کے مسایل پر ان کی نظر گہری ہے وہ اچھی تنقیدی صلاحیتوں سے بھی حامل ہیں۔ کشمیری زبان کے وہ سربرآوردہ شاعر ہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں ان کے کشمیری کلام کے مجموعے "نوروز صبا" پر ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی عطا ہوا ہے۔

ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت نے۔ ام۔اے کا امتحان فارسی میں پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ ریاست کے مختلف کالجوں میں وہ لکچرار رہے ۱۹۶۰ء میں حکومت ہند نے انھیں وظیفہ عطا کر کے، جدید فارسی کی تعلیم کے لئے ایران بھیجا۔ طہران یونیورسٹی میں دو سال کے قیام کے دوران، انھوں نے "شرح احوال و غزلیات میرزا عبدالقادر دہلوی" پر مقالہ تیار کیا، اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مقالہ میرزا بیدل کی شاعری کا اچھا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ہے۔ بیدل کی غزلیات کو تحقیق کا موضوع منتخب کرنے کے بارے میں معذرت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قبل از بیں کہ استخواں ہندی شعر بیدل را نشان دهیم لازم است بگویم چرا غزلیات بیدل را برای تحقیق انتخاب کردہ ایم درحالیکہ وی مثنوی و قصائد و رباعیات و مخمسات نیز دارد گفتیم کہ بیدل نمائندہ بارزی در سبک هندی است۔ وصولاً غزل در بین اصناف شعر فارسی بهترین نمائندہ این سبک است سبک هندی در غزل نفوذی زیادہ دارد و علاوہ بر آن غزل

زمینهٔ خوبی برای تصوف نیز می باشد از دورهٔ سبک عراقی باین طرف شاعران حکمت و عرفان را بیشتر در غزل گنجانیده اند ... ... علت دیگری آنست که بین فارسی سرایان چه در هند و چه در ایران اتفاقاً بمناسبت ترنم و آهنگ خوش آیند عشق غزل طرفداران زیادی پیدا کرده و پیش سخن سنجان امتیاز و قبولیت داشته است"

ڈاکٹر پنڈت کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی ہے، انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ فارسی میں ان کی کچھ غزلیں اور نظمیں موجود ہیں۔ ان کی غزل میں جدید عہد کے افکار اور اسالیب سموئے ہوئے ہیں۔ کچھ قطعات اور تضمینیں بھی لکھی ہیں۔ ذیل میں ان کی ایک غزل کے کچھ شعر درج کیے جاتے ہیں۔

چه خوش روز و شب دارد آن نوجوانی — که باشد هدایت ورا پاسبانی
عنانِ ضمیرش نه در دست غیری — چو مرکب نه راند کسش زیر رانی
خیال ستوده ورا تیغ تیزی — فعال گزیده در اندر بانی
نه در چنگل دیو شهوت بیفتد — رضامند هر دم به تسلیم جانی
نه جوید رضائی ز گردون گردان — نه دل را به بند و به عز جهانی
نه سوزد ز کینه دل خویشتن را — نه از حرص راند سخن بر زبانی
به تمکین و تشهیر نخوت نیابد — به فقدان منصب نه بیند زیانی

یونیورسٹی میں اساتذہ کے علاوہ، طلبا بھی تحقیق کے کام میں مصروف ہیں۔ تحقیقی کام ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی، دونوں سطحوں پر ہو رہا ہے ایم۔ اے میں طلبا چاہیں تو انشائیہ کی بجائے کسی استاد کی نگرانی میں فارسی

زبان اور ادب کے کسی موضوع پر جدید فارسی میں مقالہ لکھ کر پیش کر سکتے ہیں۔

اس وقت تک حسب ذیل طلبا نے مقالے لکھے ہیں۔

۱۔ سلطانہ طاہرہ قریشی نے ۱۹۶۵ء میں مغلیہ عہد کے مشہور سخن سنج ناظم کشمیر ظفر خاں احسن کے بارے میں "احوال و آثار و سبک ظفر خاں احسن" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا۔ انھوں نے درجہ اول میں کامیابی حاصل کی اور سارے کامیاب امیدواروں میں اوّل بھی رہیں۔

۲۔ محمد شفیع نے بھی ۱۹۶۵ء میں کشمیر کے مشہور روحانی پیشوا اور صوفی حضرت بابا داؤد خاکی کے حالات اور کارناموں پر مقالہ لکھا تھا، جس کا عنوان "شرح احوال و آثار بابا داؤد خاکی" ہے۔ اس میں سارے محصلہ مواد کی مدد سے، بابا داؤد خاکی کی زندگی کے حالات اور ان کے قصاید پر تبصرہ لکھا ہے۔ مقالہ میں بابا کے ارشادات اور ملفوظات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ارشادات و نکات صوفیا و عرفا دارای معانی دقیق و مطالب عمیق می باشند۔ اگرچہ خیلی مختصر می باشند، و نظیر ایشاں ایں است کہ گوی دریا را در کوزہ گنجی ندہ است۔ بایں ہمہ تاثیر و نفوذ حیرت انگیز دارند۔ برای مردمان ظاہر بیں و سبک مغز بدیں گونہ نکات را درک کردن دشوار است۔ البتہ برای طالبان معرفت و تشنگان حقیقت چنیں ارشادات مشعل راہ اند۔"

محمد شفیع اس وقت گورنمنٹ کالج، پونچھ میں فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

۳۔ اسی سال زینب اندرابی نے بھی کشمیر میں افغان عہد کے مشہور

سخن گو ملا لعل محمد توفیق کی منظوم تاریخ کشمیر پر مقالہ لکھا تھا، اور مثنوی کو بھی مرتب کیا تھا۔ افغانوں کے عہد میں غزل کی مقبولیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

"دریں دورہ غزل مورد پسند و علاقہ شعرا قرار گرفتہ بود و شعرای کشمیر نیز بیشتر بہ غزل سرای پرداختند و استاد غزل زباں صائب تبریزی را تقلید کردند"۔

۱۹۶۶ء میں حسب ذیل دو مقالے مرتب ہوئے۔

۱۔ رقیبہ اختر نے "احوال و آثار و سبک جبی کشمیری" پر مقالہ لکھا تھا۔ اس میں سبک ہندی کے بارے میں لکھتی ہیں۔

"سبک ہندی، زادہ دورہ صفوی است۔ مقدمات این سبک در اواخر دورہ تیموری (قرن نہم) شروع شد و کمال آں دریں عہد حاصل گشت و بزرگترین گویندگان این سبک در ہمیں عہد ظہور کردند"۔

۲۔ محبوبہ حسن نے بہار الدین متو پر مقالہ لکھا تھا، بہار الدین متو، جیسا کہ ان کے بارے میں فراہم کردہ معلومات سے اندازہ ہوا ہوگا، کشمیر کے سر برآوردہ شعراء میں سے تھے۔

پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے تحقیقات کا آغاز ۱۹۶۵ء سے ہوا۔ سلطانہ طاہرہ قریشی نے، احسن اللہ المخاطب بہ ظفر خاں آپنی تحقیق کو زیادہ بسیط اور مفصل صورت دینے کے لئے، احسن کے کلیات کو مرتب کرنے اور اس پر مقدمہ لکھنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور کلیات کو متعدد نسخوں سے مقابلے کے بعد اس کا مستند متن مرتب کر لیا ہے اور احسن کے عہد، اس کی حیات اور شاعری پر بسیط مقدمہ

بھی سپرد قلم کیا ہے۔ ظفر خاں احسن اور اس کا عہد، جیسا کہ گذشتہ اوراق سے ظاہر ہے، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے احسن پر تفصیلی تحقیق، اس زمانے کی مختصر ادبی تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کلیات کا دیباچہ جو جدید فارسی میں لکھا ہے، اس میں احسن کی سرپرستی شعرا کے بارے میں مرتب مقالہ کی تحریر کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"ظفر خاں بوجہ سرپرستی اہل ہنر و اہل علم و دانش در اقران خود تفوق داشت۔ در ایں عہد دربار شاہان مغلیہ ہند مرکز صاحبان علم و دانش و شعرای نازک خیال بودہ و بسیاری از اعیان و امرای ایں دربار بہ شعر میل داشتہ اند۔ اما دربار ظفر خاں در ایں باب از امرای دیگر ایں عہد بہ ایں علت ممتاز بود کہ وی خود شاعر نازک خیال بودہ و شعرای سرآوردہ ایں عہد بہ او توسل داشتہ اند۔ و ہر یکی از ایں کوشش میکرد کہ با دیگری در سخن سرائی گوی سبقت می برد۔"

تین اور طلبا نے بھی ابھی پی ایچ ڈی کی تحقیقات کا آغاز کیا ہے جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

۱۔ زینب اندرابی، جنہوں نے ایم اے کے لئے ملا لعل محمد توفیق کی مثنوی تاریخ کشمیر کو مرتب کیا تھا، پی ایچ ڈی کے لئے "نغمہ سرایان پارسی در کشمیر" کے موضوع پر مقالہ مرتب کر رہی ہیں۔

۲۔ زیبا جیلانی نے گذشتہ سال سے "غزل سرایان پارسی در کشمیر" پر کام شروع کیا ہے۔

E ADBIYAT-E-URDU
24 203

۳۔ رفیعہ اختر نے اسی سال سے "ادبیات فارسی در عہد شہمیری سلاطین کشمیر" کے عنوان پر کام کا آغاز کیا ہے۔ اس عہد میں فارسی کا بلند پایہ ادب پیدا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے شہمیری عہد کو کشمیر میں فارسی ادب کے ارتقا میں اہمیت حاصل ہے، اور اس کام کی تکمیل سے عہد شہمیری کے بارے میں بہت سی تفصیلات منظر عام پر آنے کی توقع ہے۔

٭٭

RekhtaDownload.com